آپ بیتی

میری کہانی

حصہ سوئم

جواہر لعل نہرو

IqbalCyberLibrary.Net
©2002-2006

فہرست

طویل سزا کا خاتمہ	03
گاندھی جی سے ملاقات	09
لبرل ذہنیت	24
درجہ نوآبادی اور کامل آزادی	36
پرانا اور نیا ہندوستان	52
انگریز حکومت کی کارگذاری	62
سول میرج اور رسم الخط کا مسئلہ	89
فرقہ پرستی اور رجعت پسندی	101
تعطل	127
زلزلہ	140
علی پور جیل	158
مشرقی اور مغربی جمہوریت کا مقابلہ	166
اداسی	175
متضاد باتیں	192
خیالات پر اثر ڈالنا بہتر ہے یا جبر سے کام لینا	227
پھر دہرہ جیل میں	253
گیارہ دن	264
پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر	271
حال کے چند واقعات	280
خاتمہ	293
تتمہ	298
ضمیمہ الف	300
ضمیمہ ب	303
ضمیمہ ج	308

طویل سزا کا خاتمہ

میری رہائی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ''نیک چلنی'' کی بناء پر مجھے حسب معمول چھوٹ ملی تھی اس لیے میری دو سال کی سزا میں ساڑھے تین مہینے کی تخفیف ہو گئی تھی۔ رہائی کی توقع نے میرے سکون قلب میں خلل ڈال دیا تھا یا یوں کہیے کہ وہ عام بے حسی جو جیل میں پیدا ہو جاتی ہے دور ہو گئی تھی۔ باہر نکل کر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ بڑا مشکل سوال تھا اور چونکہ اس کا کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس لیے رہائی کا سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ مگر یہ عارضی کیفیت تھی جو بہت جلد گزر گئی، میرا مدتوں کا دبا ہوا جوش عمل ابھر آیا اور میں بے چینی سے رہائی کا انتظار کرنے لگا۔

جولائی ۳۳ء کے آخر میں دردناک خبر آئی کہ ج۔ م سین گپتا کا یکا یک انتقال ہو گیا، ہم دونوں نہ صرف کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں برسوں سے ساتھ ساتھ کام کرتے رہے تھے بلکہ میرے اور ان کے اس زمانے کے تعلقات تھے جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا۔ وہیں پہلے پہل میری ان کی ملاقات ہوئی تھی جب میں وہاں داخل ہوا تو وہ سند حاصل کر کے فارغ ہو چکے تھے۔

سین گپتا کا انتقال نظر بندی کے دوران ہوا۔ ۳۲ء کے آغاز میں وہ یورپ سے واپس آئے تو ابھی انہوں نے ساحل بمبئی پر قدم بھی نہ رکھا تھا کہ شاہی قیدی کی حیثیت سے گرفتار کر لیے گئے۔ اس وقت سے وہ برابر قید یا نظر بند رہے اور ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ حکومت نے انہیں بہت کچھ سہولتیں بہم پہنچائیں لیکن مرض برابر بڑھتا گیا۔ ان کی آرتھی کے موقع پر کلکتہ میں ایک عظیم الشان مظاہرہ اور بے شمار آدمیوں نے نذر عقیدت پیش کی۔ گویا مظلوم بنگال کے گھٹے ہوئے جذبات کو کم سے کم عارضی طور پر نکاس کا ایک راستہ مل گیا۔

غرض سین گپتا ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے سو بھاش بوس بھی شاہی قیدی تھے ان کی صحت بھی مدتوں قید اور نظر بند رہنے سے خراب ہو گئی تھی، خدا خدا

کر کے حکومت نے انہیں علاج کی غرض سے یورپ جانے کی اجازت دی۔ ہمارے پرانے اور آزمودہ کار لیڈر وٹھل بھائی پٹیل بھی یورپ میں بیمار پڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے جیل کی مصیبتوں اور باہر کی پیہم مصروفیتوں کی تاب نہ لاکر اس دنیا سے سدھار گئے، یا اپنی صحت کھو بیٹھے۔ پھر کتنے ایسے تھے جنہیں اگرچہ بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن اس غیر طبعی زندگی کی وجہ سے ان کے دماغ میں خلل پیدا ہوگیا اور ان کے نفس میں طرح طرح کی گرہیں پڑ گئیں۔

سین گپتا کی موت نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں نے دیکھا کہ سارا ملک خاموشی سے انتہائی مصیبتیں اٹھا رہا ہے۔ مجھ پر افسردگی اور اداسی چھا گئی اور میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سب کس لیے؟

صحت کے معاملہ میں، میں بڑا خوش قسمت ہوں۔ اگرچہ کانگریس کے کام میں مجھے سخت محنت کرنا پڑی اور میں نے نہایت بے ترتیب زندگی گزاردی لیکن میری صحت ہمیشہ اچھی رہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ میرے قویٰ خلقی طور پر بہت اچھے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں اپنے جسم کی بڑی نگہداشت کرتا تھا۔ جس طرح بیمار اور کمزوری کو برا سمجھتا تھا اسی طرح موٹاپے کو بھی سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس لیے کافی ورزش، تازہ ہوا اور سادہ غذا کے ذریعے سے میں ان دونوں سے محفوظ رہا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اوسط طبقے کی بہت سے بیماریوں کی وجہ غلط قسم کی غذا ہے۔ اس میں چکنائی اور ثقیل اجزا بہت ہوتے ہیں اور مقدار میں بھی زیادہ ہوتی ہے (یہ صرف ان لوگوں کو ذکر ہے جو اسراف کی مقدرت رکھتے ہیں) لاڈ کرنے والی ماں اپنے بچوں کو مٹھائیاں اور طرح طرح کی چیزیں' ٹھونس ٹھونس کر کھلاتی ہے اور ابتدا سے سوہضمی کا بیج بو دیتی ہے جو پھر تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس کے علاوہ بچوں پر بہت سے کپڑے بھی لاد دیئے جاتے ہیں۔ ہندوستان آ کر انگریزوں کی خوراک بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اگرچہ ان کی غذا میں چکنائی اور ثقیل چیزوں کی اتنی

بھرمارنہیں ہوتی، غالباً اب وہ اپنے اجداد کے مقابلہ میں کچھ سنبھل گئے ہیں جو بہت بڑی مقدار میں گرم اور ثقیل غذا کھایا کرتے تھے۔

میں کبھی غذا کی اصلاح کے وہم میں نہیں پڑا صرف ثقیل غذاؤں اور زیادہ کھانے سے پرہیز کرتا رہا۔قریب قریب تمام کشمیری برہمنوں کی طرح ہمارا خاندان بھی گوشت کھایا کرتا تھا اور اس لیے بچپن سے میں بھی گوشت کھاتا رہا اگرچہ مجھے اس کا شوق نہ تھا۔۱۹۲۰ء میں جب عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو میں نے گوشت کھانا ترک کردیا اور نباتی غذا کا پابند ہوگیا۔ چھ برس تک میں نے گوشت نہیں کھایا لیکن یورپ جاکر کھانے لگا۔ ہندوستان آکر پھر چھوڑ دیا اور اس وقت سے اب تک میں کم وبیش نباتی غذا کا پابند رہا ہوں۔گوشت مجھے موافق آتا ہے لیکن اب مجھے اس سے رغبت نہیں رہی ہے بلکہ کراہت معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۳۲ء میں جیل خانے میں کئی مہینہ تک مجھے روزانہ حرارت رہتی تھی، اس قسم کی خفیف علالتیں مجھے بہت ناگوار ہوتی تھیں کیونکہ مجھے اپنی صحت پر جو گھمنڈ تھا اسے صدمہ پہنچتا تھا،قوت حیات اور جوش عمل کا جو تصور میرے پیش نظر رہا کرتا تھا وہ اب قائم نہیں رہا اور ضعف اور انحطاط کا خیال مجھے ستانے لگا۔میں سمجھتا ہوں کہ مجھے موت سے کچھ زیادہ خوف نہیں ہے لیکن دماغ اور جسم کا آہستہ آہستہ گھلنا بالکل دوسری چیز تھی۔لیکن میرا وہم غلط ثابت ہوا۔میری طبیعت سنبھل گئی اور میں نے اپنی صحت پر پھر قابو پالیا۔جاڑوں میں دیر تک ''دھوپ کا غسل'' کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔اور مجھے پھر تندرستی کا احساس ہونے لگا۔جس زمانے میں میرے جیل کے ساتھی کوٹ پہنے اور شال اوڑھے سردی سے کانپتے رہتے تھے میں ننگا دھوپ میں بیٹھا رہتا تھا اور سورج کی خوشگوار گرمی کا لطف اٹھاتا تھا۔یہ چیز صرف جاڑے کے موسم اور وہ بھی شمال ہند میں ممکن ہے۔کیونکہ اور جگہ تو بہت سخت دھوپ پڑتی ہے۔

ورزشوں میں شرش آسن میں مجھے خاص لطف آتا تھا۔اس کی ترکیب یہ ہے کہ

سر کے بل کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں گونتھ کر ان سے گردن کو سہارا دیا جائے اور کہنیاں زمین پر ٹکی رہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ورزش جسمانی صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ لیکن میں اس لیے اسے زیادہ پسند کرتا تھا کہ مجھ پر اس کا نفسیاتی اثر بہت اچھا پڑتا تھا۔ اس کرتب سے جو کسی قدر مضحک تھا، تفریح ہوتی تھی اور زندگی کی خفیف الحرکاتی سے طبیعت زیادہ مانوس ہو جاتی تھی۔

افسردگی اور اداسی کے دوروں میں جو جیل میں لازمی طور پر ہوتے ہیں، صحت اور تندرستی کا یہ احساس بہت کم آتا تھا اور اسی کی بدولت میں جیل کے اندر اور جیل کے باہر نت نئے حالات کے ساتھ نبھاتا رہا۔ مجھے بہت سے دھچکے پہنچے، جو اس وقت ناقابل برداشت معلوم ہوتے تھے، لیکن مجھے خود حیرت ہے کہ میں خلاف توقع ان سے بہت جلد سنبھل گیا۔ میرے دل و دماغ کی صحت اور اعتدال کا ایک ثبوت یہ ہے کہ نہ تو آج تک میرے سر میں درد ہوا اور نہ کبھی بے خوابی کی شکایت ہوئی۔ تہذیب جدید کی ان عام بیماریوں سے اور ضعف بصارت سے بھی محفوظ رہا۔ گرچہ میں کثرت سے پڑھتا لکھتا رہا ہوں اور وہ بھی بعض اوقات جیل کی دھندلی سی روشنی میں، مگر میری نظر اب تک کمزور نہیں ہوئی۔ پچھلے سال ایک امراض چشم کے ماہر کو اس پر سخت تعجب ہوا۔ آٹھ سال پہلے انہوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ دو ایک سال کے اندر ہی تمہیں عینک کی ضرورت پڑ جائے گی۔ لیکن ان کی رائے غلط نکلی اور آج بھی میں بغیر عینک کے اچھی طرح سب کام کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے ان باتوں سے لوگ مجھے نہایت معتدل اور محتاط سمجھنے لگیں اس لیے میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ان لوگوں سے سخت وحشت ہوتی ہے جو کسی وقت اعتدال اور احتیاط کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

ادھر میں جیل میں اپنی رہائی کا منتظر تھا اور ادھر ملک میں سول نافرمانی کی نئی صورت یعنی انفرادی نافرمانی شروع ہو رہی تھی۔ گاندھی جی نے خود اس کی ابتدا کی

اور حکام کو پہلے سے اطلاع دینے کے بعد یکم اگست کو گجرات کے کسانوں کو سول نافرمانی کی تلقین کرنے سے ارادہ سے روانہ ہو گئے۔ انہیں فوراً گرفتار کر کے ایک سال کی سزا کر دی گئی اور پھر یرودا جیل بھیج دیئے گئے تھے۔ مجھے ان کے دوبارہ جیل جانے سے خوشی ہوئی۔ لیکن اس کے بعد ہی ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ گاندھی جی نے اصرار کیا کہ مجھے جیل میں بھی ہریجن سدھار کا کام کرنے کی وہی سہولتیں ملنا چاہئیں جو باہر حاصل تھیں لیکن حکومت نے صاف انکار کر دیا۔ یکا یک ہمیں اطلاع ملی کہ گاندھی جی نے پھر اس سلسلے میں برت شروع کر دیا ہے۔ ہمیں تو یہ بات عجیب و غریب معلوم ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی بات کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھایا جائے۔ چاہے حکومت کے مقابلے میں ان کی دلیلیں کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں پھر بھی ان کا یہ فیصلہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ لیکن ہم بالکل بے بس تھے اور حیرت کے عالم میں حالات کی رفتار کو دیکھ رہے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد ان کی حالت بڑی تیزی سے خراب ہونا شروع ہوئی۔ اس لیے وہ جیل سے اسپتال پہنچا دیئے گئے لیکن یہاں بھی وہ قیدی کی حیثیت سے تھے اور حکومت انہیں ہریجن سدھار کے کام میں کوئی سہولتیں بہم پہنچانے کو تیار نہ تھی۔ پچھلے برتوں میں انہوں نے عزم حیات کو نہیں چھوڑا تھا مگر اب کی بار انہوں نے بالکل کندھا ڈال دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بس چند دن کے مہمان ہیں۔ انہیں سب کو الوداع کہا اور ان چند چیزوں کے متعلق جو اسپتال میں ان کے پاس تھیں وصیت بھی کر دی۔ ان میں سے بعض چیزیں نرسوں کو دیں لیکن حکومت کب چاہتی تھی کہ ان کی موت کا الزام اس کے سر آئے اس لیے اسی روز شام کو یکا یک وہ رہا کر دیئے گئے۔ یہ رہائی عین وقت پر ہوئی اگر ایک دن بھی دیر ہو جاتی تو بس کام تمام تھا۔ ان کی جان بچانے کا سہرا اصل میں سی۔ ف انڈریوز کے سر ہے جو گاندھی جی کے حکم کے خلاف ہندوستان بھاگے ہوئے آئے۔

اسی عرصہ میں میں ۲۴ اگست کو دہرہ دون جیل سے نینی جیل تبدیل کیا گیا۔کوئی ڈیڑھ برس دوسری جیلوں میں رہنے کے بعد میں یہاں واپس آیا تھا۔ اسی مجھے اطلاع ملی کہ میری ماں سخت بیمار ہیں اور اسپتال پہنچا دی گئی ہیں۔ چونکہ ان کی حالت نازک تھی اس لیے میں ۳۰ اگست کو رہا کر دیا گیا۔ویسے میری میعاد ۱۲ ستمبر کو ختم ہوتی تھی۔غیر معمولی حالات کی وجہ سے صوبے کی حکومت نے میرے ساتھ ۱۳ دن کی اور رعایت کر دی۔

گاندھی جی سے ملاقات

رہائی کے بعد میں سیدھا اپنی بیمار کے ماں کے پاس لکھنو گیا اور چند روز ان کے پاس رہا۔ میں بہت عرصے کے بعد جیل سے باہر نکلا تھا اس لیے اپنے ماحول سے بیگانگی سی محسوس کرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ صدمہ سا ہوا کہ دنیا رنگ بدلتی ہوئی بہت آگے بڑھ گئی تھی اور میں جیل میں پڑا سڑتا رہا۔ جیل سے باہر نکل کر سب پر یہی کیفیت گزرتی ہے۔ ہم باہر آ کر دیکھتے ہیں کہ وہ ننھے بچے، لڑکے اور لڑکیاں جنھیں ہم بہت چھوٹا چھوٹا چھوڑ گئے تھے اب ماشاءاللہ بڑے ہو گئے ہیں۔ بہت سی شادیاں، ولادتیں اور موتیں ہو چکی ہیں۔ دنیا محبت اور نفرت، کام اور کھیل الم و راحت کے بہت سے منظر دیکھ چکی ہے۔ زندگی کی نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہو گئی ہیں بحث کے نئے نئے موضوع اٹھ کھڑے ہوئے ہیں غرض میں جو کچھ سنتا یا دیکھتا تھا اس میں میرے لیے حیرت کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا تھا، جیسے زندگی مجھے جہالت کے گڑھے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ہے۔ یہ کوئی خوش گوار خیال نہ تھا یہ ممکن تھا کہ میں بہت جلد اپنے ماحول سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر لیتا لیکن میں نے اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں نے خیال کیا کہ مجھے صرف چند روز جیل سے باہر رہنا ہے اس کے بعد پھر وہیں جانا پڑے گا اس لیے میں ان چیزوں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کیوں کروں، جو مجھ سے بہت جلد چھوٹ جائیں گی۔ حکومت دبا رہی تھی اور کبھی کبھی گرفتاریاں بھی ہو جاتی تھیں لیکن اس وقت ہندوستان کی یہ خاموشی بڑی معنی خیز تھی۔ یہ وہ منحوس خاموشی تھی جو خوفناک تشدد کے بعد چھا جاتی ہے وہ خاموشی جو زبان حال سے بہت کچھ کہتی، لیکن تشدد کرنے والی حکومتیں اسے سن نہیں سکتیں۔ اس وقت ہندوستان میں اس ریاست کا مکمل نمونہ تھا جو محض پولیس کا کام کرتی ہے۔ پولیس کی ذہنیت حکومت کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرح کی مخالف آواز دبا دی جاتی تھی خفیہ پولیس والوں، جاسوسوں اور مخبروں کا سارے

ملک میں ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ عام طور پر لوگوں پر خوف و ہراس طاری تھا۔ اور ساری فضا میں اخلاقی پستی کے آثار نمایاں تھے۔ حکومت ہر طرح کی سیاسی جدوجہد کو فوراً دبا دیتی تھی خصوصاً دیہاتی علاقوں میں۔ مختلف صوبوں کی حکومتیں اس کی کوشش کر رہی تھیں کہ میونسپلٹی اور لوکل بورڈ کی ملازمت سے کانگریس والوں کو نکال باہر کیا جائے۔ ان کی نظر میں وہ شخص جو سول نافرمانی کے سلسلے میں جیل ہو آیا ہو، میونسپل مدارس میں تعلیم دینے یا میونسپلٹی میں اور کوئی کام کرنے کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ میونسپلٹیوں پر بہت دباؤ ڈالا گیا اور انھیں دھمکی دی گئی کہ اگر کانگریس والوں کو برخاست نہیں کیا تو سرکاری امداد بند کر دی جائے گی۔ اس جبر اور زیادتی کی سب سے نمایاں مثال کلکتہ کارپوریشن میں دیکھنے میں آئی۔ میرا خیال ہے کہ آخر حکومت بنگال نے ایسا قانون بنا دیا کہ جو شخص کسی سیاسی جرم میں سزایاب ہو چکا ہو وہ کارپوریشن میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔

جرمنی میں نازی جو زیادتیاں کر رہے تھے، ہندوستان کے برطانوی افسروں اور ان کے اخباروں پر اس کا عجیب و غریب اثر پڑتا تھا۔ اسے وہ اپنے طرزِ عمل کے جواز میں پیش کرتے تھے اور اپنی نیکی پر ناز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اگر نازی تمہارے حاکم ہوتے تو تمہاری کیا گت بنتی؟ نازیوں نے تشدد کے عجیب و غریب طریقے ایجاد کیے تھے اور جبر کی حد کر دی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ ممکن ہے ان کی حکومت میں ہماری حالت اس سے بدتر ہوتی لیکن میں اس کا صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ گزشتہ پانچ سالوں میں خود ہندوستان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس سے میں پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ حکومت ہند اس نیک اصول کی قائل ہے کہ سیدھا ہاتھ جو کچھ کرے الٹے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ غیر جانب دارانہ تحقیقات کی تجویز کو رد کر دیتی ہے۔ حالانکہ اس قسم کی تحقیقات میں ہمیشہ اسی کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام انگریز

وحشیانہ مظالم سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نازیوں کی طرح کھلم کھلا ''بہمیت'' پر فخر کریں اور اس کا وظیفہ پڑھیں۔ اگر وہ کبھی بہمیت سے کام بھی لیتے ہیں تو انھیں خود اس پر شرم آتی ہے۔ لیکن چاہے جرمن ہو یا انگریز یا ہندوستانی، سبھی تہذیب کا ملمع اتنا ہلکا ہے کہ جذبات کی رگڑ سے فوراً اتر جاتا ہے اور پھر اندر سے وہ چیز نکل آتی ہے جسے دیکھ کر کراہت آتی ہے۔ جنگ عظیم نے انسانوں میں خوفناک بہمیت پیدا کر دی ہے۔ اس کے اثرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی صلح کے بعد بھی جرمنی کا بحری محاصرہ جاری رہا اور اشیائے خوردنی کے دستیاب نہ ہونے سے لوگوں کو فاقے کرنے پڑے۔ اس کے متعلق ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ ''دنیا کی کسی قوم نے ایسا احمقانہ، خوفناک اور وحشیانہ ظلم نہ کیا ہو گا۔'' ہندوستان میں بھی ۵۷ء اور ۵۸ء کی یادولوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔ جب کبھی کسی کے مفاد اور حقوق خطرے میں ہوتے ہیں تو پھر شرافت اور تہذیب کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے جھوٹ کا نام پروپیگنڈہ پڑ جاتا ہے۔ بہمیت کو ''سائنٹفک تشدد'' اور امن و انصاف کا تحفظ کہنے لگتے ہیں۔ اس میں افراد یا کسی خاص قوم کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان حالات میں ہر شخص کا کم و بیش یہی طرز عمل ہوتا ہے۔ ہر محکوم ملک کی طرح ہندوستان میں بھی ہمیشہ حکمران قوت کی مخالفت کا ایک دبا ہوا جذبہ موجود رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھڑک اٹھتا ہے اور خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس مخالفت سے حکمران قوم میں اچھی بری ہر طرح کی فوجی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ گزشتہ چند سال میں ہمیں ہندوستان میں ان فوجی صفات کا بہت اچھی طرح تجربہ ہوا کیونکہ ہمیشہ سے اس فوجی ذہنیت سے (جو حقیقی سپاہیانہ روح سے خالی ہے) سابقہ رہا ہے۔ یہ شہنشاہی کا لازمی نتیجہ ہے اور اس میں حاکم اور محکوم دونوں کی ذلت ہے ہندوستانیوں کی ذلت تو کھلی ہوئی ہے لیکن انگریزوں کی ذلت اس قدر آسانی سے محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ جب نازک وقت آتا ہے تو یہ صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان

کے علاوہ ایک تیسرا فریق بھی ہے جس کے حصہ میں بدقسمتی سے دونوں قسم کی ذلتیں آتی ہیں۔

جیل میں مجھے اتنی کافی فرصت تھی کہ میں نے اعلیٰ افسروں کی تقریریں، ان کے اسمبلی اور کونسلوں کے سوالات کے جواب اور حکومت کے اعلانات سب تفصیل سے پڑھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ گزشتہ تین برس میں ان میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے اور یہ تبدیلی رفتہ رفتہ زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ ان کا لہجہ زیادہ درشت اور تحکمانہ ہوگیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک سرجنٹ میجر اپنے سپاہیوں کو حکم دے رہا ہو۔ اس کی ایک دلچسپ مثال وہ تقریر ہے جو مدنا پور (بنگال) کے کمشنر نے نومبر یا دسمبر ۳۳ء میں کی تھی۔ یہ چنگیز خانی شان تمام سرکاری تقریروں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ غیر سرکاری یورپی خصوصاً بنگال میں سرکاری افسروں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ ان کی تقریر اور عمل دونوں میں بالکل فاشسٹی ذہنیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

بہمیت کی ایک دوسری بین مثال سندھ میں دیکھنے میں آئی۔ حال ہی میں وہاں چند مجرموں کو منظر عام پر پھانسی دی گئی، چونکہ سندھ میں جرائم بڑھ رہے تھے اس لیے افسروں نے طے کیا کہ ان مجرموں کو سب کے سامنے پھانسی دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ یہ وحشیانہ منظر دیکھنے کے لیے عام لوگوں کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ سنا ہے کہ اس وقت ہزاروں آدمی جمع ہو گئے تھے۔

غرض رہائی کے بعد میں نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا۔ ان کو میں نے کچھ خوشگوار نہیں پایا۔ میرے بہت سے ساتھی جیل میں تھے اور گرفتاریاں ابھی جاری تھیں۔ تمام تعزیری ضابطے ابھی تک نافذ تھے۔ احتساب اخباروں کا گلا گھونٹ رہا تھا اور اس نے ہماری خط وکتابت میں ابتری ڈال رکھی تھی۔ میرے ایک رفیق کار، رفیع احمد قدوائی سنسر کی زیادتیوں سے نالاں تھے۔ ان کے

خط روک لیے جاتے تھے۔ دیر سے ملتے تھے یا غائب ہو جاتے تھے جس سے ان کے کاموں میں گڑبڑ ہوتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سنسر سے درخواست کریں کہ اپنا فرض ذرا معقولیت سے انجام دے، لیکن مشکل یہ تھی کہ لکھیں کسے کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ سنسر کون ہے۔ غالباً وہ کوئی خفیہ پولیس افسر ہوتا ہے جو پوشیدہ طور پر اپنی خدمات انجام دیتا ہے اور اس کا وجود اور کام تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ لیکن رفیع احمد نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ سنسر کے نام خط لکھا اور لفافے پر اپنا پتہ لکھ دیا۔ چنانچہ واقعی یہ خط منزل مقصود پر پہنچ گیا اور اس کے بعد سے رفیع احمد کے خطوں کے معاملے میں زیادہ احتیاط برتی جانے لگی۔

مجھے جیل جانے کی آرزو نہ تھی۔ کیونکہ اتنے دن قید میں رہتے رہتے میرا جی بھر گیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس سے بچ نہیں سکتا بجز اس کے کہ سیاست سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اس کے لیے میں ہرگز تیار نہیں تھا اور حکومت سے ٹکراہونا ناگزیر تھا۔ وہ جب چاہتی حکم نامہ بھیج دیتی کہ فلاں کام کرو یا فلاں کام نہ کروں اور میری طبیعت اس قسم کی ہے کہ زبردستی کو برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ سارے ملک میں ہندوستانیوں کو ڈرانے اور دبانے کی کوشش کی جا رہی تھیں۔ میں اس معاملے میں بے بس تھا اور وسیع پیانے پر کوئی جدوجہد کرنا میرے امکان سے باہر تھا بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ خود نہ ڈروں اور دب کر اطاعت نہ کروں۔

جیل جانے سے پہلے مجھے کئی کام نبٹانے تھے۔ میری ماں بیمار تھیں اور سب سے پہلے مجھے ان کی خدمت کرنی تھی۔ انہیں رفتہ رفتہ صحت ہو رہی تھی مگر اس میں اتنی دیر لگ گئی کہ تقریباً ایک سال تک وہ صاحب فراش رہیں۔ پھر میں گاندھی جی سے ملنا چاہتا تھا جو پونا میں اپنے نئے برت کے ختم ہونے کے بعد آہستہ آہستہ طاقت حاصل کر رہے تھے۔ مجھے ان سے ملے دو برس سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ میں چاہتا تھا کہ اپنے صوبے کے زیادہ سے زیادہ رفیقوں سے ملوں اور نہ

صرف ہندوستانیوں کی سیاسی حالت بلکہ دنیا کی عام حالت اور ان خیالات کے متعلق گفتگو کروں جو میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اس وقت میرا خیال تھا کہ دنیا سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑی تیزی کے ساتھ ہلاکت کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اور اپنا قومی پروگرام بناتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

میرے خانگی معاملات بھی میری توجہ کے محتاج تھے۔ اب تک میں ان سے انتہائی بے پروائی برتتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ والد کے انتقال کے بعد میں نے ان کے کاغذات بھی نہیں دیکھے تھے۔ ہم نے اپنے اخراجات بہت گھٹا دیئے تھے مگر اب بھی وہ ہماری موجودہ حیثیت سے زیادہ تھے تاہم جب تک ہم اپنے پرانے گھر میں رہتے ان کا اور گھٹانا مشکل تھا۔ موٹر اب ہمارے پاس نہیں تھی کیونکہ ہم اس کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ حکومت جب چاہے گی اس پر قبضہ کر لے گی۔ ایک طرف تو یہ مالی مشکلات درپیش تھیں اور دوسری طرف سینکڑوں خط آتے تھے جن میں لوگ مجھ سے مالی امداد طلب کرتے تھے (سنسر ان خطوں کو نہیں روکتا تھا) سارے ملک میں خصوصاً جنوبی ہند میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ میں بڑا مالدار آدمی ہوں۔

میری رہائی کے بعد میری چھوٹی بہن کرشنا کی منگنی ہوگئی اور میں چاہتا تھا کہ جیل بھیجے جانے سے پہلے اس کی شادی کر دوں۔ کرشنا خود بھی ایک سال کی سزا بھگتنے کے بعد ابھی چند مہینے ہوئے جیل سے آئی تھی۔

جوں ہی میری ماں کی طبیعت سنبھلی میں فوراً گاندھی جی سے ملنے کے پونا روانہ ہوگیا۔ مجھے ان سے مل کر اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ گو وہ ابھی تک کمزور تھے مگر ان کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جاتی تھی۔ ہم دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔ یہ ظاہر ہے کہ سیاست، معاشیات اور زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق ہمارے خیالت میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن میں ان کی شفقت کا ممنون ہوں کہ حتی

الامکان انہوں نے میرے خیالات کی رعایت مدنظر رکھی۔ میری ان کی خط و کتابت میں (جو بعد میں شائع ہوگئی) بہت سے وسیع مسائل پر جن پر میں ان دنوں غور کر رہا تھا، بحث کی گئی تھی اور اگرچہ ان کا ذکر مبہم الفاظ میں تھا۔ لیکن منشاء بالکل واضح تھا۔ میں گاندھی جی کا یہ اعلان سن کر بہت خوش ہوا کہ مستقل حقوق کو منسوخ کر دینا چاہیے۔ اگر وہ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ ہمیں جبر سے نہیں بلکہ سمجھا بجھا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہیے۔ چونکہ میرے نزدیک ان کے بعض طریقے مہذب اور معقول قسم کے جبر کے مترادف ہیں اس لیے میں دونوں صورتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں سمجھتا۔ مجھے پہلے کی طرح اب بھی ان سے یہ توقع تھی کہ اگرچہ وہ مبہم نظریوں پر غور کرنے کی مخالف ہیں۔ لیکن واقعات کی منطق انہیں رفتہ رفتہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردے گی کہ بنیادی سماجی ناگزیر ہے۔ وہ بھی عجیب و غریب شخص ہیں ایک طرف وہ (بہ قول مسٹر ویریر ایلون) قرون وسطیٰ کے کیتھولک اولیا رکی طرح ہیں اور دوسری طرف وہ عملی رہنما ہیں اور ان کا ہاتھ ہمیشہ ہندوستانی کسانوں کی نبض پر رہتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وقت آنے پر وہ کدھر جھکیں گے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ جدھر بھی وہ جھکیں گے وہی پلہ بھاری ہو جائے گا۔ ممکن ہے وہ ہمارے نزدیک غلط راستہ اختیار کریں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک کھلا ہوا راستہ ہوگا۔ ان کے ساتھ مل کر کام کرنا سب سے بہتر ہے۔ لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو پھر دوسری راہ اختیار کرنی پڑے گی۔

میرے خیال میں اس وقت تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ہم اپنی قومی جدوجہد میں مصروف تھے اور اصولاً کانگریس کا پروگرام اب تک سول نافرمانی تھا اگرچہ وہ افراد تک محدود کر دی گئی تھی۔ میں نے ہی فیصلہ کیا کہ اس وقت ہمیں موجودہ صورت پر قناعت کرنی چاہیے اور اشتراکی خیالات عام لوگوں میں خصوصاً کانگریس کے ان کارکنوں میں جو سیاسیات میں کچھ دخل رکھتے ہیں پھیلانے چاہئیں۔ تاکہ آئندہ

جب کبھی ہماری پالیسی کے تعین کا موقع آئے تو ہم کافی پیش قدمی کر سکنے کے لیے تیار رہیں۔ اس وقت تو کانگریس خلاف قانون جماعت تھی اور حکومت برطانیہ اسے کچل ڈالنا چاہتی تھی اس لیے ہمیں اس کے حملے کی مدافعت کرنی تھی۔

گاندھی جی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ خود انہیں کیا کرنا چاہیے؟ وہ عجیب شش و پنج میں تھے۔ اگر وہ جیل جاتے تو پھر ہریجن سدھار کی سہولتوں کا سوال درپیش ہوتا اور غالباً حکومت اپنی پہلی رائے سے نہ ہٹتی اس لیے انہیں پھر برت رکھنا پڑتا۔ کیا یہ چکر اسی طرح چلتا رہے؟ وہ اس بلی چوہے کے کھیل کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر اب ان سہولتوں کے لیے میں نے برت رکھا تو چاہے میں رہا بھی کر دیا جاؤں برت جاری رہے گا اس کے معنی یہ تھے کہ وہ برت رکھ کر جان دے دیں گے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اپنی سزا کی باقی میعاد میں (جس میں ابھی ڈھائی مہینے باقی تھے) جیل جانے کی کوشش نہ کریں۔ صرف ہریجن سدھار کا کام کرتے رہیں البتہ کانگریس کے کارکنوں سے ملتے رہیں اور جب ضرورت ہو انہیں مشورہ دیتے رہیں۔

تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ عارضی طور پر کانگریس سے کنارہ کش ہو جائیں اور سارا کام (بقول خود) ''نئی پود'' کے ہاتھ میں دے دیں۔

پہلی صورت کی ہم میں سے کوئی بھی تائید نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں بظاہر ان کی موت یقینی تھی۔ تیسری صورت میں اس وقت جبکہ کانگریس ہنوز خلاف قانون جماعت تھی بہت نامناسب بات تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا تو سول نافرمانی اور ہر قسم کی عملی جدوجہد فوراً ملتوی ہو جاتی اور آئینی کارروائی شروع ہو جاتی یا کانگریس بے یار و مددگار رہ جاتی اور حکومت اسے اور زیادہ کچل ڈالتی۔ اس کے علاوہ اس خلاف قانون ادارے پر جس کا نہ جلسہ ہو سکتا تھا اور نہ اس کی پالیسی پر بحث، کوئی

جماعت قبضہ کیوں کرتی۔ غرض پہلی اور تیسری شکل رد کر کے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ دوسری شکل مناسب ہے۔ ہم میں سے اکثر کو یہ صورت بھی پسند نہیں تھی اور ہم جانتے تھے کہ سول نافرمانی کا رہا سہا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اگر لیڈر خود جنگ سے کنارہ کش ہو جائے تو پھر کیا توقع ہو سکتی تھی کہ کانگریسی کارکنوں میں سے ایسے باہمت لوگوں زیادہ تعدا میں نکل آویں گے، جو اس آگ میں کودنا گوارا کریں گے۔ لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس مضمون کا بیان شائع کر دیا۔

گاندھی جی اور میں اس معاملے میں متفق تھے (اگرچہ ہمارے وجوہ مختلف تھے) کہ سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے اور چاہے کمزور حالت میں سہی لیکن اسے جاری رکھنا چاہیے۔ اپنے لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں کو اشتراکی اصولوں اور واقعات عالم کی طرف توجہ دلاؤں۔

واپسی پر میں چند روز بمبئی ٹھہرا۔ میری خوش قسمتی کہ اس زمانے میں اودے شنکر وہاں موجود تھے۔ اس لیے مجھے ان کا ناچ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میرے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی جس سے میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ برسوں سے میں تھیٹر، موسیقی، سینما، ناطق اور فلم، ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ وغیرہ سے محروم تھا۔ کیونکہ میں عموماً جیل رہتا تھا اور جب تھوڑے عرصے کے لیے باہر آتا بھی تھا تو دوسرے مشاغل میں منہمک رہتا تھا۔ شاید ایک مرتبہ میں نے ناطق فلم دیکھا ہے اور سینما کے بڑے بڑے ایکٹروں کے صرف نام ہی سنے تھے۔ تھیٹر دیکھنے کو خاص طور پر میرا بہت دل چاہتا ہے اور میں بڑی حسرت کے ساتھ ان بڑے بڑے ناٹکوں کی خبریں پڑھا کرتا ہوں جو دوسرے ملکوں میں کھیلے جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں تو اعلی معیار کے ناٹک ہوتے ہیں نہیں اس لیے جب میں جیل سے باہر بھی ہوتا تب بھی اچھے ناٹک دیکھنے کا موقع نہ ملتا۔ میرا خیال ہے کہ بنگالی، مرہٹی اور گجراتی ناٹک نے خاصی ترقی کر لی

ہے۔لیکن ہندوستانی زبان کا تھیٹر ابھی بہت پیچھے ہے۔ مجھے تازہ ترین حالات تو معلوم نہیں لیکن پہلے تو ہندوستان کے ناٹک بڑے بھدے اور بھونڈے ہوتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ ناطق اور خاموش دونوں قسم کے ہندوستانی فلم فنی لطافتوں سے کورے ہوتے ہیں، عموماً ہلکی قسم کی غنائی یا جذبات پرستانہ فلم دکھائے جاتے ہیں اوران کا قصہ عموماً ہندوستان کی قدیم تاریخ یا دیو مالا سے ماخوذ ہوتا ہے،

میرا خیال ہے کہ ان میں وہ چیز پیش کی جاتی ہے جو شہر والے پسند کرتے ہیں ان بھدے اور تکلیف دہ تماشوں سے گاؤں کے گیت اور ناچ بلکہ پرانے سوانگ بھی جو کہیں کہیں اب تک ہیں بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔ بنگال، گجرات اور جنوبی ہند میں کبھی کبھی اچانک یہ دیکھ کر بڑی حیرت اور مسرت ہوتی ہے کہ گاؤں والے غیر شعوری طور پر کتنا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔اوسط طبقے کے لوگوں میں یہ بات نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب کی جڑوں سے الگ ہو گئے ہیں۔اور فنی روایات سے بالکل کورے ہیں۔وہ ادنی قسم کی نامعقول تصویروں سے لطف اٹھاتے ہیں جو جرمنی اور آسٹریلیا میں ڈھیروں میں چھپتی ہیں۔ان کی زیادہ سے زیادہ پرواز داری ورما کی تصویروں تک ہے۔ہارمونیم ان کا محبوب ساز ہے میں اسی امید میں بسر کرتا ہوں کہ سوراج کی حکومت پہلا کام یہی کرے گی کہ اس نامعقول باجے کی ممانعت کر دے۔لیکن شاید اس تکلیف دہ بے تکے پن اور بدمذاقی کی انتہا لکھنؤ یا دوسری جگہ کے بڑے بڑے تعلقہ داروں کے یہاں نظر آتی ہے۔ان کے پاس خرچ کرنے کو روپیہ ہے اور انہیں نمود و نمائش کا شوق ہے۔وہ دل کھول کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔اور جو کوئی ان کے یہاں جائے اسے یہ تکلیف دہ منظر دیکھنے پڑتے ہیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے ٹیگور کے نامور خاندان کی سرکردگی میں آرٹ کے صحیح مذاق کو بیدار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ان کا اثر سارے ملک میں صاف نظر آرہا ہے لیکن جس ملک کے لوگ ہر قدم پر دبائے اور کچلے جارہے ہوں اور دہشت کی فضا میں

زندگی بسر کرتے ہوں وہاں کوئی آرٹ کیسے پنپ سکتا ہے۔

بمبئی میں، میں بہت سے دوستوں اور ساتھیوں سے ملا جن میں سے بعض ابھی قید سے چھوٹ کر آئے تھے۔ وہاں اشتراکیت کا عنصر قوی ہے اس لیے کانگریس کے اونچے حلقہ میں جو تازہ ترین واقعات ہوئے تھے ان پر وہاں بہت کچھ ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ گاندھی جی پر سخت نکتہ چینی ہو رہی تھی، کہ وہ سیاست کو الہیات کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھے بہت سے اعتراضوں سے اتفاق تھا۔ لیکن یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم اسی طرح کام چلنے دیں۔ سول نافرمانی ملتوی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ حکومت کا تشدد برابر جاری رہتا اور اگر کوئی موثر جدوجہد کی جاتی تو پھر وہی جیل کی منزل سامنے تھی۔ ہماری قومی تحریک اس درجے پر پہنچ گئی تھی کہ یا تو حکومت اسے دباتی ورنہ حکومت کو اس کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑتا۔ یعنی وہ اتنی قوی ہو گئی تھی کہ حال میں اس کا خلاف قانون قرار دیا جانا لازمی تھا اور اگر سول نافرمانی ملتوی بھی کر دی جاتی تب بھی تحریک کا پیچھے قدم ہٹانا ناممکن تھا۔ غرض سول نافرمانی کے جاری رہنے یا نہ رہنے سے عملاً کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اصولاً یہ حکومت کے مقابلے کے لیے ایک اخلاقی حربے کی حیثیت رکھتی تھی اور اس لحاظ سے قابل قدر تھی۔ جنگ کے زمانے میں نئے خیالات کی اشاعت کرنا آسان تھا بمقابلہ اس زمانے کے جب کہ جنگ عارضی طور پر روک دی گئی ہو اور پستی کا دور شروع ہو گیا ہو۔ جنگ کے علاوہ دوسری صورت یہی تھی کہ حکومت سے مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے اور کونسلوں میں آئینی جدوجہد شروع کی جائے۔

معاملہ پیچیدہ تھا اور دونوں صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کی ذہنی کشمکش کو خوب سمجھتا تھا۔ کیونکہ مجھے خود اس سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ لیکن بمبئی میں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بھی میں یہ دیکھا

ہے کہ بعض لوگ جو کچھ کرنا نہیں چاہتے اشتراکی اصولوں کی آڑ لیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر غصہ آتا تھا کہ یہ لوگ خود تو کچھ کرتے نہیں اور دوسروں کو جنھوں نے جنگ کی مصیبتیں جھیلیں، رجعت پسند کہتے ہیں۔ یہ شیر قالین اشتراکی سب سے زیادہ گاندھی جی کے مخالف ہیں اور انھیں رجعت پسندوں کا قبلہ گاہ کہتے ہیں۔ ان کی دلیلیں منطق کے لحاظ سے تو بالکل درست ہیں لیکن وہ ایک چھوٹی سی بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ''یہ رجعت پسند'' ہندوستان کو جانتا ہے سمجھتا ہے، بلکہ بذات خود ہندوستان کے کسانوں کا مجسمہ ہے اور اس نے سارے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ جو آج تک کسی نام نہاد انقلابی سے نہ ہو سکا۔ اس کی نئی ہریجن سدھار کی سرگرمیوں نے بھی بڑی نرمی سے، مگر اس زبردست قوت کے ساتھ جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ کٹر ہندو دھرم کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ کٹر پنتھیوں کی ساری جماعت اس کی مخالف ہو گئی ہے اور اسے اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھتی ہے حالانکہ وہ ہمیشہ ان سے بڑی نرمی اور شرافت سے پیش آتا ہے۔ وہ اپنے خاص انداز میں بے اندازہ قوتوں کا خزانہ کھول دیتا ہے جو سطح سمندر کی ہلکی ہلکی موجوں کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہیں اور کروڑوں آدمیوں کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں، وہ رجعت پسند ہو یا انقلابی مگر اسی کی ذات تھی جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا۔ ایک پست اور دبو قوم کو عزم و وقار بخشا، عام لوگوں میں بیداری اور قوت پیدا کر دی اور ہندوستان کے مسئلے کو دنیا کا مسئلہ بنا دیا۔ پر امن عدم تعاون یا سول نافرمانی کے مقصد اور فلسفیانہ نتائج سے قطع نظر اس کا طریق ایک عجیب و غریب قوی اور موثر حربہ ہے جو اس شخص نے ہندوستان کے اور ساری دنیا کے ہاتھوں میں دے دیا ہے اور ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ ہندوتان کے حالات کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایمانداری کے ساتھ جو نکتہ چینی کی جائے ہمیں اس کی قدر اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور جہاں تک ہو سکے لوگوں کو موقع دینا چاہیے کہ وہ

ہمارے معاملات پر دل کھول کر بحث کریں۔ یہ بات ضرور قابل افسوس ہے کہ گاندھی جی کے اقتدار نے ایک حد تک بحث مباحثے میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ لوگ ہر معاملے میں ان کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور ہر بات کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ طریقہ صریحی طور پر غلط ہے قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب وہ مقصد اور طریق کار کو سمجھ بوجھ کر قبول کرے اور اس کا عمل اور انضباط کورانہ اطاعت پر نہیں بلکہ فرض شناسی پر مبنی ہو۔ کوئی شخصیت بھی خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو تنقید سے بالا تر نہ ہونی چاہیے لیکن اگر تنقید اپنی بے عملی کو چھپانے کے لیے کی جائے تو وہ یقیناً ناجائز ہے۔ اشتراکی اگر اس قسم کی حرکتیں کریں تو وہ بدنام ہو جائیں گے کیونکہ لوگ تو ہر شخص کو عمل کی کسوٹی پر کستے ہیں لینن نے لکھا ہے "جو شخص مستقبل کے سہل کاموں کے خواب دیکھتا ہے اور حال کے مشکل کاموں کو قابل توجہ نہیں سمجھتا وہ ابن الوقت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے عمل کی بنا پر ان واقعات پر نہیں رکھتا جو اس وقت حقیقی زندگی میں پیش آ رہے ہیں بلکہ اس سے بچنے کے لیے خواب و خیال کی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔"

ہندوستان کے اشتراکیوں اور اشتمالیوں کا ذہنی سرمایہ لے دے کر وہ کتابیں ہیں جو صنعتی مزدوروں کے متعلق لکھی گئی ہیں بعض مخصوص علاقوں مثلاً بمبئی یا کلکتے کے قرب و جوار میں کارخانے کے مزدوروں کی کثرت ہے۔ مگر اصل میں ہندوستان ایک زرعی **ملک** ہے اس لیے ہمارے مسائل صنعتی مزدوروں کے نقطہ نظر نہ پوری طرح سمجھے جا سکتے ہیں اور نہ حل کیے جا سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں قوم پرستی اور دیہی معیشت دو زبردست عنصر ہیں اور یورپی اشتراکیت اس سے بہت کم بحث کرتی ہے۔ روس کی جنگ سے پہلے کے حالات ہندوستان سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے لیکن وہاں غیر معمولی حادثات پیش آئے اور یہ توقع رکھنا کہ دوسری جگہ بھی ایسا ہی ہو گا حماقت ہے میں یہ مانتا ہوں کہ اشتمالیت کی فلسفہ ہمیں ہر ایک **ملک** کے موجودہ

حالات کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں مدد دیتا ہے اور آئندہ کے لیے ترقی کی راہ دکھاتا ہے لیکن یہ اس فلسفے کے ساتھ بڑی زبردستی اور بے انصافی ہوگی کہ حالات اور واقعات کا لحاظ کئے بغیر آنکھ بند کر کے اس سے کام لیا جائے۔

بہر حال زندگی بڑی پیچیدہ چیز ہے۔ اور اس کے اختلاف اور تضاد کو دیکھ کر بعض اوقات انسان ہمت ہارنے لگتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لوگوں میں اختلاف رائے ہو بلکہ ایک ہی جماعت کے لوگ جو اکثر مسائل کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں مختلف نتیجوں پر پہنچیں۔ لیکن وہ شخص جو اپنی کمزوری کو رعب دار فقروں اور شاندار اصولوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرے شبہہ سے کیسے بچ سکتا ہے۔ جو لوگ اقرار نامے لکھ کر یا حکومت سے وعدے کر کے یا اور مشتبہ طریقوں سے خود جیل سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت کرتے ہیں اس مقصد کو نقصان پہنچاتے ہیں جس کے وہ علم بردار بنتے ہیں۔

بمبئی ایک بہت بڑا آفاقی شہر ہے۔ اور اس میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں لیکن وہاں کے ایک ممتاز بزرگ اپنے سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی خیالات کے اعتبار سے عجیب معجون مرکب واقع ہوئے ہیں۔ مزدوروں کے لیڈر کی حیثیت سے تو وہ اشتراکی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے اپنے آپ کو جمہوریت پسند کہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہندو مہاسبھا کے پٹھو بھی ہیں اور اس سے انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ قدیم مذہبی اور سماجی رسم و رواج کی حفاظت کریں گے اور مجلس قانون ساز کو ان میں مداخلت کرنے سے باز رکھیں گے۔ انتخاب کے موقع پر وہ سناتنی طبقے کے نمائندے بن گئے جو قدیم رسوم کے مندر کا پجاری ہے۔ جب یہ پچ رنگی اور دلچسپ زندگی بھی کافی نہ ہوئی تو انہوں نے اپنی فالتو قوت کو کانگریس پر نکتہ چینی کرنے اور گاندھی جی کو رجعت پسند کہہ کر بدنام کرنے میں صرف کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد چند اور شخصوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ڈیموکریٹک کانگریس پارٹی قائم کی جسے حقیقت

میں جمہوریت سے دور کا رشتہ بھی نہ تھا، اور کانگریس سے صرف اتنا تعلق تھا کہ یہ اس پر حملے کیا کرتی تھی۔ اب انہیں اپنی تگ وتاز کے لیے نئے میدانوں کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ وہ مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے جنیوا کی لیبر کانفرنس میں جا پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے حکومت کے وزیر اعظم بننے کی تربیت حاصل کر رہے تھے جو انگلستان میں ''قومی حکومت'' کہلاتی ہے۔

اس قسم کے رنگ برنگے خیالات اور سرگرمیاں بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ پھر بھی کانگریس کے معترضین میں ایسے بہت سے لوگ تھے جو مختلف میدانوں میں گھوڑے دوڑا چکے تھے اور اب بھی ہر طرح کی تحریکوں میں شریک تھے۔ ان میں سے بعض لوگ اپنے آپ کو اشتراکی بھی کہتے ہیں۔ انہیں کی وجہ سے اشتراکیت بدنام ہوتی ہے۔

لبرل ذہنیت

جب میں گاندھی جی سے ملنے پونا گیا تو ایک روز ان کے ساتھ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے مرکز میں بھی گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک سوسائٹی کے بعض اراکین ان سے سیاسی مسائل پر سوالات پوچھتے رہے اور وہ جواب دیتے رہے، اتفاق سے اس وقت وہاں نہ سری نواس شاستری صاحب تھے جو اس سوسائٹی کے صدر ہیں اور پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جو صدر کے بعد اس انجمن کے سب سے لائق رکن ہیں۔ مگر بعض پرانے اراکین موجود تھے۔ ہمارے خیال کے تھوڑے سے آدمی جو گفتگو کو سن رہے تھے ان کی حیرت ہر بات کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی اس لیے کہ سوالات اس وقت کے نہایت ادنیٰ واقعات کے متعلق تھے اور ان موضوع بیشتر وہ درخواست تھی جو گاندھی جی نے بہت دنوں پہلے وائسرائے سے ملاقات کے لیے کی تھی اور جسے وائسرائے نے منظور نہیں کیا تھا۔ کیا بس یہی ایک اہم سوال رہ گیا تھا جو ان لوگوں کے ذہنوں میں آسکتا تھا جب کہ دنیا میں جدھر دیکھئے اہم سے اہم مسائل درپیش تھے۔ جب ان کا اپنا ملک آزادی کے لیے ایک ہمت آزما جنگ میں جتا ہوا تھا اور سینکڑوں ادارے خلاف قانون قرار دئے جا چکے تھے؟ اس وقت کاشتکاروں کے مسئلہ کی حالت نازک ہوگئی تھی صنعتی کساد بازاری کے سبب سے ہر طرف بے روزگاری پھیل رہی تھی۔ بنگال اور سرحد میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا خیال کر کے کلیجہ دھڑ کنے لگتا تھا خیالات کی، تقریری کی تحریری کی اور اجتماع کی آزادی کا سر کچلا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کیا جانے کتنے قومی اور بین الاقوامی مسائل تھے۔ مگر لبرل حضرات نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق سوالات کر رہے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ اگر گاندھی جی نے پہل کی تو اس کا وائسرائے اور حکومت ہند پر کیا اثر ہوگا۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں ایک خانقاہ میں پہنچ گیا ہوں جس کے رہنے والوں کا مدتیں گزریں کہ بیرونی دنیا سے کوئی ربط ضبط نہیں رہا ہے اور یہ خیال میرے دل میں

جاگزیں ہو گیا۔لطف یہ کہ ہمارے یہ دوست عملی سیاسیات میں حصہ لے رہے تھے۔ ہوشیار لوگ تھے اور ان کی قومی خدمت اور ایثار کی کارگزاریاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ یہ اور ان کے چند ساتھی لبرل پارٹی کے روح رواں تھے باقی پارٹی ایک مبہم اور بے شکل سی جماعت تھی جس کے رکن کبھی کبھی بس اس احساس کا لطف اٹھانا چاہتے تھے کہ ہم بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہیں۔ ان میں سے بعض خصوصاً بمبئی اور مدراس والے تو ایسے تھے کہ ان میں اور سرکاری ملازموں میں بس نام کا فرق تھا۔

کسی ملک کے لوگ جس طرح کے سوالات کرتے ہیں وہ ان کی سیاسی نشوونما کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ اکثر ان کی ناکامی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے ایسے سوالات نہیں پوچھتے جو اصل اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری سیاسی پستی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم نشستوں کی فرقہ وارانہ تقسیم پر اپنا وقت اور قوت ضائع کرتے ہیں اور جی برا کیا کرتے ہیں یا فرقہ وارانہ فیصلے کی مخالفت یا موافقت میں پارٹیاں بناتے ہیں اور ان مسائل کو نظر انداز کر کے جن پر ہماری زندگی اور موت کا دارومدار ہے اس کے متعلق لاحاصل بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ سوالات جو اس روز سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے مرکز میں پوچھے گئے اس سوسائٹی اور لبرل پارٹی کی عجیب دماغی حالت کا آئینہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے کوئی سیاسی اور معاشی عقائد ہی نہیں ہیں۔ ان کی نظر میں وسعت نہیں، ان کی سیاست بس اسی قسم کی ہے جس کا ڈرائنگ روم یا دربار میں چرچا رہتا ہے، مثلاً یہ کہ فلاں بڑے عہدہ دار کیا کریں گے اور کیا نہ کریں گے؟

لبرل پارٹی کا نام غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے اور جگہ خصوصاً انگلستان میں اس جماعت کی ایک خاص سیاست تھی یعنی آزاد تجارت اور کاروبار کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا اصول اور شخصی آزادی اور شہری حقوق کا ایک خاص فلسفہ۔ انگلستان کی لبرل پارٹی کی تعلیم اور عقائد کی بنیاد معاشیات پر تھی اور تجارتی آزادی حاصل کرنے اور

شاہی اجاروں اور بے ضابطوں، محصولوں سے چھٹکارا پانے کی خواہش نے سیاسی آزادی کا حوصلہ پیدا کیا تھا۔ ہندوستان کی لبرل پارٹی کے عقائد ایسا کوئی پس منظر نہیں رکھتے۔ ہندوستانی لبرل آزاد تجارت کے قائل نہیں۔ حال کے واقعات نے اچھی روشن کر دیا ہے کہ وہ سیاسی آزادی اور شہری حقوق کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ دیسی ریاستوں میں قریب قریب منصب داری نظام رائج ہے، ان کی حکومت مطلق العنانی پر مبنی ہے۔اور وہاں جمہوریت اور شخصی آزادی کا ابھی تک ذکر بھی نہیں ہے۔اس کے باوجود یہ لبرل ان سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور عموماً ان کی حمایت کرتے ہیں، یہ بھی ایک صفت ہے جو انہیں یورپ کے لبرلوں سے ایک جدا قسم بنا دیتی ہے۔لبرل کے معنی ہیں حریت پسند۔بہر حال اس لفظ کے جو معنی بھی لیجئے ہندوستانی لبرل حریت پسند نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حریت پسند ان کے کہیں کہیں چھو گئی ہے۔یہ ٹھیک بتانا کہ وہ ہیں کیا، بہت مشکل ہے۔اس لیے کہ ان کے خیالات کی کوئی مضبوط اثباتی بنیاد نہیں اور اگر چہ وہ تعداد میں کم ہیں، پھر بھی ایک دوسرے سے متفق نہیں۔ان کی طاقت صرف نفی میں ہے۔انہیں ہر طرف غلطیاں ہی دکھائی دیتی ہیں اور وہ ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ اس طرح حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔سچ پوچھئے تو ان کے لیے حقیقت ہمیشہ دو انتہائی مسلکوں کے بیچ میں کہیں پر ہوتی ہے۔وہ ہر چیز پر جس میں انہیں انتہائی پسندی نظر آتی ہے اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح وہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ ہم نیک، اعتدال پسند اور اچھے ہیں۔یہ طرز عمل انہیں غور و فکر کے تکلیف دہ اور دشوار سلسلوں میں الجھنے سے بچائے رہتا ہے اور وہ اس پر بھی مجبور نہیں ہوتے کہ اپنی طرف سے کوئی تعمیری خیال پیش کریں۔ بعض کو ایک طرح سے خیال ہوتا ہے کہ یورپ میں سرمایہ داری پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئی ہے اور اب مصیبت میں پڑی ہے لیکن دوسری طرف ان کے

نزدیک یہ بات بھی کھلی ہوئی ہے۔ کہ اشتراکیت بری چیز ہے، اس لیے کہ وہ مستقل حقوق اور اغراض پر حملہ کرتی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر کوئی پر اسرار تدبیر سمجھ میں آ جائے کوئی بیچ کی منزل، اس لیے کہ اس درمیان میں تو مستقل شخصی حقوق املاک وغیرہ کا تحفظ کرنا چاہیے۔ اگر کبھی یہ بحث چھڑے کہ دنیا گول ہے، تو غالباً یہ لوگ ان دونوں خیالات کو جن سے انتہاپسندی ظاہر ہوتی ہے رد کر کے کام چلانے کے لیے یہ کہہ دیں کہ وہ شاید چوکور یا بیضاوی ہے۔

یہ لوگ فضول اور غیر اہم باتوں پر خاصے برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور ایسی چیخ و پکار مچاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جان بوجھ کر اور اس لیے بھی کہ یہ خصوصیت ان کے شعور کی تہہ میں بیٹھ گئی ہے۔ وہ بنیادی مسائل سے پہلو بچاتے ہیں کیونکہ ایسے مسائل بنادی اصلاح اور مردانہ مصلحت اندیشی اور عمل کے طالب ہوتے ہیں۔ اس لیےلبرلوں کی ہار جیب دونوں یکساں بے اثر ہوتی ہے۔ ان کا کسی اصول سے تعلق بھی ہوتا۔ گویا اس پارٹی کی سب سے بڑی خصوصیت (اور اگر ایسے ہیولے میں یہ بات ممکن ہو تو اس کی خاص علامت) ہر بری اور اچھی چیز میں اعتدال ہے۔ یہ ایک فلسفہ حیات ہے اور پارٹی کا پرانا نام ہے یعنی موڈریٹ ہی شاید اس کے لیے سب سے زیادہ مناسب تھا۔

میں میانہ روی میں اپنی خاص شان سمجھتا ہوں، رگ مجھے ٹوری سمجھتے ہیں اور ٹوری رگ خیال کرتے ہیں (۱)

(ایلکسینڈر پوپ)

لیکن میانہ روی چاہے جتنی قابل تعریف چیز ہو، وہ ایک روشن یا درخشاں صفت نہیں ہے۔ وہ مزاج میں خشکی پیدا کرتی ہے اور اس طرح بدقسمتی سے ہندوستانی لبرل رونی صورت والوں کی فوج بن گئے ہیں، ان کے چہرے افسردہ اور روکھے، ان کی تحریر اور بات چیت بے رس ہوتی ہے اور وہ زندہ دلی سے بالکل نا آشنا ہیں۔ ظاہر

ہے ان میں سبھی ایسے نہیں، اور ان لوگوں میں جنہیں مستثنیٰ کرنا ضروری ہے سرتیج بہادر سپرو سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ شخصی طور پر سرتیج بہادر ہرگز غیر دلچسپ آدمی نہیں ہیں۔ ان میں ظرافت کی کمی نہیں اور خود ان پر کوئی فقرہ چست کیا جائے تو اس کا بھی لطف اٹھا سکتا ہیں لیکن مجموعی طور پر لبرل جماعت کا فلسفہ تن پروری اور دولت پرستی کے ٹھس پن اور ٹھوس پن کا معراج ہے۔ الہ آباد کے اخبار ''لیڈر'' نے جو لبرل اخباروں میں سب سے ممتاز ہے، پار سال ایک ایڈیٹوریل لکھا تھا جس سے اصل صورت حال ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں بیان کیا تھا کہ بڑے اور غیر معمولی صفات کے لوگ ہمیشہ دنیا کے سر بلائیں لائے ہیں او اس لیے معمولی اوسط قابلیت کے آدمیوں کو ان پر ترجیح دینا چاہیے۔ کسی دیدہ دلیری سے یہاں کند ذہنی اور سست روی کا جھنڈا لہرایا گیا ہے!

میانہ روی، قدامت پسند، خطرے اور اچانک تبدیلی سے بچنے کی خواہش ایسی خصوصیتیں ہیں جو بڑھاپے کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں اور اکثر کے لیے ان میں مبتلا ہو جانا لازمی ہے۔ نوجوانوں میں ان کا ہونا اتنا مناسب نہیں لیکن ہمارا ملک پرانا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں بچے تک تھکے ماندے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے چہروں پر پھیکا پن اور بڑھاپے کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن اس پرانے ملک کو بھی وہ قوتیں جو زندگی کو بدلتی ہیں، متھے دے رہی ہیں اور میانہ روی کا فلسفہ حیات درہم برہم ہو گیا ہے۔ پرانی دنیا دم توڑ رہی ہے اور لبرل لوگوں کی ساری میٹھی میٹھی معقول پسندی سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، طوفان، سیلاب اور زلزلے کسی کی دلیلیں نہیں سنتے۔ لبرلوں نے اب تک جن تصورات پر اپنے عقیدے اور عمل کو مبنی کیا تھا وہ سب جواب دے رہے ہیں اور ان میں اب اتنی ہمت نہیں ہے کہ غور و فکر اور عمل کے لیے نئی راہیں نکالیں۔ ڈاکٹر اے ان وائٹ ہیڈ یورپ کی تہذیبی روایات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''ان تمام روایات کو اس مضر

مفروضے نے ناقص کردیا ہے کہ ہر نسل کم وبیش اسی ماحول میں اپنی زندگی گزارے گی جس میں کہ پچھلی نسلوں نے گزاری تھی اور اس ماحول کی اسی قوت تشکیل کے ساتھ اپنی اولاد کی زندگی پرانے سانچے میں ڈھالنے کے لئے چھوڑ جائے گی۔ ہم انسانی تاریخ کے اس دور میں رہتے ہیں جب کہ پہلی بار یہ فریضہ غلط ثابت ہوا ہے۔ ڈاکٹر وائٹ ہیڈ نے اپنی تشریح میں بہت زیادہ نرمی سے کام لیا ہے، اس لئے کہ یہ فرضیہ ایک ہمارے زمانے کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ غلط رہا ہے۔ اگر یورپی روایات میں قدامت پسندی ہے تو ہماری روایات میں قدامت پسندی سے بھی اور کچھ زیادہ ہے۔ لیکن جب تغیرات کا وقت آتا ہے تو زندگی کی تشکیل قوتیں ان روایات کا ذرا بھی خیال نہیں کرتی ہیں۔ ہم بے بس کھڑے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے منصوبوں کی ناکامی کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں اور یہ کیفیت کہ مسٹر جرلڈ ہرڈ نے دکھایا ہے۔ خودفریبی کی سب سے تباہ کن صورت ہے یہ تدبیروں کا قصور نہیں بلکہ دوسرے کا جان بوجھ کر ہمارے کام کو بگاڑنے کا نتیجہ ہے۔

ہم سب اس افسوسناک خودفریبی میں مبتلا ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ گاندھی جی بھی اس سے بالکل بچے ہوئے نہیں ہیں لیکن ہم کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کی حقیقتوں سے غافل نہ ہوجائیں، ہمارے تجربے اور ہماری غلطیاں کبھی بھی اس خودفریبی کے زور کو کم کردیتی ہیں اور ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن لبرلوں میں یہ مرض ہمارے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید ہے۔ وہ غلطی کرنے کے ڈر سے کچھ کرتے ہیں نہیں، گرنے کے ڈر سے جگہ ہی سے نہیں ہلتے عوام کے ساتھ وہ تعلقات قائم نہیں کرتے جو دماغ اور حوصلے کی درستی کے لئے ضروری ہے اور اپنے تصورات کی کوٹھریوں میں اس طرح بیٹھے رہتے ہیں گویا ان پر کسی نے جادو کیا ہے یا خود انہوں نے اپنے آپ کو ہلنے جلنے کی قوت سے محروم کردیا ہے۔ کوئی ڈیڑھ سال ہوا سری نواس شاستری

صاحب نے اپنے لبرل بھائیوں کو خبردار کرنے کے لیے کہا تھا کہ یہ نہ ہو کہ آپ الگ کھڑے رہیں اور بس جو کچھ ہوتا ہوا سے ہونے دیں۔ اس آگاہی کا پورا مطلب شاید سری نواس شاستری صاحب خود بھی نہیں سمجھے۔ ان کا غور وفکر حکومت کی کاروائیوں تک محدود ہے اور وہ دراصل ان دستوری تغیرات کی طرف اشارہ کر رہے تھے جنہیں مختلف سرکاری کمیٹیاں عمل میں لانے کی تدبیریں کر رہی تھیں۔ لیکن لبرلوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ جب ان کی اپنی قوم کے لوگ قدم بڑھائے آگے چلے جا رہے تھے تب بھی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ملک کے عوام سے ڈرتے تھے، انہوں نے اپنے عوام کے درمیان غیریت کا ہونا گوارا کیا مگر حاکموں سے نہیں بگاڑی۔ پھر کیا تعجب ہے کہ وہ اپنے دیس میں پردیسی بن گئے، زندگی کا قافلہ گزر گیا اور انہیں الگ کھڑے چھوڑ گیا۔ اس وقت جب ان کے ملک والے جان اور آزادی کے لئے جی توڑ کر لڑ رہے تھے تو اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ لبرل دمدمے کے کس طرف ہیں۔ دمدمے کی دوسری طرف سے وہ ہمیں اچھے اچھے مشورے دے رہے تھے اور بڑی سنجیدگی سے ایسے اخلاقی اصول بیان کر رہے تھے جنہیں ہر کوئی جانتا ہے اور جنہیں سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گاڑھا لیسدار روغن ہمارے منہ پر لیس رہا ہے۔ گول میز کانفرنسوں میں حکومت برطانیہ کے ساتھ ان کے اتحاد وعمل سے انکار کرتے تو اس سے ضرور فرق پڑتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان کانفرنسوں میں حکومت برطانیہ کے ساتھ ان کے اتحاد وعمل نے حکومت کو جو اخلاقی تقویت پہنچائی اس کا خاصہ اثر ہوا۔ اگر وہ اتحاد وعمل سے انکار کرتے تو اس سے ضرور فرق پڑتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان کانفرنسوں میں سے ایک میں برطانیہ کی لیبر پارٹی شریک نہیں ہوئی، مگر ہمارے لبرلوں کو بھلا کون چیز روک سکتی تھی۔ ان سے بعض انگریزوں نے بھی درخواست کہ کہ آپ شریک نہ ہوں، پر وہ نہ مانے۔ ہم سب میانہ رو یا انتہا پسند ہوتے ہیں، کوئی کم کوئی زیادہ، کبھی کسی غرض کے

لئے کبھی کسی کے لئے۔ اگر ہمارا دل کسی بات میں لگا ہے تو اس کا ہمارے جذبات پر اثر ہوگا۔ ہر معاملہ میں جہاں اس سے بحث ہوگی ہم نرمی کی بہ نسبت گرمی طرف مائل ہوں گے۔ جب ایسا نہ ہو تو ہمارا اس میں کوئی نقصان نہیں اگر ہم خوشی کے ساتھ رواداری برتیں اور ایک فلسفیانہ میانہ روی اختیار کریں جس کا اصل مقصد بے تعلقی پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نرم سے نرم موڈریٹ نہایت انتہا پسند اور لڑنے پر بالکل آمادہ ہو گئے ہیں۔ جب یہ تجویز پیش ہوئی ہے کہ **ملک** کے کوئی مستقل حقوق املاک وغیرہ مٹا دیے جائیں، ہمارے لبرل دوست ایک حد تک خوش حال اور دولت مند لوگوں کے نمائندے ہیں۔ ان کا سوراج کے لئے انتظار کرنے میں کوئی ہرج نہیں، اس لئے وہ سوراج کے معاملے میں برانگیختہ نہیں ہوتے۔ لیکن بنیادی معاشرتی اصلاح کی ہر تجویز انہیں بہت ہی گڑبڑا دیتی ہے، وہ اپنی میانہ روی بھول جاتے ہیں اور دوسرے کی بات ماننے پر خوشی سے آمادہ بھی نہیں ہوتے۔ یعنی ان کی میانہ روی دراصل اس رویہ تک محدود ہے جس کا تعلق برطانوی حکومت ہند سے ہے اور وہ اپنے دل میں اس امید کی پرورش کر رہے ہیں کہ اگر وہ ادب سے بات کرتے اور سمجھوتہ پر آسانی سے راضی ہوتے رہے تو شاید انہیں اس نیک چلنی کے بدلے میں شنوائی کا شرف بخشا جائے۔ ان کے لئے انگریزوں کی رائے تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ وہ نیلی کتابوں (۲) کا شوق اور انہماک سے مطالعہ کرتے ہیں، ارسکن مے کی تصنیف ''پارلیمنٹ کے رواج'' اور اسی قسم کی دوسری کتابیں ہر وقت ان کے پاس رہتی ہیں۔ اور کوئی نئی سرکاری رپورٹ شائع ہوتی ہے تو ان کے یہاں بڑی چہل پہل ہوتی ہے اور خیالی گھوڑے دوڑائے جانے لگتے ہیں۔ لبرل لیڈر جب انگلستان سے واپس آتے ہیں تو ایک عجیب پراسرار انداز سے وائٹ ہال کے بڑے آدمیوں کی کاروائیوں کا حال بیان کرتے ہیں، کیونکہ وائٹ ہال لبرلوں جوابی تعاونیوں اور ایسی جماعتوں کا بیکنٹھ ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ جب

نیک امریکن مرتے ہیں تو ان کی روحیں پیرس پہنچتی ہیں اور اب ممکن ہے اچھے لبرلوں کی روحیں وائٹ ہال کے گردونواح میں گشت لگاتی رہتی ہوں۔

میں لکھ تو رہا ہوں لبرلوں کے متعلق، لیکن یہ سب ہم لوگوں کے متعلق بھی ہے جو کانگریس میں ہیں کہا جا سکتا ہے۔ جوابی تعاون والوں کی نسبت یہ اور بھی زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ میانہ روی میں لبرلوں سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ معمولی لبرل اور معمولی کانگریسی میں بہت بڑا فرق ہے لیکن دونوں کی ایسی حد بندی نہیں کی جا سکتی جو صاف ہو اور مغالطے کی گنجائش نہ چھوڑے، کیونکہ خیالات اور تصورات کو دیکھئے تو ان لبرلوں میں جو اپنی جماعت میں سب سے زیادہ آزاد خیال ہیں اور میانہ رو کانگریسیوں میں ایک کو دوسرے سے بہتر ثابت کرنا مشکل ہے۔ لیکن گاندھی جی کی بدولت یہ تو ہو گیا ہے کہ ہر کانگریسی کا اپنی سرزمین اور ملک کے رہنے والوں سے تھوڑا بہت تعلق ہو گیا ہے، اس نے سیاسیات کے میدان عمل میں ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی ہے اور طرح وہ مبہم اور ناقص تصورات کے چند برے نتیجوں سے بچ گیا ہے۔ لبرلوں کا حال کچھ اور ہے ان کا رشتہ پرانی دنیا سے بھی ٹوٹ گیا ہے اور نئی دنیا سے بھی۔ مجموعی حیثیت سے وہ انسان کی ان قسموں میں سے ہیں جو اب ناپید ہو رہی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں ہم میں سے اکثر ان احساسات کو کھو چکے ہیں جو مذہبوں کے عروج سے پہلے انسانی کی رہبری کرتے تھے اور بصیرت کی نئی شکل ہمیں حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہماری قسمت میں نہ "پروٹنس" (۳) کو سمندر سے نکلتے ہوئے دیکھنا ہے" نہ" بوڑھے ٹرئین (۳) کو اپنا پیچدار سنگھ بجاتے سننا" اور بس تھوڑے ہی ایسے خوش قسمت ہیں کہ

"ریت کے ذرے میں ایک دنیا دیکھ سکیں
اور ایک جنگلی پھول میں فردوس کا سماں

فضائے لامحدود کو ہتھیلی پر رکھ سکیں
اور ایک گھڑی میں ابدیت محسوس کرلیں"

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم میں سے اکثر فطرت کی رگوں میں خون کو دوڑتے پھڑتے نہیں محسوس کرتے، نہ اپنے کان کے پاس اس کے دھیمے بول سن سکتے ہیں، نہ اس کے چھوٹے سے ہمارے جسم میں مسرت کا لرزہ آتا ہے۔ وہ دن تو گئے لیکن اگر ہم پہلے کی طرح فطرت میں عظمت کے آثار نہیں دیکھ سکتے تو ہم نے نوع انسانی کی فتح اور شکست میں، اس کے زبردست خوابوں اور اندرونی طوفانوں میں، اس کے تڑپا دینے والے درد اور اس کی ناکامیوں میں، اس کی کش مکش اور اس کی مصیبتوں میں اور اس یقین میں، جو اور سب کیفیتوں پر چھایا رہتا ہے اور اس کا عظیم الشان مقصد اور اس کی آرزوئیں پوری ہوں گی۔ وہی چیز دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک طرح سے معاوضہ ہے ان تمام دل شکنیوں کا جو ایسی کوشش اور جستجو کے ساتھ لگی ہوتی ہیں اور اس نے ہمیں اکثر حقیر حوصلوں کو بھلا کر بلندی کی طرف مائل کیا ہے۔ لیکن بہتیرے ایسے ہیں جنھوں نے انسانی سرگزشت میں حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور چونکہ انہوں نے پرانی وضع کو چھوڑ دیا ہے۔ انہیں اب کسی طرف کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ وہ نہ بہتر زندگی کے خواب دیکھتے ہیں نہ ان میں عمل کی صلاحیت ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ فرانس کے بڑے انقلاب میں اور روسی انقلاب میں نوع انسانی نے کس طرح بےتاب ہوکر پلٹے کھائے، نوع انسانی کی وہ خواہشیں جو مدتوں سے دبی ہوتی ہیں جب اپنی تمام پیچیدگیوں سمیت کوہ آتش کی طرح اچانک بے دردی کے ساتھ آگ برسانے لگتی ہیں تو وہ ڈر جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک نوع انسانی نے اپنے قیدخانے کی ایک دیوار بھی نہیں گرائی ہے۔

لوگ خود پسندی کے غصے میں اکثر کہتے ہیں کہ وطن پرستی کانگریسیوں کا اجارہ نہیں ہے۔ یہی فقرہ اس طرح باربار دہرایا جاتا ہے کہ آدمی نئی بات سننے سے مایوس

ہو کر پریشان ہو جاتا ہے، مجھے امید ہے کہ کسی کانگریسی نے اس جذبہ میں اکئی دوانی کا حصہ دار ہونے کا دعویٰ نہ کیا ہوگا۔ بہر حال میں اسے ہرگز کانگریس کا اجارہ نہیں سمجھتا اور جو کوئی بھی چاہتا ہو میں خوشی سے اسے اس کے حوالے کر دوں گا۔ وطن پرستی اکثر ان لوگوں کی جائے پناہ ہوتی ہے جو موقع سے فائدہ اٹھانا یا اپنی حیثیت بنانا چاہتے ہیں اور ہر مذاق اور غرض اور طبقے کے لوگوں کے لئے اس کی ایک مناسب قسم مل جاتی ہے۔ اگر عیسیٰ کا وہ چیلا جس نے انہیں دغا دی تھی آج کل ہوتا تو وہ بھی وطن پرستی کی آڑ لیتا۔ وطن پرستی اب کافی نہیں رہی ہے ہمیں اب اس سے برتر، اس سے وسیع تر اور بلند تر مسلک درکار ہے۔

میانہ روی بذات خود بھی کافی نہیں، ضبط اچھی چیز ہے اور ہماری شائستگی کا اسی سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ضبط کے ساتھ وہ بھی تو چاہئے کہ جسے روکئے اور قابو میں رکھیئے۔ انسان کی قسمت میں ازل سے مقرر ہے کہ وہ عناصر قدرت کو قابو میں لائے۔ بجلی پر سوار ہو، آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں اور پانی کے تیز اور اُبلتے دھاروں کو اپنے کام میں لائے۔ لیکن اس کے لئے سب سے زیادہ مشکل ان جذبات کی روک تھام کرنا اور انہیں قابو میں لانا ہے۔ جو اس کے اندر امنڈتے اور اسے جلاتے رہتے ہیں۔ جب تک وہ انہیں اپنے قبضے میں نہ کر لے وہ انسانیت کے پورے ورثہ کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ٹانگوں کو آگے نہ بڑھائیں جو خود ہلنے سے معذور ہیں، ان ہاتھوں سے کام نہ لیں جن پر فالج گرا ہے؟

اس موقع پر رائے کیمپل کے چار مصرعے لکھے بغیر نہیں رہا جاتا جو اس نے جنوبی افریقہ کے چند ناول نویسوں سے کہتے تھے۔ یہ ہندوستان کی بعض سیاسی جماعتوں پر بھی اسی طرح پورے اُترتے ہیں۔

لوگ اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ تمہارے ضبط پر کوئی جذبہ غالب نہیں آ سکتا اس معاملہ میں مجھے تم سے پورا اتفاق ہے۔

تم لگام دبانے کو تو خوب استعمال کرتے ہو
مگر یہ بتاؤ کہ گھوڑا کم بخت کہاں ہے؟

ہمارے لبرل دوست کہتے ہیں کہ وہ اعتدال کے تنگ راستے پر چلتے ہیں اور کانگریس اور حکومت ہند کے دونوں کناروں کے بیچ میں اپنی کشتی کو چلاتے ہیں۔ انہوں نے اس کا فیصلہ کرنا اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اس میں یا اس میں کون سی خامی ہے، اور اس بات پر اپنی پیٹھ ٹھونکتے ہیں کہ ان میں نہ اس کے عیب ہیں نہ اس کے۔ وہ ترازو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور انصاف کی دیوی کی طرح وہ شاید اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں یا ان پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ کیا یہ میرا خیال ہی ہے جو مجھے صدیوں پیچھے لے جاتا ہے اور مجھے یہ مشہور کلمے سناتا ہے۔

عالمو اور خود پسند عابدو!۔۔۔ تم اندھے رہبر ہو کہ ایسے گناہ سے جو اونٹ کے برابر ہو چشم پوشی کرسکتے ہو اور ذرا ذرا سی بات تمہاری نظروں میں کھٹکتی ہے!۔۔۔

---

(۱) وگ انگلستان کی پرانی حریت پسند اور ٹوری قدامت پسند پارٹی کا نام تھا۔
پارلیمینٹ میں جو تجویزیں اور قانون منظور ہے وہ نیلے سرورق کے شائع ہوتے ہیں Blue Books اس طرح ایک خاص اصطلاح ہوگئی ہے۔
پروٹنس اور ٹرٹین یونانیوں کے دریائی دیوتا تھے۔

درجہ نوآبادی اور کامل آزادی

پچھلے سترہ برس میں جن لوگوں نے کانگریس کی سیاست طے کی ہے وہ بیشتر متوسط طبقے کے لوگ تھے خواہ وہ لبرل ہوں یا کانگریسی وہ تھے ایک ہی طبقے کے لوگ اورانہوں نے ایک سے ماحول میں تربیت پائی تھی۔ان کی زندگی ان کا میل جول ان کے تعلقات ایک ہی رنگ کے تھے اور ریورژوار (۱) نصب العین کی دو قسمیں جن سے انھیں الگ الگ عقیدت تھی ابتدا میں یوں سمجھے کہ ایک ہی سے تھے۔مزاج اور طبیعت کے اختلاف نے ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کردیا اور ان کے نقطعہ نظر کو بدل دیا۔ایک گروہ کی نگاہ حکومت اور متوسط طبقے کے سر پرآوردہ، مالدار آدمیوں کی طرف اٹھی، دوسرے کی متوسط طبقہ کے کم حیثیت والے حصے کی طرف جھکی۔ان کے خیالات دراصل ایک سے تھے، ان کے مقاصد میں کوئی فرق نہ تھا، لیکن دوسرے گروہ کو بازار کے ادنٰی پیشوں کے لوگوں اور تعلیم یافتہ مگر بے روزگار آدمیوں کی کثیر تعداد پیچھے سے دھکیلنے لگی۔ان کا لہجہ بدل گیا انہوں نے مراتب کا لحاظ اور ادب سے بات کرنا چھوڑ دیا اور زور زور سے اور بڑھ چڑھ کر بولنے لگے۔ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ عمل میں تاثیر پیدا کریں، اس لئے انہوں نے سخت کلامی کر کے کچھ تسکین حاصل کی۔سیاسیات کو اس طرح کروٹ بدلتے دیکھ کر اعتدال پسند (موڈریٹ) ڈر گئے انہوں نے اس دوڑ میں شریک ہونے کا خیال چھوڑ دیا اور تنہائی کو سلامتی جانا۔اس حالت میں بھی کانگریس کے اندر متوسط طبقہ کے اونچے درجہ کے نمائندوں کی تعداد بہت تھی، اگرچہ اکثریت انہیں کی رہی جو ادنٰی درجہ کے تھے۔ان کو ادھر یہی ایک حوصلہ کھینچ کر نہیں لایا کہ قوم کو جنگ میں کامیابی ہو، بلکہ وہ اس جنگ کے ذریعے اپنے دل کی ایک خواہش بھی پوری کرنا چاہتے تھے۔وہ اس کی بدولت اپنی کھوئی ہوئی آبرو اور خودداری حاصل کرنا اور اپنی بگڑی حیثیت کو بنانا چاہتے تھے۔ قومیت کا جذبہ عام طور سے اسی طرح ابھرتا ہے اور اگرچہ یہ خصوصیات ہر خیال کے

لوگوں میں یکساں پائی جاتی تھیں۔ اعتدال اور انتہا پسندوں کے مزاج کا فرق یہیں پر ظاہر ہوا۔ آہستہ آہستہ متوسط طبقہ کا ادنیٰ درجہ کانگریس پر حاوی ہوگیا اور اس کے بعد کسانوں کا اثر بھی محسوس ہونے لگا۔ جیسے جیسے کانگریس دیہاتی آبادی کی نمائندگی کرنے لگی اس کے اور لبرلوں کے درمیان جو خلیج حائل ہوگئی تھی وہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ لبرلوں کے لئے کانگریس کا نقطۂ نظر سمجھنا یا اس کی قدر پہچاننا ناممکن سا ہوگیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والے بڑے آدمی کے لئے پھونس یا مٹی کے جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے والے کی بات سمجھنا مشکل ہے۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود دونوں کا فلسفہ قومی اور بورژوا تھا یا فرق تھا جو تھا وہ قسم کا نہیں تھا، شدت کا تھا۔ بہت سے لوگ جو لبرل جماعت میں بے تکلفی سے کھپ سکتے تھے آخر وقت تک کانگریس میں رہے۔

کئی پشتوں تک انگریز ہندوستان کو اسی وضع کا ایک بہت بڑا زمینداروں کا گھر سمجھتے رہے جیسے کہ اگلے زمانے میں انگلستان میں ہوتے تھے۔ وہ گویا میاں لوگ تھے جو اس مکان کے مالک تھے اور اس کے سب اچھے حصوں میں رہتے تھے اور ہندوستانی ملازموں کی طرح شاگرد پیشے، برتن دھونے کے کمرے اور باورچی خانہ میں رکھ دیئے گئے تھے۔ ہر باضابطہ زمیندار گھرانے کی طرح جس میں ملازموں کے مراتب مقرر ہوتے ہیں یعنی خانساماں، منتظم، باورچی، خادمہ، سائیس وغیرہ ویسے ہی یہاں کا بھی قاعدہ تھا اور اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ کس کا درجہ بڑا ہے کس کا کم۔ لیکن اس گھرانے کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کے درمیان معاشرتی اور سیاسی تفاوت تھا جس کا مٹنا ناممکن تھا۔ ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہئے کہ برطانوی حکومت نے ایسے انتظام کو ہمارے اوپر مسلط کیا، تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم نے یا ہم میں سے ایک بڑی تعداد نے اسے منظور کرلیا اور اسے اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کا ایک قدرتی اور لازمی نظام سمجھا۔ ہم میں وہی ذہنیت پیدا ہوگئی جو ایک زمیندار

گھرانے کے اچھے نوکر کی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ہمیں یہ انوکھی عزت بخشی جاتی تھی کہ ڈرائنگ روم میں چائے کی ایک پیالی پینے کو دے دی جاتی تھی اور ہمارے حوصلے کی انتہا یہ تھی کہ شریف سمجھے جائیں اور فرداً فرداً ترقی کر کے اعلیٰ طبقہ میں پہنچ جائیں۔ انگریزوں کا ہماری طبیعتوں کو اس طرح قابو میں کر لینا نیک کارنامہ تھا جس کی عظمت ان کے تدبر اور ان کی فوج کی کامیابیوں سے زیادہ تھی۔ جیسا کہ اگلے زمانہ کے حکما نے کہا ہے۔ غلام کے دماغ میں غلامی سرایت کر گئی، وہ غلام کی طرح سوچنے بھی لگا۔

زمانہ بدل گیا ہے اب اس وضع کی تہذیب جس کا نمونہ انگریز زمینداروں کا گھرانا تھا نہ انگلستان میں خوشی سے تسلیم کی جاتی ہے، نہ ہندوستان میں۔ پھر بھی ہم میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو شاگرد پیشہ ہیں، گھسے رہنا چاہتے ہیں اور ملازمت کی سنہری پٹیوں اور وردیوں پر ناز کرتے ہیں۔ دوسرے ہیں جو لبرلوں کی طرح اس زمینداروں کے گھر اور اس کے تمام لوازمات کو قابل قبول سمجھتے ہیں، عمارت اور طرز تعمیر کی تعریف کرتے ہیں لیکن اس کی امید رکھتے ہیں کہ ایک ایک کر کے خود اس کے مالکوں کی جگہ لے لیں گے۔ اسے وہ ہندوستانی بنانا یا ہندیانہ کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ نظام حکومت کا رنگ بدل جائے یا زیادہ سے زیادہ کوئی نیا انتظام قائم کیا جائے بالکل نئی ریاست قائم کرسکنے کا تو تصور بھی یہ نہیں کر سکتے۔

ان کے لئے سوراج کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز پہلے کی سی حالت پر قائم رہے بس رنگ زیادہ گہرا ہو جائے۔ مستقبل کا یہی ایک نقشہ ان کے ذہن میں آسکتا ہے کہ وہ یا انہیں کے سے لوگ سیاسی ڈرامہ کا خاص پارٹ کریں، اور اعلیٰ انگریز عہدہ داروں کے عہدے حاصل کریں، ملازمتوں، سرکاری محکموں، قانون ساز مجلسوں، تجارت، صنعت سب کی صورت یہی رہے۔ سول سروس والے اپنے کام میں لگے

رہیں، راجہ مہاراجہ اپنے محلوں میں براجتے رہیں اور کبھی کبھی فینسی ڈریس یا ناچ رنگ کے لباس جواہرات کی چمک سے اپنی رعایا کو مرعوب کرنے کے لئے جلوہ افروز ہوں یا زمیندار ایک طرف خاص تحفظ کا مطالبہ کرتے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو ستاتے رہیں، یا ساہوکار اپنی روپیوں کی تھیلیاں لئے زمیندار اور کاشتکار دونوں کی زندگی دوبھر کرتا رہے یا وکیل اپنی فیس وصول کرے اور خدا اپنے آسمان پر رہے۔

اصل میں ان لوگوں کے فلسفہ کی بنیاد موجودہ صورت حال قائم رہنے پر ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو تبدیلیاں وہ چاہتے ہیں وہ بس شخصی ہیں۔ ان تبدیلیوں کو وہ انگریزوں کی رضامندی سے آہستہ آہستہ عمل میں لانا چاہتے ہیں، جیسے کوئی چیز چھن کر قطرہ قطرہ آتی ہے۔ ان کی سیاسیات اور معاشیات کا دارومدار برطانوی سامراج کے استحکام اور بقاء پر ہے۔ ان کے نزدیک اس سامراج کو کم از کم ایک بڑی مدت تک زوال نہیں آ سکتا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اسی مطابق ڈھال لیا ہے اور وہ اس کے سیاسی اور معاشی فلسفے ہی کو بجا تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کے اخلاقی معیار کو مانتے ہیں جو برطانوی تسلط کے قیام کو مدنظر رکھ کر مقرر کیا گیا ہے۔

اس رویہ سے کانگریس کا رویہ بالکل مختلف ہے، اس لئے کہ کانگریس انتظام حکومت کو بدلنا ہی نہیں بلکہ ایک نئی ریاست کی طرح ڈالنے کی فکر میں ہے۔ اس نئی ریاست کا نقشہ اوسط قابلیت کے کانگریسیوں کے ذہن میں بالکل صاف نہیں ہے اور لوگ اپنی اپنی رائے رکھتے ہیں۔ کانگریسی عام طور پر اس پر متفق ہیں کہ موجودہ حالات اور طرز عمل نہ جاری رہ سکتا ہے اور نہ رہے گا اور بنیادی تبدیلیاں کرنا ناگزیر ہے۔ اسی میں سمجھے درجہ نوآبادی اور کامل آزادی کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ درجہ نوآبادی میں پرانے معاشرتی نظام کا باقی رہنا اور انگلستان کے معاشی نظام سے ہمارا، ظاہری اور پوشیدہ زنجیروں سے جکڑے رہنا فرض کیا جاتا ہے آزادی میں ہمیں اس کا اختیار ہوگا یا ہونا چاہیے کہ ہم اپنی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام تعمیر کریں۔

اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انگلستان یا انگریزی قوم سے ایسی عداوت برتی جائے جسے کم یا دور کرنے کی گنجائش نہ ہو، اور نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان سے قطع تعلق کرنے کی خواہش کو ہر طرح کا نقصان اٹھا کر پورا کریں۔ گذشتہ واقعات کو دیکھتے ہوئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان بغض و کینہ کا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ ٹیگور نے کہا ہے کہ بے سلیقہ طاقت کنجی کو خراب کر کے کلہاڑی سے تالا کھولتی ہے۔ ہمارے دلوں کی کنجی مدتیں ہوئیں کہ توڑ ڈالی گئی اور انگریزوں سے ہمیں اس بنا پر رغبت ہو نہیں سکتی تھی کہ انہوں نے اس کنجی کی جگہ بے تکلف کلہاڑی سے کام لیا۔ لیکن اگر ہمارا حوصلہ یہ ہے کہ چھوٹی باتوں سے گزر کر ہندوستان اور نوع انسان کی بڑی خدمات انجام دیں تو ہمارے لئے اس کا موقع نہیں ہے کہ اپنے آپ کو وقتی جوش کے حوالے کریں اور اگر ہم اس طرف مائل بھی ہوں تو وہ سخت تربیت جو گاندھی جی پندرہ برس سے دے رہے ہیں ہمیں روک لے گی۔ میں یہ باتیں انگریزوں کے بنائے ہوئے جیل خانہ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ سات مہینے سے میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں اور جتنی تکلیف مجھے اس قید تنہائی میں ہوئی اتنی جیل میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے واقعات سے میرا دل غصہ اور عداوت سے بھر آیا ہے لیکن میں اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈھونڈتا ہوں تو وہاں مجھے انگلستان یا انگریزوں سے عداوت کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ مجھے برطانوی ملوکیت سے نفرت ہے اور مجھے اس پر غصہ آتا ہے کہ ہندوستان اس کا شکار رہا ہے۔ مجھے سرمایہ داری کے نظام سے نفرت ہے اور جس طرح برطانیہ کے حاکم طبقے ہندوستان کا خون چوستے ہیں اس سے مجھے اور بھی نفرت ہے اور اس پر بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ لیکن میں انگلستان یا تمام انگریزی قوم کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا اگر میں ایسا کرتا تو اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلتا۔ اس لئے کہ پوری قوم کی قوم سے خفا ہو جانا یا اسے ملزم قرار دینا کسی قدر حماقت کی بات ہے، وہ بھی حالات سے اتنی ہی مجبور

ہوتی ہے جتنے کہ ہم۔

اپنی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ انگلستان کا میری ذہنی ساخت پر اتنا زیادہ اثر ہے کہ اس سے کبھی بھی پوری غیریت نہیں برت سکتا۔ میں چاہے جتنی کوشش کروں میں ان ذہنی عادتوں، اس معیار اور دوسری قوموں اور عام زندگی کے بارے میں رائے قائم کرنے کے ان طریقوں سے جو میں نے انگلستان کے اسکول اور کالج میں سیکھے تھے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

سیاسی معاملات کے سوا میرے ذہنی میلانات بھی مجھے انگلستان کی طرف مائل کرتے ہیں اور اگر میں ہندوستان میں انگریزی حکومت کا ایسا کٹر مخالف ہو گیا ہوں جو کسی مصالحت پر راضی نہیں ہو سکتا تو اس میں میری تربیت اور طبیعت کا کوئی قصور نہیں۔ انگریزوں کی قوم نہیں بلکہ یہ حکومت یہ تسلط اصل چیز ہے جس پر ہمیں اعتراض ہے اور اسی سے ہم خوشی سے مصالحت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم چاہیں تو انگریزوں سے اور دوسری غیر قوموں سے ضرور گاڑھا میل جول رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ہم کو تازی ہوا چاہئے۔ تازے اور جاں بخش خیالات اور ایسا اتحاد عمل جس سے ہماری سیرت کو نقصان نہ پہنچے کیونکہ ہم سٹھیا گئے ہیں، ہمارے خیالات بوسیدہ ہیں لیکن اگر انگریز شیر بن کر آنا چاہیں تو انہیں دوستی یا اتحاد عمل کی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ ملوکیت کے شیر کا اسی کی سی بے دردی سے مقابلہ کیا جائے اور آج ہمارے ملک کا اس خونخوار جانور سے سابقہ ہے۔ جنگل کے وحشی چیتے کو سدھانا اور اس کی خلقی خونخواری کو تربیت کے جادو سے دور کرنا ممکن ہے، لیکن جب سرمایہ داری اور ملوکیت مل جائیں اور کسی بدقسمت ملک پر جھپٹا ماریں تو انہیں قابو میں کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

کسی کا یہ کہنا کہ وہ یا اس کی قوم مصالحت نہ کرے گی ایک معنی میں بیوقوفی ہے، کیونکہ دنیا ہمیں ہر وقت مصالحت کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے اور جب یہ بات کسی

اورقوم یا ملک کے بارے میں کہی جائے تب تو وہ صریحی حماقت ہے۔لیکن لوگ اس پر اڑ جائیں کہ ہم فلاں نظام کو تسلیم نہ کریں گے یا فلاں صورت حال کو گوارا نہ کریں گے تو اس میں صداقت ہو سکتی ہے اور تب انہیں کوئی انسانی قوت اس پر مجبور نہیں کر سکتی کہ مصالحت کر لیں۔ ہندوستانی آزادی اور برطانوی ملوکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور انہیں نہ فوجی عمل داری ہم آہنگ اور یکجا کر سکتی ہے اور نہ مدبروں کی ساری لیس پوت۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان سچے اتحاد عمل کے لئے موافق حالات اسی وقت پیدا ہوں گے جب ہندوستان سے برطانوی ملوکیت مٹا دی جائے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ آج کل کی دنیا میں جب ہر روز ایک ملک کو دوسرے کی ضرورت روز بروز زیادہ ہو رہی ہے۔کامل آزادی کا عقیدہ رکھنا تنگ نظری ہے اور ہم آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو گویا زمانہ کی گھڑی کو پیچھے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لبرل اور امن پرست اور برطانیہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں سب یہی دلیل پیش کر کے ہماری تنگ نظر قومیت پر ہماری سرزنش کرتے ہیں اور ضمنا یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ ہمارے لئے مکمل قومی زندگی کا ذریعہ برطانوی اقوام کی کامن ویلتھ ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگلستان میں ہر رنگ کی حکمت عملی (لبرل، امن پرست، اشتراکی وغیرہ) سامراج کے قیام کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ٹروٹسکی نے لکھا ہے کہ حاکم قوم کی یہ خواہش کہ ہر چیز بس اپنے حال پر قائم رہے اکثر ایک خاص انداز اختیار کرتی ہے جو اپنے کو قومیت کے خیال پر برتر جتاتا ہے۔بالکل جیسے فاتح قوم مال غنیمت کو قبضہ میں رکھنے کے لئے بڑی آسانی سے اس پر مست بن جاتی ہے۔اسی طرح تو گاندھی کے مقابلہ میں میکڈونلڈ اپنے آپ کو بین الاقوامی میل جول کا حامی سمجھتا ہے۔!

مجھے معلوم نہیں کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کیا کرے گا

اور اس کا کیا حال ہوگا۔ لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ جو آج قومی آزادی چاہتے ہیں وہی ہمارے بین الاقوامی تعلقات کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اشتراکیوں کے نزدیک تو قومیت کے کوئی معنی ہی نہیں، لیکن وہ لوگ جو اشتراکی نہیں اور کانگریس کی اگلی صفوں میں ہیں وہ بھی بین الاقوامی میل ملاپ سے پختہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اگر آج ہم کامل آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب دنیا سے قطع تعلق نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ہم تیار ہیں کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنی اس آزادی کے ایک حصہ سے دست بردار ہو جائیں تاکہ ایک بین الاقوامی نظام قائم کیا جا سکے۔ ملوکیت کا کوئی نظام، اس کا نام چاہے جتنا شاندار ہو، ایسی تنظیم کا دشمن ہوگا اور اگر ہم دنیا میں اتحاد عمل اور امن چاہتے ہیں تو اسے حاصل کرنے کے لئے ملوکیت کا نظام کبھی کام نہ آئے گا۔

حال کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے تمام سامراجی نظام خود کفالتی اور معاشی سامراج کے ذریعہ اپنے آپ کو روز بروز دوسروں سے جدا کر رہے ہیں۔ اس لئے بجائے اس کے کہ قوموں کا تعلق زیادہ گہرا ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بالکل خلاف ہو رہا ہے۔

اس کے اسباب دریافت کرنا کچھ مشکل نہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ معاشی نظام کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حکمت عملی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ جہاں اس علاقے میں جو خود کفیل ہو اتحاد عمل بڑھ جاتا ہے، وہاں دوسری طرف باقی دنیا سے علیحدگی بھی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اوٹاوا اور دوسرے فیصلوں کا اثر یہ ہوا ہے کہ برطانوی سامراج کے سوا اور ملکوں سے ہمارے تعلقات اور میل جول میں کمی ہو رہی ہے۔ ہم پہلے سے بھی زیادہ برطانوی صنعت کے دست نگر ہو گئے ہیں اور ان نقصانات کے علاوہ جو ہم برداشت کر چکے آگے چل کر اس حکمت عملی کے خطرے بھی ظاہر ہیں۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ درجہ نو آبادی ہمارے بین الاقوامی تعلقات کو

بڑھانے کی جگہ ہمیں الٹا اوروں سے جدا کر دے گا۔

مگر ہمارے لبرل دوستوں میں یہ حیرت انگیز صفت ہے کہ وہ دنیا اور خصوصاً اپنے ملک کو برطانیہ کی خالص قومی رنگ کی عینکوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کانگریس کیا کہتی ہے اور کیوں کہتی ہے۔ بس انگریزوں کے اس پرانے اعتراض کو کہ آزادی درجہ نوآبادی کے مقابلے میں تنگ ہے اور روح کو اس سے اتنا فروغ نہیں ہو سکتا دہراتے رہتے ہیں۔ ان کی بین الاقوامی دنیا بس وائٹ ہال ہے، اس لئے کہ دوسرے ملکوں کے بارے میں کچھ تو زبان کی دشواری کے سبب سے مگر زیادہ تر اسی وجہ سے کہ وہ دوسرے ملکوں کو اطمینان کے ساتھ نظر انداز کر سکتے ہیں، انہیں مطلق کوئی علم نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے تو وہ ہر اس طرز عمل کے خلاف ہوتے ہیں جس میں حکومت کی براہ راست مخالفت ہو یا جس سے جنگجوئی ظاہر ہوتی ہو۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے بعض لیڈروں کا اس وقت کوئی اعتراض نہیں ہوتا جب کسی دوسرے ملک میں یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ وہ ایسی چیزوں کو دور سے سمجھ سکتے ہیں اور ان کی قدر بھی کر سکتے ہیں اور مغربی ملکوں کے کئی حاکم مطلق ہیں جنہیں ان سے ذہنی احترام اور عقیدت کا خراج ملتا رہتا ہے۔

ناموں سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ ہمارے مدنظر ایک نئی ریاست ہے یا صرف ایک بدلا ہوا انتظام حکومت۔ لبرل اس کا جو جواب دیتے ہیں وہ صاف ہے۔ انہیں ایک بدلے ہوئے انتظام حکومت سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیے اور وہ بھی ان کے نزدیک ایک ایسی منزل مقصود ہے جہاں تک ہم ایک لمبا سفر کر کے بتدریج ہی پہنچیں گے۔ وہ کبھی کبھی درجہ نو کا ذکر کرتے ہیں، لیکن فی الحال جو چیز دراصل ان کے مدنظر ہے وہ مرکز میں ذمہ داری کے پراسرار الفاظ سے ظاہر کی جاتی ہے ایسے جوشیلے لفظ جیسے کہ طاقت، خودمختاری، حریت، آزادی انہیں نہیں بھاتے۔ ان کی تو آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ

خطرناک ہیں۔قانون دانوں کی زبان اور بحث کا طریقہ انہیں بہت پسند ہے اگرچہ اس سے عوام کے دلوں میں گرمی پیدا نہیں ہوتی۔ تاریخ میں ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ افراد اور جماعتوں نے عقیدے اور آزادی کے لئے خطروں کا سامنا کیا اور جان کو بھی داؤ پر لگا دیا۔مگر اس میں شک ہے کہ مرکز میں ذمہ داریا ایسی کسی قانونی اصطلاح کی خاطر کوئی شخص کبھی بھی جان بوجھ کر ایک وقت کا کھان چھوڑ دے گا یا کسی کی گہری نیند ہلکی ہو جائے گی۔

تو یہ ہے ان کا مطمع نظر اور یہ مقصد حکومت کی کھلم کھلا مخالفت یا کسی طرح کی پیش قدمی کر کے حاصل نہ کیا جائے گا۔ بلکہ جیسا کہ سری نواس شاستری صاحب نے فرمایا ہے، دانشمندی، تجربہ کاری، میانہ روی، دوسرے کو قائل کرنے کی قوت، خاموش اثر اور سچی مستعدی کی خوبیوں کو نمایاں کر کے۔ امید اس کی کی جاتی ہے کہ ہمارا نیک چلن اور ہمارے اچھے کام آخر کار ہمارے حاکموں کو اس پر آمادہ کر لیں گے کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دے دیں۔یعنی دوسرے الفاظ میں ہمارے حاکم آج کل ہماری مخالفت یا تو اس سبب سے کرتے ہیں کہ ہمیں لڑائی پر تلے ہوئے دیکھ کر انہیں غصہ آتا ہے یا اس وجہ سے کہ انہیں ہماری استعداد پر شبہ ہے یا ممکن ہے یہ دونوں باتیں یکساں ان کے رویئے پر اثر ڈال رہی ہوں۔ملوکیت کی اور موجودہ حالات کی اس توضیح سے کسی قدر سادہ لوحی ظاہر ہوتی ہے۔پروفیر آر۔اج۔ٹونی نے جو ایک تیز نظر انگریز مصنف ہیں، اس خیال کے متعلق کہ اقتدار درجہ بدرجہ اور حاکم طبقوں کی مدد سے حاصل کیا جا سکتا ہے، ایک جگہ بڑی اچھی اور چبھتی ہوئی بحث کی ہے۔انہوں نے لکھا تو ہے برطانوی لیبر پارٹی کے متعلق، لیکن جو کچھ وہ کہتے ہیں ہندوستان پر اور بھی پورا اترتا ہے کیونکہ انگلستان میں کم از کم جمہوری ادارے تو ہیں جن کے ذریعہ سے اصولا اکثریت کا ارادہ ظاہر کیا جا سکتا ہے، پروفیسر ٹونی لکھتے ہیں۔

پیاز تو پرت پرت کر کے کھائی جا سکتی ہے۔ لیکن آپ چاہیں کہ
زندہ شیر کی کھال کھینچیں، پہلے ایک پنجہ کی اور پھر دوسرے کی تو یہ نہیں
ہو سکتا۔ چیر پھاڑ تو خود شیر کا پیشہ ہے، وہ پہلے کھال اتار لیتا ہے۔

دنیا میں شاید کوئی ایسا ملک ہو جہاں کے سربرآوردہ اور حاکم طبقہ کے لوگ سب بدھو ہیں۔ لیکن انگلستان تو ہرگز ایسے ملکوں میں نہیں۔ یہ خیال کہ لیبر پارٹی کے مطالبات پیش کرنے میں موقع شناسی اور دوستانہ انداز سے کام لیا جائے تو یہ لوگ اس دھوکے میں ڈالے جا سکتے ہیں کہ یہ ان کے اپنے مطالبات ہیں ایسا ہی فضول ہے جیسے یہ کوشش کہ ایک چلتے ہوئے وکیل سے ایسی جائداد دھوکہ دہی سے حاصل کر لی جائے جس کی دستاویز حقیقت اس کے قبضہ میں موجود ہے۔ ہمارے یہاں کے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں دولت اور اقتدار ہے خوش گوار اخلاق کے، ہوشیار، زوردار اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے والے لوگ ہیں اور جب یہ زچ ہوتے ہیں تو پھر تو کسی اخلاقی اصول کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ روٹی پر مکھن کس طرف لگا ہے۔ اور وہ اس پر بھی تلے ہوئے ہیں کہ مکھن کی فراہمی میں کمی نہ ہو۔ ۔۔۔ اگر انہوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں دیکھا تو وہ ہر سیاسی اور معاشی چال چلیں گے اور ہر ہتھیار سے کام لیں گے۔ ایوان امراء، بادشاہ، اخبار فوج میں بدامنی، مالی دشواریاں، بین الاقوامی پیچیدگیاں اور جیسا کہ وہ حملہ جو اخباروں نے ۱۹۳۱ء میں پاؤنڈ پر کیا تھا ظاہر کرتا ہے وہ دیس تیاگیوں کی اس چال تک سے نہ چوکیں گے جس سے اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کی خاطر ملک کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

برطانوی لیبر پارٹی کا ایک زبردست نظام ہے مزدوروں کے یونین، جس کے لاکھوں چندہ دینے والے اراکین ہیں اور جنہوں نے ایک نہایت مکمل امداد باہمی کا نظام مرتب کر لیا ہے۔ اس کی پشت پر ہیں اور اعلیٰ پیشوں کے بہت سے لوگ ان کے رکن اور ہمدرد ہیں۔ برطانیہ میں جمہوری مشاورتی ادارے ہیں جن کی بنیاد عام

حق رائے دہندگی پر ہے اور سیاسی آزادی کا رواج صدیوں سے قائم ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود مسٹر ٹونی کی رائے ہے اور حال کے واقعات نے ثابت بھی کر دیا ہے کہ ان کی رائے درست ہے کہ لیبر پارٹی خالی مسکرانے اور نرمی سے بات سمجھانے سے اصل اقتدار حاصل نہیں کر سکتی، اگرچہ یہ دونوں طریقے اپنی جگہ مفید اور پسندیدہ ہیں۔ مسٹر ٹونی کہتے ہیں کہ اگر ایوان عام میں لیبر پارٹی کی اکثریت ہوگئی تب بھی اسے بنیادی اصلاحیں عمل میں لانے کا ذرا بھی اختیار نہ ہوگا۔ کیونکہ سربرآوردہ اور مقتدر طبقے کے لوگ جوان کے مقابلے میں صف آراء ہیں، بہت سے سیاسی، معاشرتی، معاشی، مالی اور فوجی قلعوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ہندوستان کی حالت بالکل اور ہے۔ یہاں جمہوری ادارے ہیں نہ روایات بلکہ اس کے برخلاف آرڈیننس اور حکومت مطلق کا رواج پرانا اور مستند ہو گیا ہے۔ یہاں آئے دن شخصی اور تقریر تحریر، اجتماع اور پریس کی آزادی کا سر کچلا جایا کرتا ہے۔ لبرلوں کی پشت پر کوئی مضبوط نہیں ہے۔ اس لئے انہیں بس اپنے تبسم ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

لبرل ہر تحریک کی جو دستور یا قانون کے خلاف ہو سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ ایسے ملکوں میں جہاں کا دستور جمہوری ہو، دستور کے معنی بہت وسیع ہوتے ہیں۔ وہ قانون سازی پر حاوی ہوتا ہے، آزادی کا تحفظ کرتا ہے، عاملہ کی روک تھام کرتا ہے اور سیاسی اور معاشی نظام میں تبدیلیاں کرنے کے جمہوری طریقے معین کر دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسا کوئی دستور نہیں اور یہاں یہ اصطلاح ایسے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ (۲) اسے استعمال کر کے ہم صرف ایک تصور کو اپنی سیاسی بحث میں داخل کرتے ہیں جس کے لئے ہماری موجودہ زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ لفظ اکثر عاملہ کی کم وبیش بے ضابطہ کاروائیوں کی تائید کے لئے کام میں لایا جاتا ہے، یا اس سے مراد فقط ''قانونی'' ہوتا ہے۔ ہمارے لئے بہت بہتر ہے اگر ہم

قانون اور خلاف قانون پر اکتفا کریں، اگرچہ یہ اصطلاحیں بھی مبہم ہیں اور ان کے معنی آج کچھ ہوتے ہیں تو کل کچھ اور۔

ایک نیا قانون یا نیا آرڈیننس نئے جرم قائم کردیتا ہے۔ کسی پبلک جلسہ میں شریک ہونا جرم ٹھہرایا جاسکتا ہے، یا بائیسکل پر چڑھنا، یا کوئی خاص کپڑے پہننا مغرب سے پہلے گھر کے اندر نہ پہنچ جانا، یا تھانہ میں روز حاضری نہ دینا، ہندوستان کے بعض حصے ہیں جہاں آج کل یہ سب باتیں قانون کی خلاف ورزی ہیں یہ ممکن ہے کہ ملک کے ایک حصے میں کوئی بات جرم مانی جائے اور دوسرے نہ مانی جائے۔ جب کوئی غیر ذمہ دار عاملہ مختصر سے مختصر اطلاع کے بعد ایسے قانون جاری کرسکتی ہے تو قانون سے مراد اس عاملہ کے ارادے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ معمولاً ایسے قانون کی خوشی سے یا منھ پھلا کر تعمیل کی جاتی ہے، اس لئے کہ نافرمانی کے نتیجے ناگوار ہوتے ہیں لیکن کوئی کہے کہ وہ ہمیشہ قانون کی فرماں برداری کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مطلق حکومت یا غیر ذمہ دار قوت کے سامنے زمین پر سر رکھ دیتا ہے، اپنے ضمیر کو اس کے حوالے کردیتا ہے اور جہاں تک اس کے اپنے عمل کا تعلق ہے آزادی حاصل کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

آج کل ان ملکوں میں جہاں کی حکومت جمہوری اس پر بحث ہورہی ہے کہ معاشی نظام میں ان ذریعوں کی بدولت جو دستور نے مہیا کئے ہیں بنیادی تبدیلیاں معمولی کاروائی کے طور پر عمل میں لائی جاسکتی ہیں یا نہیں۔ بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ ایسا نہیں کیا جاسکتا اور کوئی غیر معمولی انقلابی تدبیر اختیار کرنا ہوگی۔ ہمارے لئے تو یہ دیکھنا بیکار ہے کہ اس بحث سے کیا نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ ہم جو تبدیلیاں چاہتے ہیں انہیں عمل میں لانے کے لئے دستور نے کوئی ذریعے مقرر ہی نہیں کیے ہیں۔ اگر وائٹ پیپر والی یا ایسی ہی کسی اور تجویز نے قانون کی شکل پائی تو ہماری دستوری نشوونما کی طرف بالکل بند ہوجائے گی اور انقلاب یا غیر قانونی کاروائی کے سوا اس قید سے

آزاد ہونے کا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ کیا اصطلاح کا خیال چھوڑ کر قسمت پر شاکر ہو بیٹھیں؟

آج کل جو صورت ہے وہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ عاملہ کو اس کا اختیار ہے اور یہ اختیار کام میں بھی لایا جاتا ہے کہ ہر قسم کے پبلک کام کو بالکل بند کر دے یا اس میں رکاوٹیں پیدا کر دے۔ ہر کام جو اس کی رائے میں اس کے لئے خطرناک ہے ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے اور اس طرح جیسے کہ پچھلے تین سال میں ہوتا رہا ہے، قوم کی ہر نتیجہ خیز جدوجہد بند کی جاسکتی ہے۔ اس صورت کو گوارا کرنے کے معنی ہیں کہ ہر قومی کام چھوڑ دیا جائے اور اس کا مان لینا تو ایک ناممکن سی بات کو مان لینا ہے۔

اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کرسکتا کہ وہ ہمیشہ اور بلا استثنا قانون کے مطابق عمل کرے گا۔ جمہوری ریاستوں میں بھی ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جب انسان کا ضمیر اسے قانون کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہے۔ جس ملک کی حکومت استبدادی یا غیر ذمہ دارانہ ہو ایسے موقعے بہت کثرت سے آتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی ریاست میں قانون اخلاقاً حق بجانب رہتا ہی نہیں۔

لبرل کہتے ہیں کہ براہ راست سیاسی عمل حکومت مطلق سے ملتی جلتی چیز ہے، جمہوریت سے نہیں اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت کو فتح ہو انہیں براہ راست سیاسی عمل کا یہ اصول چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ بات الجھے ہوئے خیالات اور مبہم عبارت کا ایک نمونہ ہے۔ کبھی کبھی یہ براہ راست سیاسی عمل مثلاً مزدوروں کی ہڑتال، قانونی بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن یہاں غالباً صرف سیاسی کاروائیوں سے بحث ہے۔ جرمنی میں آج کل کس طرح کا عمل ممکن ہے؟ ہٹلر کی ذلت آمیز فرماں برداری یا کوئی انقلابی یا خلاف قانون کاروائی۔ جمہوریت کی وہاں اور کس طرح خدمت کی جاسکتی ہے؟

ہندوستانی لبرل اکثر جمہوریت کا ذکر کرتے ہیں، مگر ان میں بہت سے اس

کے قریب بھی جانا نہیں چاہتے۔سر سی۔پی شوسوامی آئیر نے جو ہندوستان کے سب سے ممتاز لیڈروں میں سے ہیں، مئی ۱۹۳۴ء میں کہا تھا کہ کانگریس کا یہ مطالبہ کہ ایک دستور ساز مجلس طلب کی جائے عوام کی سوجھ بوجھ پر بہت زیادہ بھروسا کرنا ہے۔اور ان لوگوں کے خلوص اور قابلیت کے ساتھ ظلم ہے جنہوں نے مختلف گول میز کانفرنسوں میں حصہ لیا ہے۔مجھے اس میں بہت شک ہے کہ دستور ساز مجلس اس سے کچھ بہتر کر دکھائی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہوریت کا جو تصور سر شوامی آئیر کے ذہن میں ہے وہ عوام سے ایک جدا چیز ہے اور ایسے مخلص اور قابل لوگوں کا اجتماع جنہیں برطانوی حکومت نے نامزد کیا ہو اس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔اس کے علاوہ جناب موصوف وائٹ پیپر کی تجویزوں کو دعائیں دیتے ہیں، اس لئے کہ گو وہ ان سے پورے طور پر مطمئن نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کا ساری کی ساری تجویزیں رد کر دینا عقلمندی کی بات نہیں، ہمیں اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حکومت برطانیہ اور سر شوسوامی آئیر کے درمیان پورا اتحاد عمل نہ ہو۔

کانگریس نے جب سول نافرمانی بند کر دی تو لبرل ظاہر ہے بہت خوش ہوئے اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس حماقت آمیز اور خلاف مصلحت تحریک سے الگ اور دور رہونے پر انہوں نے اپنی عقلمندی کی داد بھی لینا چاہی، دیکھو ہم نے کہا تھا نا؟ وہ اکثر ہم سے کہا کرتے تھے یہ دلیل بھی نرالی ہے۔چونکہ ہم لڑنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور لڑے بھی خوب تھے، ہم گرا دیئے گئے اس لئے ہم کو یہ نصیحت کی گئی کہ کھڑا ہونا برا ہے۔سب سے اچھی اور محفوظ چال پیٹ کے بل گھسٹنا ہے۔آدمی اس طرح پڑا ہو تو نہ گرایا جا سکتا ہے نہ گر سکتا ہے۔

---

(۱) بورژوا (Bourgeois) کے اصل معنی ہیں متوسط طبقہ کے لوگ، لیکن اشتراکی ادب میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چاہے خود بڑے سرمایہ دار نہ ہوں مگر سرمایہ داری کے معاشرتی نظام اور تہذیب کو قائم رکھنا چاہتے ہوں۔اور اسی طرح وہ ہر

اس شخص کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جو اشتراکی نہ ہو۔

(۲) مسٹر سی وائی چنتامنی نے جو ایک ممتاز لبرل لیڈر اور اخبار ''لیڈر'' کے صدر مدیر ہیں۔ یو پی کونسل میں پارلیمنٹری جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان میں کسی قسم کی دستوری حکومت نہیں: ''بہتر یہ ہے کہ ہم موجودہ غیر دستوری حکومت کے ماتحت رہیں۔ بہ نسبت اس آئندہ کی حکومت کے جو اور بھی رجعت پسند اور بہت زیادہ غیر دستوری ہو گی۔''

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

پرانا اور نیا ہندوستان

یہ ایک قدرتی اور لازمی بات تھی کہ قوم پرست ہندوستانیوں کو غیروں کی حکومت پر غصہ آئے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے آخر تک بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانی شعوری یا غیر شعوری طور پر سلطنت کے برطانوی تصورات تسلیم کرتے رہے۔ وہ اپنی دلیلیں انہیں تصورات پر قائم کرتے تھے اور انھیں صرف ان کے چند خارجی نتائج پر اعتراض کرنے کی ہمت ہوتی تھی۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ اور اور معاشیات کی جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا نقطہ نظر بالکل برطانوی ملوکیت کا تھا۔ اس میں ہماری پچھلی اور موجودہ خامیاں جتائی جاتی تھیں اور انگریزوں کے اوصاف اور ان کی بلند اقبالی۔ ہم حالات کی اس بگڑی تصویر کو کسی حد تک صحیح مانتے تھے اور جہاں طبعیت اسے قبول نہ کرتی وہاں بھی ہم پر اس کا اثر ضرور پڑتا۔ پہلے تو ذہن کو اس سے محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کیونکہ ہم اور واقعات یا دلیلوں سے واقف ہی نہ تھے اس لئے ہم نے مذہبی قومیت کے دامن میں پناہ لی۔ اس خیال سے کہ کم سے کم مذہب اور فلسفہ کے میدان ہم کسی قوم سے بیٹے نہیں۔ مصیبت اور ذلت میں ہم اپنے آپ کو یقین دلاتے رہے کہ اگر چہ ہم میں مغرب کی سی ظاہری شان اور چمک دمک نہیں ہے پھر بھی ہم اس باطنی دولت کے مالک ہیں جو اصل چیز ہے جس کی قدرو قیمت بہت زیادہ ہے اور جس کا حاصل کرنا بہت بہتر ہے۔ ایک طرف سوامی وویکانند اور ان جیسے اور لوگوں نے۔ دوسری طرف اس دلچسپی نے جو مغربی عالم ہمارے قدیم فلسفوں سے رکھتے تھے ہمیں کسی قدر خوددار بنایا اور گذشتہ زمانے پر فخر کرنے کے جذبے کو بیدار کیا۔

آہستہ آہستہ ہم ان باتوں پر جو انگریز ہمارے ماضی اور موجودہ حالات کے متعلق کہتے تھے شبہ کرنے لگے۔ ہم نے ان کی تنقید شروع کردی لیکن اب ہمارا خیال اور عمل انگریزوں کے قائم کئے ہوئے تصورات کے دائرے میں محدود رہا۔

کوئی بری بات ہوتی تو ہم کہتے کہ یہ انگریزوں کی فطرت کے خلاف ہے۔ ہندوستان میں کوئی انگریز بدتمیزی کرتا تو یہ قصور برطانوی نظام کا نہ ٹھہرایا جاتا بلکہ اس شخص کا لیکن برطانوی حکومت پر تنقیدوں کا مواد جمع ہونا لکھنے والوں کی اعتدال پسندی کے باوجود ایک انقلاب کا کام کر گیا اور اس نے ہماری قومیت کی سیاسی اور اقتصادی بنیاد ڈال دی۔ دادا بھائی نوروجی کی تصنیف ہندوستان کا افلاس اور برطانوی فطرت کے خلاف حکومت اور رمیش دت ولیم ڈگبی وغیرہ کی کتابوں نے قومیت کی نشوونما میں ایک انقلابی عنصر پیدا کر دیا۔ قدیم تاریخ ہند کی تحقیق کی گئی تو ایسے درخشاں ادوار کا انکشاف ہوا جن میں تہذیب و تمدن عروج کو پہنچ گیا تھا اور ان کا حال پڑھ کر ہمیں بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے کارنامے اس سے بہت مختلف تھے جو ہم ان کی تاریخ کی کتابیں پڑھ کر سمجھا کرتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ، معاشیات اور نظام حکومت کے متعلق انگریزوں کے جو بیانات تھے ان کی ہم تردید کرتے رہے، لیکن اسی حلقہ کے اندر جوان کے تصورات نے کھینچ دیا تھا۔ جب نئی صدی شروع ہوئی تو مجموعی حیثیت سے ہندوستانی قومیت کا یہ رنگ تھا۔ اب بھی لبرل جماعت، چند اور چھوٹی پارٹیوں اور اعتدال پسند کانگریسیوں کی ایک تعداد کا یہی حال ہے۔ ان کے جذبات وقتاً فوقتاً انھیں آگے بڑھاتے ہیں مگر خیالات کے اعتبار سے ان کی زندگی انیسویں صدی میں بسر ہو رہی ہے۔ اسی کے سبب سے ہندوستان کی آزادی کا تصور کسی لبرل کے دماغ میں سما ہی نہیں سکتا کیونکہ اس تصور اور انیسویں صدی کے طرز خیال میں بنیادی اختلاف ہے اور ان دونوں میں مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ لبرل یہ سوچتا ہے کہ وہ قدم بہ قدم اونچے عہدوں پر پہنچتا جائے گا۔ اس کے سامنے جو مسلیں پیش ہوں گی وہ زیادہ موٹی اور اہم ہوتی جائیں گی۔ حکومت کا دربار اسی طرح جما رہے گا بس اتنا

فرق ہو جائے گا کہ صدر میں وہ خود رونق افروز ہو گا اور ایک گوشہ میں برطانوی فوج ادب سے کھڑی رہے گی کہ ضرورت کے وقت اس کی حفاظت کرے۔ لبرل کے نزدیک برطانوی سامراج کے اندر درجہ نوآبادی حاصل کرنے سے مراد یہ صورت حال ہے۔ یہ سادہ لوحی کا ایک خواب ہے جسے حقیقت کا روپ کبھی نصیب نہ ہو گا کیونکہ انگریز حفاظت اسی وقت تک کریں گے جب تک ہندوستان غلام رہ کر حفاظت کی قیمت ادا کرے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ بات ہمارے عظیم الشان **ملک** کے لئے باعث ننگ ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا سر فرڈرک وائٹ جو ہرگز ہندوستانی قومیت کے حامی نہیں ہیں اپنی ایک تازہ تصنیف میں اس کے آڑے آئے گا اور جب تک وہ اس خیال خام میں مبتلا ہے وہ اس سوراج کی جو کہ اس کا نصب العین ہے بنیاد نہیں رکھ سکتا۔ یہاں پر بظاہر مصنف کا اشارہ لبرل یا رجعت پسند اور فرقہ پرست ہندوستانیوں کی طرف ہے۔ کیونکہ جب وہ قانون دان اسمبلی کے صدر تھے تو انہیں لوگوں سے ان کا زیادہ سابقہ رہا ہو گا۔ کانگریس کا یہ عقیدہ نہیں ہے اور جو دوسری ترقی پسند جماعتیں ہیں ان کا تو ذکر ہی نہیں مگر سر فرڈرک کے اس خیال سے انہیں اتفاق ہے کہ جب تک ہندوستانیوں کا یہ خیال خام مٹ جائے اور ہندوستان مفروضہ مصیبت کا سامنا کرنے کو اکیلا نہ چھوڑ دیا جائے تب تک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ برطانیہ کے فوجی تسلط کا بالکل دور ہو جانا ہندوستانی آزادی کا پہلا قدم ہو گا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انیسویں صدی میں تعلیم یافتہ ہندوستانی برطانوی تصورات کے قائل تھے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے جوش دلانے والے واقعات اور تغیرات کے بعد بھی بعض لوگ اس دام فریب میں گرفتار ہیں۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کے حکمران طبقے اپنی دولت، کامیابی اور اقتدار کی روایات کی بنا پر دنیا میں امرا کی شان رکھتے تھے۔ ان روایات کے سائے میں تربیت پانے سے ان میں امارت کے کچھ اوصاف اور کچھ خامیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم

ہندوستانی اس بات سے تسلی حاصل کر سکتے ہیں کہ پچھلے پونے دو سال میں ہم نے انہیں اس اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے وسائل اور مواقع بہم پہنچائے جیسا کہ پہلے بھی بہت سی نسلیں اور قومیں کر چکی ہیں۔ انگریز اپنے آپ کو خدا کے برگزیدہ بندے اور سلطنت کو خدا کی حکومت سمجھنے لگے۔ جب تک ان کا یہ مرتبہ تسلیم کیا گیا اور ان کے دعوے فضیلت کی تردید نہیں ہوئی وہ لطف و کرم سے کام لیتے رہے مگر وہیں تک جہاں تک ان کا کوئی نقصان نہ تھا لیکن ان کی مخالفت حکومت الہٰی کی مخالفت تھی اور یہ صریحی کفر تھا جس کا توڑنا لازم ہو گیا۔

موسیو آندرے ژید نے انگریزی سیرت کے اس پہلو پر بہت دلچسپ طریقے سے لکھا ہے (۲)

اقتدار اور دولت کی موروثی روایات نے رفتہ رفتہ ان میں ایک امارت کی شان پیدا کر دی اور وہ اس کے مدعی بن گئے کہ ان کی قوم کو حکومت خداداد حق حاصل ہے۔ ان کا یہ زعم اس حالت میں بڑھتا ہی گیا، جب لوگ ان کے دعوے فضیلت کی تردید کرنے لگے یہاں تک کہ پچھلی صدی کے آخری حصہ کے نوجوان۔۔۔۔ غیر شعوری طور پر سمجھنے لگے کہ ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہم واقعی اس کے مستحق ہیں۔

اس طرز خیال پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں، کیونکہ اس سے انگریزوں کی نفسیات کے ایک باریک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تو سبھی نے محسوس کیا ہوگا کہ انگلستان سمجھتا ہے کہ اس کی مشکلات کا سرچشمہ خارجی اسباب میں ہے۔ وہ ہر معاملہ میں یہی کہتا ہے کہ فلاں کی غلطی ہے اور اگر یہ فلاں اپنی اصلاح کرنے پر راضی ہو جائے تو انگلستان پھر خوش حال ہو جائے گا۔۔۔۔ ہر موقع پر انگریزوں کی اس جبلت کا اظہار ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کے بجائے کسی دوسرے کی اصلاح کریں!۔

اگر اور ملکوں کے ساتھ انگریزوں کا یہ عام رویہ تھا تو ہندوستان میں یہ اور بھی زیادہ نمایاں رہا۔ ہندوستان کے مسئلے پر جس انداز سے انگریز غور کرتے ہیں وہ ہمارے لئے کتنا ہی تکلیف دہ ہو مگر دلکشی سے خالی نہیں، ان کا راسخ عقیدہ ہے کہ وہ ہر حال میں حق پر ہیں۔ اور ایک عظیم الشان فرض سے بہ خوبی عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ ان کی قوم خدا کی برگزیدہ قوم اور ان کی سلطنت دنیا کی بہترین سلطنت ہے۔ ان گنہگاروں کا جو اس سچے عقیدے کے منکر ہیں وہ غصہ اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس طرز خیال میں ایک مذہبی رنگ کی جھلک ہے۔ کلیسا کے قدیم محکمہ احتساب کی طرح وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں وہ ہمیں نجات ضرور دلا کر رہیں گے۔ اس روحانی کاروبار سے انہوں نے ضمناً دنیاوی منافع بھی حاصل کیا اور اس طرح ایک پرانی مثل کہ ایمانداری سب سے زیادہ نفع کی چیز ہے۔ صحیح ثابت ہوگئی۔ ہندوستان کی ترقی کے معنی یہ قرار پائے کہ وہ برطانوی سلطنت میں کھپ جائے اور منتخب ہندوستانی ولایتی سانچے میں ڈھل جائیں۔ برطانوی نصب العین اور مقاصد کو ہم جتنا زیادہ اختیار کرتے اتنی ہی زیادہ ہم میں اپنے آپ پر حکومت کرنے کی صلاحیت تسلیم کی جاتی۔ جس وقت ہم یہ دکھا دیتے اور اس کا یقین دلا دیتے کہ ہم اپنی آزادی برطانیہ کی خواہشوں کے مطابق استعمال کریں گے اسی وقت آزاد کر دیئے جاتے۔

برطانوی حکومت کے کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی رائے میں ضرور اختلاف ہوگا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ مگر جب بڑے پائے کے انگریز عہدہ دار، یہاں تک کہ بعض وزیر ہندوستان کے گزشتہ اور موجودہ حالات کی خیالی تصویریں کھینچتے ہیں اور بے بنیاد باتیں کہتے ہیں تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ چند ماہروں اور دوسرے لوگوں کے سوا ہندوستان کے متعلق عام انگریزوں کی لاعلمی نہایت حیرت انگیز ہے۔ جب وہ ٹھوس واقعات کو

نہیں دیکھ سکتے تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کی روح تک ان کی پہنچ کیونکر ہوسکتی ہے۔ انھوں نے اس کے جسم پر قبضہ کرلیا، لیکن یہ قبضہ جبر و تشدد کا تھا۔ وہ اس کی سیرت کو نہیں سمجھ سکے اور نہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کبھی اسے آنکھ ملا کر نہیں دیکھا کیونکہ ان کی نظریں پھری ہوئی تھیں اور اس کی نظریں شرم اور ذلت سے نیچی تھیں۔ صدیوں کے سابقہ کے بعد باہمی اجنبیت دور نہیں ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے بیزار رہیں۔

اس افلاس اور ذلت کے باوجود ہندوستان شرافت اور عظمت سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ وہ قدیم روایات اور موجودہ مصیبتوں کے بوجھ سے دبا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کا خمار تھا مگر اسی کے ساتھ اس میں ایک حسن تھا جو روحانی کیفیت نے اس کے خط و خال میں پیدا کردیا تھا، اس کے عجیب و غریب تصورات، نادر تخیلات اور پاکیزہ جذبات کے نقش ایک ایک کرکے اس کے چہرے پر ابھر آئے تھے۔ اس کے شکستہ جسم سے روحانی عظمت و وقار کی جھلک اب تک نظر آتی ہے۔ اس نے تاریخ کی طویل منزلیں طے کی ہیں اور اس سفر میں علم و حکمت کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اسے بہت سے اجنبیوں سے سابقہ پڑا۔ اس نے انھیں اپنے وسیع خاندان میں شامل کرلیا۔ اس نے بڑے نشیب و فراز اٹھائے سخت ذلتیں اور مصیبتیں جھلیں اور عجیب عجیب تماشے دیکھے، لیکن اس لمبے سفر میں اول سے آخر تک اس نے اپنی پراچین تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس سے تقویت اور زندگی حاصل کی اور دوسرے ملکوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا۔ جھولے کی طرح وہ کبھی اوپر گیا کبھی نیچے آیا، اٹھا تو اپنے تخیل کی پرواز سے آسمانوں کی خبر لایا، گرا تو پستی کے گڑھے میں پاتال تک پہنچا۔ باوجود باطل اوہام اور لغو رسوم کے بوجھ کے جس نے اس کی کمر توڑ دی تھی، وہ اس روح افزا تعلیم کو بالکل بھولا نہیں تھا جو ابتدا میں اس کے دانا ترین روشن ضمیر حکیموں نے اپنشد کے ذریعہ دی تھی۔ ان کے تیز ذہن جو تلاش حق کی خلش

سے بے چین، ہمیشہ سعی و جستجو میں لگے رہتے تھے، انھوں نے اندھے عقائد کے دامن میں پناہ نہیں لی، بے جان رسوم اور معمولات پر تکیہ نہیں کیا، وہ اس لوک میں اپنی ذات کو تکلیف اور مصیبت سے بچانا اور پرلوک میں بیکنٹھ میں ٹھکانا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ بصیرت اور معرفت کے طلبگار تھے، مجھے مجاز سے حقیقت تک پہنچا دے اندھیرے سے روشنی تک، موت سے حیات دوام تک، (۳) یہ گاتیری منتر یہ علم اور بصیرت کی دعا، ان دعاوں میں جو آج کل بھی لاکھوں آدمی روزانہ پڑھتے ہیں سب سے زیادہ مشہور ہے۔

اگر چہ سیاسی اعتبار سے ہندوستانی روح اکثر منتشر رہی لیکن اس نے اپنے مشترک روحانی سرمائے کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور اس کثرت میں وحدت کا رنگ جھلکتا رہا (۴) تمام قدیم ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اچھائی یا برائی کا معجون مرکب تھا لیکن اس کی اچھائیاں چھپی ہوئی تھیں اور انہیں تلاش کرنے کی ضرورت تھی اور تنزل کے آثار کھلے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی تیز، بے رحم دھوپ انہیں اور چمکاتی تھی۔

ہندوستان اور اطالیہ کی حالت کچھ ملتی جلتی ہے۔ دونوں پرانے ملک ہیں اور ان کی تمدنی روایات کا سلسلہ بہت دور تک پہنچتا ہے، البتہ اطالیہ ہندوستان کے مقابلہ میں کم عمر ہے اور وسعت میں اس سے بھی بہت کم ہے۔ دونوں میں سیاسی انتشار رہا مگر متحدہ ہند اور متحدہ اطالیہ کا تصور کبھی فنا نہیں ہوا، اور گونا گوں اختلاف کے باوجود اتحاد کا رنگ غالب رہا۔ اطالیہ کا اتحاد بڑی حد تک رومی اتحاد تھا، کیونکہ یہ عظیم الشان شہر ملک پر حاوی رہا تھا اور یہی اتحاد کا مرکز اور نشان تھا۔ ہندوستان میں کوئی ایسا مرکز کوئی ایسا شہر نہیں تھا جو تمام ملک پر حاوی ہو۔ بنارس مشرق کا شہر لازوال (۵) کہا جاسکتا ہے، نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام مشرقی ایشیا کا۔ لیکن بنارس نے کبھی سلطنت کا کھیل نہیں کھیلا، نہ کبھی دنیاوی اقتدار کی فکر میں سر کھپایا۔

ہندوستانی تہذیب سارے ملک میں اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ ملک کا کوئی حصہ اس کا مرکز نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ جنوب میں راس کماری سے، شمال میں بدری ناتھ اور امر ناتھ تک، مشرق میں دوارکا سے مغرب میں پوری تک ایک ہی قسم کے خیالات جاری اور ساری تھے اور اگر کسی جگہ پر خیالات کا تصادم ہوتا تو اس کی دھمک سارے ملک میں دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔ جیسے اطالیہ نے مغربی یورپ کو مذہب اور تہذیب عطا کی اسی طرح ہندوستان نے مشرقی ایشیا کو یہ دولت بخشی، اگرچہ چین قدامت اور عظمت میں اس سے کم نہ تھا۔ اس زمانہ میں بھی جب کہ سیاسی اعتبار سے اطالیہ نحیف و نزار تھا، یورپ کی رگوں میں اسی کا خون دوڑ رہا تھا۔

اطالیہ کے متعلق شاید مترنش (۲) نے کہا تھا کہ وہ ایک جغرافیائی اصطلاح ہے۔ بہت سے لوگ جو مترنش بننا چاہتے ہیں ہندوستان کی نسبت بھی یہی فقرہ کہتے ہیں اور اتفاق سے دونوں براعظموں میں ان ملکوں کا محل وقوع بھی ایک ہی سا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ انگلستان اور آسٹریا کی مشابہت ہے اور بیسویں صدی کے انگلستان کا انیسویں صدی کے آسٹریا سے مقابلہ کیا بھی گیا ہے۔ انگلستان بھی اس کی طرح متکبر اور مغرور اور بظاہر شاندار اور رعب دار ہے مگر وہ جڑیں جن سے اسے قوت حاصل ہوتی تھی اب سوکھ رہی ہیں اور اس عالیشان عمارت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان ملکوں کو بھی اپنی طرح مجسم تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ عادات اور قدیم اختلافات کا اثر ہے۔ چنانچہ ہندوستان بھارت ماتا در ہند ایک خوبصورت خاتون کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جو بہت بوڑھی ہیں مگر دیکھنے میں سدا جوان معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں غم سے بھری اور دل حسرت و یاس سے معمور ہے۔ بدیسیوں کے ظلم سے نالاں ہیں اور اپنے بچوں کو مدد کے لئے پکارتی ہیں۔ یہی تصور ہے جو لاکھوں آدمیوں کے جذبات کو ابھارتا ہے اور انہیں علم اور ایثار

پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں زیادہ تر کسان اور مزدور بستے ہیں اور وہ دیکھنے میں حسین نہیں ہیں کیونکہ افلاس میں کوئی حسن نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے تخیل کی خوبصورت خاتون کھیتوں اور کارخانوں کے ننگے اور کمر جھکے مزدوروں کی نمائندگی کرتی ہیں، یا ان لوگوں کی چھوٹی سی جماعت کی جو صدیوں سے غریبوں کو پیروں تلے روندتی اور ان کا خون چوستی رہی ہے۔ جس نے انہیں ظالمانہ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور ان میں سے بہتوں کو اچھوت تک بنا دیا ہے۔ ہم حقیقت میں تخیلات کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ واقعات کی دنیا سے بھاگ کر خواب وخیال کی دنیا میں پناہ لیں۔

لیکن ان مختلف طبقوں اور ان کی باہمی کشش کے باوجود ایک رشتہ تھا جو ان سب کو مربوط کئے ہوئے تھا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رشتہ کتنا مضبوط اور پائدار تھا۔ اس کی مضبوطی کا راز کیا تھا؟ یہ محض روایات اور جمود کی انفعالی قوت نہیں تھی، اگرچہ یہ قوت بہت بڑی ہوتی ہے اس میں کوئی جاندار اور جاں بخش جوہر کام کر رہا تھا کیونکہ اس نے قومی خارجی اثرات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ اور ان داخلی اثرات کو جو اس میں انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے جذب کر لیا لیکن اپنی اس قوت کے باوجود سیاسی آزادی کو محفوظ نہ رکھ سکا اور سیاسی اتحاد پیدا نہ کر سکا۔ ان چیزوں کو اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا کہ ان کے لئے زحمت نہ اٹھائی جائے۔ اگلوں نے حماقت سے ان کی اہمیت کو نظر انداز کیا اور ہم اس غفلت کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ اپنی تاریخ میں ہم شروع سے آخر تک دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم نصب العین میں سیاسی اور فوجی کامیابی کو کبھی وقعت نہیں دی گئی۔ اور دولت پیدا کرنے والے طبقے ہمیشہ حقیر سمجھے گئے۔ عزت اور دولت کا ساتھ نبھ نہیں سکتا تھا اور عزت کم سے کم نظری طور پر ان لوگوں کا حصہ سمجھی جاتی تھی جو ادنے معاوضے پر سماج کی خدمت کریں۔

پرانی تہذیب بہت سے سخت طوفانوں سے سلامت گزر گئی لیکن اگرچہ اس کی

ظاہری صورت قائم رہی اس میں باطنی حقیقت باقی نہیں رہی۔ آج کل وہ خاموشی کے ساتھ مگر جی توڑ کر ایک نئے اور نہایت طاقتور حریف سے مقابلہ کر رہی ہے۔ یعنی مغربی سرمایہ داری کی بینوں والی تہذیب سے۔ اس نئے حریف سے وہ شکست کھا جائے گی، کیونکہ مغرب اپنے ساتھ سائنس لایا ہے اور سائنس سے لاکھوں فاقہ کشوں کو روٹی ملنے کی امید ہے لیکن قاتلانہ تہذیب کے زہر کا تریاق بھی مغرب اپنے ساتھ لایا ہے اور وہ اشتراکیت ہے، یعنی اتحاد عمل اور عام مفاد کی خاطر جماعت کی خدمت کرنے کا اصول۔ برہمنوں کا جو پرانا خدمت کا نصب العین تھا، اس سے یہ کچھ زیادہ مختلف نہیں، لیکن اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر طبقہ اور جماعت کو برہمن کا رتبہ دیا جائے (ظاہر ہے کہ یہاں برہمن کے مذہبی معنی مراد نہیں) اور طبقوں کی تفریق اور امتیازات مٹا دیئے جائیں۔ ممکن ہے ہندوستان جب اپنا نیا لباس پہنے اور وہ تو پہننا ہی ہے اس لئے کہ پرانا پھٹ کر چیتھڑے چیتھڑے ہو گیا ہے، تو اس کی تراش ایسی ہو کہ موجودہ حالات اور پرانی وضع دونوں کے ساتھ نبھ سکے، جو رنگ وہ اختیار کرے وہ ایسا ہونا چاہیے کہ قدیم رنگ میں کھپ جائے۔

The Future of East and West (۱)

Lirise britannique Auxxe Sicele. (۲)

۳۔ برہدآرنیک اپنشد، ۳۰۱، ۲۷

۴۔ ''ہندوستان میں جو تضاد پائے جاتے ہیں ان میں سب سے بڑا یہ ہے کہ اس کے اختلاف کی تہ میں ایک قومی اتحاد موجود ہے یہ جلد محسوس نہیں ہوتا، اس لیے کہ تاریخ کا کوئی ایسا دور نہیں ہوا، جب اس اتحاد نے ملک میں سیاسی ربط پیدا کر کے اسے ایک واحد ہستی بنا دیا ہو۔ لیکن یہ اتنی بڑی حقیقت ہے اور اتنی بڑی قوت رکھتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس دائرے میں آ کر وہ اس سے بہت کچھ متاثر ہوئے۔'' سرفرڈرک وائٹ: مشرق اور مغرب کا مستقبل'' (انگریزی)

۵۔ رومی سلطنت کے زمانہ میں روم ''شہر لازوال'' کہلاتا تھا۔

۶۔ آسٹریا کا مشہور مدبر، جو ۱۸۱۵ سے ۱۸۴۸ تک یورپ کی سیاسی زندگی پر حاوی رہا۔

انگریز حکومت کی کارگذاری

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگذاری کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی انگریز یا ہندوستانی اس لمبی کارگذاری کو ایک خارجی چیز ٹھہرا کر اس پر ٹھنڈے دل سے نظر ڈال سکے گا اور اگر یہ ممکن بھی ہو تو نفسیاتی اور دوسرے غیر مادی عناصر کا تولنا اور ان کا اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہوگا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو وہ دیا ہے جو پورے گذشتہ زمانہ میں کبھی اسے حاصل نہ تھا، یعنی ایک حکومت جس کا حکم اس ملک میں جو ایک براعظم سے کم نہیں ہر جگہ بے چون و چرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ (۱) اس نے قانون کی عملداری قائم کی ہے اور ایک نظام حکومت جو عدل پر مبنی اور کارپرداز ہے، اس نے ہندوستان میں نیابتی حکومت اور شخصی آزادی کے تصورات رائج کئے اور پیدا کیا اور اس طرح قومیت کی اس ابتدائی مدارج میں پرورش کی۔ یہ دعوے انگریزوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں اور بہت صحیح بھی ہیں، اگرچہ قانون کی عملداری اور شخصی آزادیاں اب کئی برس دیکھنے میں نہیں آئی ہیں۔

ہندوستانی اس دور پر نظر ڈالتے ہوئے اور بہت سے پہلوؤں پر زور دیتے ہیں اور یہ جتاتے ہیں کہ غیروں کی حکومت نے ہم کو کیا کیا مادی اور روحانی نقصان پہنچایا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اس قدر مختلف ہے کہ وہ چیز جسے انگریز تعریف کے لائق سمجھتے ہیں اس کی ہندوستانی مذمت کرتے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر آنند کمار سوامی نے لکھا ہے:

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سب سے عجیب خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستانی قوم پر جو سب سے بڑی زیادتیاں کیں وہی بظاہر نعمتیں معلوم ہوتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ پچھلی صدی یا اس سے کچھ زیادہ میں ہندوستان کے اندر جو تبدیلیاں ہوئیں وہ عالمگیر تھیں اور مشرق اور مغرب کے ملکوں میں یکساں ہوئی ہیں۔

مغربی یورپ میں اور اس کے بعد باقی دنیا میں صنعتی ترقی نے ہر جگہ اپنے ساتھ ساتھ قومیت کا احساس اور ایک مضبوط مفرد ریاست پیدا کی۔ انگریز اس کی داد تو لے سکتے ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے مغرب کے لئے ہندوستان کا دروازہ کھولا اور ایک نوعیت کی صں عت اور سائنس کو یہاں پہنچایا۔ لیکن یہ کرنے کے بعد وہ صنعت کا گلا دبا کر اس کی ترقی روکے رہے، جب تک کہ حالات نے انہیں مجبور نہیں کر دیا۔ ہندوستان پہلے بھی وہ مقام تھا جہاں دو مختلف تہذیبیں آ کر ملیں، مغربی ایشیا کی اسلامی تہذیب اور مشرقی تہذیب جو اس کی اپنی تھی اور مشرق بعید تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب ذرا اور دور مغرب سے ایک تیسری اور پچھلی تہذیبوں سے زیادہ قوی لہر آئی اور ہندوستان مختلف پرانے اور نئے تصورات کا مرکز اور میدان جنگ بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تیسری تہذیبی تحریک فتح یاب ہوتی اور اس طرح ہندوستان کے کئی پرانے مسائل حل کر دیتی، مگر انگریز جنہوں نے اسے یہاں پر قدم جمانے میں مدد کی تھی اس کو اور آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے ہماری صنعت کو نشو و نما نہیں پانے دیا اور اس طرح ہماری سیاسی ترقی میں بھی حائل ہوئے اور تمام ملک میں انہیں نظام جاگیری یا اور جو بھی فرسودہ آثار ملے ان کا انہوں نے تحفظ کیا۔ انہوں نے ہمارے بدلتے اور کسی قدر اصلاح پذیر قانون اور رسموں کے ساتھ کچھ ایسا کیا کہ وہ جس حالت میں تھیں اسی میں ٹھٹھر کر رہ گئیں اور ہمارے لئے ان کی زنجیروں سے رہا ہونا مشکل کر دیا۔ ہندوستان میں بورژوا طبقے نے ان کی خوشنودی یا مدد سے فروغ نہیں پایا۔ لیکن ریل اور صنعت کی پیدا کی ہوئی اور چیزوں کو ایک مرتبہ رائج کرنے کے بعد پھر وہ اس گاڑی کو آگے چلنا اور تغیرات کا سلسلہ جاری رہنا بند نہیں کر سکتے تھے، ہاں یہ ممکن تھا کہ وہ رکاوٹیں ڈالیں اور رفتار سست کر دیں یہ انہوں نے بین طور پر اپنے فائدے کے لئے کیا۔

حکومت ہند کی شاہانہ عمارت اسی پختہ بنیاد پر قائم ہے اور اس کا یقین کے ساتھ

دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۸ء سے جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تمام مقبوضات برطانوی تاج کے زیر نگیں ہوگئیں، اس وقت تک ہندوستان نے جو تعلیمی اور تمدنی ترقی کی ہے اسے حاصل کرنا اس کی لمبی اور رنگارنگ تاریخ نے کسی دور میں اس کے بس کی بات نہیں تھی۔(۶) یہ دعویٰ ایسا واضح اور بین نہیں ہے جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اور یہ اکثر کہا گیا ہے کہ دراصل برطانوی حکومت قائم ہونے کے بعد پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کم ہوگئی۔لیکن اگر یہ بیان پورا پورا صحیح بھی ہوتا تو اس کا مطلب موجودہ صنعتی دور کا پچھلے زمانہ سے مقابلہ کرنا ہوا۔پچھلے سو سال میں سائنس اور صنعت کی بدولت دنیا کے ہر ملک نے بے حساب تعلیمی اور تمدنی ترقی کی ہے اور ہم کسی ایسے ملک کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی ترقی حاصل کرنا، اس کی لمبی اور رنگا رنگ تاریخ کے کسی دور میں اس کے بس کی بات نہ تھی۔چاہے اس کی تاریخ ہندوستان کے مقابلہ میں لمبی نہ کہی جا سکے تو پھر کیا یہ ہمارے بے کار کی کٹ حجتی اور کج فہمی ہوگی اگر ہم کہیں کہ اس صنعتی دور میں ہم بہر حال کچھ نہ کچھ میکانکی ترقی کر ہی لیتے اور برطانوی حکومت کے بغیر بھی کر لیتے اور دراصل اگر ہم اپنی حالت کا اور بہتیرے ملکوں سے مقابلہ کریں تو کیا ہم بغیر غلطی کے خوف کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ ترقی زیادہ ہوتی، کیونکہ خود انگریز اس ترقی کا گلا گھونٹنے کے لئے جو کچھ کر رہے تھے اس کے خلاب ہم کو جدوجہد کرنا پڑی؟ ریلیں، تار برقی، ٹیلی فون، لاسلکی، ان سے اور ایسی دوسری چیزوں سے برطانوی حکومت کی اچھائی اور فیض رسانی کو جانچنا درست نہیں۔یہ اچھی چیزیں ہیں اور ضروری تھیں اور چونکہ انگریز اتفاق سے انہیں پہلے پہل یہاں لائے، ہمیں ان کا احسان ماننا چاہیے۔لیکن صنعتی نظام کے یہ پیش خیمے ہمارے یہاں بالخصوص اس لئے آئے کہ برطانوی حکومت مستحکم ہو جائے۔یہ شریانیں اور شہ رگیں ہیں جن میں قوم کے خون کو دوڑنا چاہیے تھا، انہیں اس کی تجارت کو بڑھانا، اس کی پیداوار کو جگہ جگہ لے جانا اور اس کے لاکھوں کروڑوں

آدمیوں میں نئی جان ڈالنا اور انہیں دولتمند بنانا چاہیے تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ بالاخر ان سے کوئی ایسا نتیجہ نکلنے والا تھا، لیکن ان کی تنظیم اور ان سے کام لینے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ یعنی ملوکیت کی گرفت کو مضبوط کرنا اور منڈیوں کو برطانوی مال کے لئے قبضہ میں کرنا اور یہ مقصد ان کی بدولت حاصل ہو گیا۔ میں صنعتی تنظیم اور نقل و حمل کے جدید ترین ذریعوں کا بالکل موافق ہوں، لیکن کبھی کبھی ہندوستان کے میدانوں سے تیزی کے ساتھ گزرتے وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ ریلیں جو ملک کو زندگی بخشتی ہیں، ایک طرح کی آہنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ہیں جو ہندوستان کو جکڑے اور قید کئے ہوئے ہیں۔

جس تصور کے مطابق انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کی اس میں ریاست پولیس کی عملداری ہے۔ حکومت کا کام یہ تھا کہ ریاست کی حفاظت کرے اور باقی سب دوسروں پر چھوڑ دے۔ انگریزی مالیات کا موضوع بس فوج کے اخراجات، پولیس، نظام حکومت، سرکاری قرضے کا سود تھے۔ شہریوں کی معاشی اغراض کی نگرانی نہیں کی گئی، بلکہ انہیں انگریزی اغراض پر قربان کیا گیا۔ سوائے ایک مٹھی بھر آدمیوں کے باقی سب کی تہذیبی اور دوسری ضروریات کی مطلق پرواہ نہیں کی گئی۔ مالیات عامہ کے نئے تصورات، جن کی بدولت دوسرے ملکوں میں سرکاری خرچ سے ہر ایک کی تعلیم، صحت کی ترقی، غریب اور کمزور دماغ والوں کی دیکھ بھال، مزدوروں کا بیمہ کہ بیماری بڑھاپے اور بے روزگاری کے زمانہ میں بالکل محتاج نہ ہو جائیں اور دوسری باتوں کا انتظام کیا جاتا ہے، ہماری حکومت کی حد نظر سے بالکل باہر تھیں۔ اس طرح کے کاموں کے لئے جن میں خرچ ہی خرچ ہوتا ہے اس کے یہاں کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، کیونکہ اس نے جس اصول پر لگان مقرر کئے تھے وہ بالکل الٹا تھا۔ جن لوگوں کی آمدنی کم تھی ان سے بڑی آمدنی والوں کی بہ نسبت حساب سے بہت زیادہ لیا جاتا تھا اور ملک کے تحفظ اور حکومت کے محکموں، پر اس کا خرچ بے انتہا

تھا اور ساری آمدنی کو کھا جاتا تھا۔

انگریزی حکومت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی پوری توجہ ان باتوں پر صرف کرتی تھی جن کے ذریعہ اس کا سیاسی اور معاشی تسلط بڑھتا تھا۔ باقی سب ضمنی تھا۔ اگر انہوں نے ایک نہایت طاقتور مرکزی حکومت تعمیر کی اور پولیس کو بہت مستعد رکھا تو یہ ایک کارنامہ تھا۔ جس پر وہ فخر کر سکتے تھے، لیکن ہندوستانی قوم اس کو اپنی کامیابی نہیں سمجھ سکتی، اتحاد بڑی اچھی چیز ہے۔ مگر غلامی میں اتحاد کوئی فخر کی بات نہیں۔ ایک استبدادی حکومت کی طاقت لوگوں پر اور بھی گراں ہو سکتی ہے اور پولیس اگرچہ وہ بیشک کئی اعتبار سے کارآمد ہوتی ہے، انہی لوگوں کے خلاف استعمال کی جا سکتی ہے اور کی جا چکی ہے۔ جن کی حفاظت کرنا اس کا کام سمجھا جاتا ہے۔ برٹنڈ رسل نے موجودہ اور قدیم یونانی تہذیب کا مقابلہ کرتے ہوئے حال ہی میں لکھا ہے۔ یونانی تہذیب اگر ہماری تہذیب پر فضیلت رکھتی ہے تو اس لحاظ سے کہ اس کا پولیس کا نظام خراب تھا، جس کی بدولت بھلے آدمیوں کی نسبتاً زیادہ بڑی تعداد اس سے بچ نکلتی تھی۔

انگریزوں کا تسلط ہونے سے ہم کو امن ملا اور ان تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد جو مغل سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے پر ہمیں سہنا پڑیں۔ ہندوستان کو بے شک امن کی ضرورت تھی۔ امن ایک قیمتی چیز ہے، ہر قسم کی ترقی کے لیے ضروری ہے اور ہمیں جب وہ حاصل ہوا تو ہم نے اس کی آؤ بھگت بھی کی۔ لیکن امن بھی بہت گراں داموں خریدا جا سکتا ہے، اگر وہ قبر کے کامل سکون، یا پنجرے یا قید خانہ کی قطعاً محفوظ زندگی کے برابر ہو جائے۔ امن ایسے لوگوں کی اشک آلود مایوسی سے بھی پیدا ہو سکتا ہے جو اپنی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ وہ امن جو کسی اجنبی فاتح نے جبراً قائم کیا ہو اصل میں امن کی تھکن مٹانے اور تسکین دلانے والی صفات پا ہی نہیں سکتا۔ جنگ ایک بڑی خوفناک چیز ہے اور اس سے بچنا چاہیے۔ لیکن چند اوصاف کو وہ ترقی دیتی

ہے جو نفسیات کے ماہر ولیم جیمز کے مطابق وفاداری، ربط، استقلال، بہادری، ضمیر کی بیداری، تعلیم، جدت کا مادہ، کفایت شعاری اور جسمانی صحت اور قوت کے اوصاف ہیں۔ اسی سبب سے جیمز ایک اخلاقی محرک کی تلاش میں تھا جو لڑائی کا اندھیر اڈھائے بغیر کسی انسانی جماعت میں ان اوصاف کو ترقی دے۔ اگر اسے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی خبر ہوتی تو اسے ایک ایسی چیز مل جاتی جو اس کے دل کو لگتی، یعنی لڑائی کا ہموزن اخلاقی اور پرامن محرک۔

تاریخ کے امکانات پر اور اس پر غور کرنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا، تضیع اوقات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے لئے اچھا تھا کہ اس کا مغرب کی سائنس اور صنعت سے سابقہ پڑا۔ سائنس مغرب کی بڑی دین تھی۔ ہندوستان میں اس کی کمی تھی اور اس کے بغیر اس کی حالت کا بد سے بدتر ہونا لازمی تھا۔ جس طریقہ پر ہمارا ایک دوسرے سے سابقہ ہوا وہ قابل افسوس تھا، لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ جب تک ہم کو متواتر سخت صدمے نہ پہنچتے ہماری غفلت دور نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیئے تو پروٹسٹنٹ انفرادیت پسند اینگلوسیکسن قوم کے انگریز ہمارے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے، کیونکہ مغربی قوموں میں وہی سب سے زیادہ مختلف ہیں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ صدمے پہنچا سکتے تھے۔

انہوں نے ہمیں سیاسی اعتبار سے متحد کردیا اور یہ ایک بہت اچھی بات تھی، لیکن یہ اتحاد موجود ہوتا یا نہ ہوتا، ہندوستان میں قومیت بڑھتی اور ایسے اتحاد کا مطالبہ کرتی۔ آج کل عرب کئی الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کردیئے گئے ہیں جن میں سے بعض آزاد ہیں، بعض کا کسی یورپی قوم نے اپنے آپ کو محافظ ٹھہرایا ہے۔ بعض کا کسی نے اپنے آپ کو نگران اور اتالیق بنالیا ہے، یا ایسا ہی کچھ اور لیکن عرب اتحاد کی خواہش سب میں موجزن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مغربی ملوکیت رستہ روکے نہ کھڑی ہوتی تو وہ اس اتحاد کو بڑی حد تک عمل میں لے آتے لیکن ہندوستان کی طرح

وہاں بھی ان مغربی ریاستوں کا مقصد یہ ہے کہ انتشار کے میلانات کو تقویت پہنچائیں، اقلیتوں کے مسائل پیدا کریں جو قومیت کے جذبے کو کمزور کرتے اور ایک حد تک اس کا ردِ عمل ہوتے ہیں اور ملوکیت پرست ریاست کو اس کا موقع دیتے ہیں کہ وہ قبضہ جمائے رہے اور غیر جانب دار بنی رہے۔

ہندوستان کا سیاسی اتحاد تو برطانوی ملوکیت کی ترقی کے لئے جو کوششیں کی گئیں ان کا بس ایک ضمنی نتیجہ تھا۔ بعد کو، جب یہ اتحاد جذبہ قومیت کے ساتھ مل گیا اور غیروں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کو کھڑا ہوا تو ہم نے دیکھا کہ انتشار اور فرقہ بندیوں کی جو ہماری آئندہ ترقی کے رستہ میں زبردست رکاوٹیں ہیں، جان بوجھ کر پرورش کی گئی ہے۔

انگریزوں کو یہاں آئے اور تسلط حاصل کئے بھی کتنا زمانہ ہوگیا ہے پونے دو صدی! وہ سیاہ و سپید کے مالک تھے، جیسے کہ استبدادی حکومتیں ہوا کرتی ہیں اور ہندوستان کی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق تشکیل دینے کا انہیں ایک نایاب موقع ملا تھا۔ اسی دوران میں ساری دنیا، انگلستان، یورپ، امریکہ، جاپان سب اس قدر بدل گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جاسکتے۔ بحر اٹلانٹک کے ساحل کی وہ امریکی نوآبادیاں جن کی اٹھارویں صدی میں کوئی حیثیت نہیں تھی اب دنیا کی سب سے دولتمند اور طاقتور قوم ہیں اور صنعت میں سب سے آگے ہیں۔ جاپان میں ذرا سی مدت میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ روس کی وسیع سرزمین میں جہاں ابھی کل تک زار کی حکومت کا بھاری ہاتھ ترقی اور نشوونما کا گلا دباتا رہتا تھا، ایک نئی زندگی کا خون دوڑ رہا ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا بنائی جارہی ہے۔ ہندوستان میں بھی تغیرات ہوئے ہیں۔ یہ ملک اب وہ نہیں ہے جو اٹھارویں صدی میں تھا۔ اب ہم ریلیں دیکھتے ہیں، آب پاشی کا انتظام، کارخانے، اسکول اور کالج بڑے بڑے سرکاری دفتر وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان تغیرات کے باوجود، ہندوستان کی اس وقت کیا حالت ہے؟ ہندوستان ایک غلاموں کی ریاست ہے جس کی عظیم الشان قوت ایک پنجرے میں بند ہے، جس میں آزادی سے سانس لینے کی ہمت نہیں، جس پر اجنبی دور سے بیٹھے راج کررہے ہیں۔اس کے باشندوں سے زیادہ غریب کہیں کے باشندے نہیں، ان کی عمریں کم ہوتی ہیں۔اوران میں بیماری اور وباء کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔یہاں جہالت کا دور دورہ ہے، بڑے بڑے علاقہ ہیں جن میں صفائی اور طبی امداد کا کوئی انتظام نہیں، متوسط طبقے اور عوام میں بے روزگاری بے پناہ ہے۔ہم سے کہا جاتا ہے کہ آزادی، جمہوریت، اشتراکیت، اشتمالیت کے نعرے ناقابل عمل حوصلوں کے شیدائی، عقیدوں کے کٹر پرستار یا لفنگے لگاتے ہیں، اصل معیار لوگوں کی اجتماعی بہبودی ہے۔ بیشک سب سے اہم معیار یہی ہے اور اس پر آج کل کا ہندوستان جانچا جائے تو اس کی قدر بہت حقیر نکلے گی۔دوسرے ملکوں میں بے روزگاری میں امداد کرنے اور مصیبت زدوں کو سہارا دینے کے لئے جو بڑے انتظامات تجویز ہوئے ہیں ان کے متعلق جو ہم پڑھتے ہیں، لیکن ہمارے ملک میں جو کروڑوں بے روزگار ہیں اور جس طرح ملک کے بیشتر حصہ میں مصیبتیں گلے کا طوق بنی ہیں، اس کے لئے کیا کہا جاتا ہے۔دوسری جگہوں کے متعلق جو ہم پڑھتے ہیں کہ رہنے کے لئے مکانوں کا بندوبست کیا جارہا ہے، ہمارے یہاں ان کروڑوں کے رہنے کے لیے کیا سوچا جاتا ہے۔جو مٹی کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں یا جنہیں چھت کا سایہ بھی میسر نہیں؟ پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہے اگر ہم ایسے ملکوں پر رشک کریں جہاں تعلیم، صفائی، طبی امداد کے وسائل، مہذب زندگی کا سامان اور صنعت پیداوار میں روزافزوں ترقی ہوتی ہے، جب کہ ہم اسی ایک حال میں پڑے ہوئے ہیں یا بڑھتے ہیں تو گھونگے کی رفتار سے۔روس نے کوئی بارہ برس کے مختصر سے عرصہ میں ایک حیرت انگیز کوشش کرکے اپنے وسیع ملک میں جہالت کا خاتمہ کردیا اور ایک

نفیس اور جدید ترین اصولوں پر مبنی طریقہ رائج کر دیا ہے۔ جس کا عوام کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اتاترک مصطفےٰ کمال کی رہبری میں ترکی جو جو پیچھے رہ گیا تھا لمبے لمبے ڈگ رکھ کر تعلیم کو عام کرنے میں دوسروں کے برابر پہنچ گیا۔ فاشٹ اٹلی نے اپنے نئے مسلک پر پہلا قدم رکھتے ہی جہالت پر ایک زوردار حملہ کیا۔ وزیر تعلیم جنتیلے نے اعلان کیا کہ جہالت کی فوج کا قلب مارنا چاہیے۔ اس ناسوری مرض کو جو ہمارے جسم سیاسی کو سڑائے ڈالتا ہے، دہکتے ہوئے لوہے سے جلا کر دور کرنا چاہیے۔ یہ بہت سخت الفاظ ہیں، جنہیں کسی ڈرائنگ روم میں زبان پر لانا مناسب ہوگا، لیکن یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بات کہنے والے میں جوش کتنا ہے اور اس کا عقیدہ کتنا پختہ ہے۔ ہم یہاں زیادہ شائستہ ہیں اور ہماری زبان شستہ اور نرم ہوتی ہے ہم کمال احتیاط سے قدم رکھتے ہیں اور ہماری ساری قوت کمیشنوں اور کمیٹیوں میں صرف ہو جاتی ہے۔

ہندوستانیوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ باتیں کرتے ہیں اور کام کم۔ یہ الزام صحیح ہے۔ لیکن کیا انگریزوں میں کمیٹی اور کمیشن بنانے کی جو بے حد و حساب استعداد ہے، اس پر ہم اپنی حیرت ظاہر نہ کریں۔ وہ کمیٹیاں اور کمیشن جن میں سے ہر ایک مدتوں محنت کرنے کے بعد ایک عالمانہ رپورٹ شائع کرتا ہے۔ ایک سرکاری تالیف جس کی حسب دستور تعریف کی جاتی ہے اور جو پھر حسب دستور کسی خانے میں رکھ دی جاتی ہے، اس طرح کہ ہم کو احساس ہوتا ہے کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں، ترقی کر رہے ہیں اور یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ جہاں ہیں وہیں پر رہتے ہیں۔ خودداری جو چاہتی ہے وہ بھی ہو جاتا ہے اور جو مستقل اغراض وابستہ ہیں ان کا بال بیکا نہیں ہوتا اور وہ محفوظ رہتی ہیں۔ دوسرے ملکوں میں اس پر بحث کی جاتی ہے کہ ترقی کیسے کریں۔ ہم روکنے اور بریک لگانے اور حقوق کا تحفظ کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں کہ کہیں بہت زیادہ تیزی سے آگے نہ بڑھ جائیں۔

۱۹۳۴ء کی مشترک پارلیمنٹیر کمیٹی کی رپورٹ میں مغل عہد کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ شہنشاہ کی شان وشوکت رعایا کی غربت کا پیانہ ہوگئی تھی۔ یہ خیال بالکل صحیح ہے، لیکن کیا آج کل بھی ہم اسی پیانہ سے نہیں ناپ سکتے؟ آپ آج کل کی نئی دہلی اور وائسرائے کے ٹھاٹھ اور صوبوں کے گورنروں اور ان کے دکھاوے اور نمائش کو کیا کہیں گے؟ اس کا پس منظر بھی وہی انتہائی اور حیرت انگیز غربت ہے۔ دونوں کو مقابلہ پر دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے اور یہ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کہ حساس لوگ اسے کیسے گوارا کرتے ہیں۔ شہنشاہی عمارت کی روکار کے پیچھے ہندوستان کا جو منظر ہے اس پر افلاس اور ویرانی برستی ہے۔ سامنے تو جوڑ جاڑ کر اور لیس پوت کر کچھ حیثیت بنالی گئی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے بدقسمت متوسط طبقہ کے ادنٰی لوگ ہیں جنہیں موجودہ زمانہ کا نظام حیات روز بروز اور بے بس کئے دیتا ہے اور آگے بڑھئے تو مزدور ہیں جو بڑی تکلیف سے رہتے ہیں، اور غربت کی چکی میں پسے جاتے ہیں پھر ہمارا کسان ہے، ہندوستان کا قومی نشان، جس کی قسمت میں زندگی کو ایک سدا چھائی ہوئی رات کے اندھیرے میں گزارنا لکھا ہے۔

صدیوں کے بوجھ سے جھکا ہوا۔
وہ اپنے پھاوڑے کی ٹیک لگائے زمین کو تک رہا ہے۔
جگوں کی محرومی اس کے چہرے پر نقش ہے۔
اور دنیا کا بار اس کی پیٹھ پر ہے۔

ہزاروں برس جو دکھ سہے گئے ان کی جھلک اس ہیبت ناک شکل میں نظر آتی ہے۔ سارے زمانے کا الم اس دکھتی اور جھکی ہوئی کمر میں ہے۔

یہ بھیانک شکل اس نوع انسانی کی
جسے دغا دی گئی، جو لٹی، رسوا ہوئی اپنے حق سے محروم کی گئی

صدائے احتجاج ہے ان قوتوں کے سامنے جنہوں نے دنیا کو

بنایا۔

اور یہ احتجاج ایک پیشین گوئی بھی ہے۔

ہندوستان کی تمام مصیبتوں کا الزام انگریزوں پر لگانا مبہم ہے۔ یہ ذمہ داری ہم کو اپنے سر لینا ہوگی اور ہمیں اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اپنی کمزوری کے لازمی نتائج کا دوسروں کے سر تھوپنا بہت بری بات ہے۔ ایک تحکم پسند نظام حکومت خصوصا اگر وہ غیر ملکی ہو لازمی طور پر غلامی کے جذبے کو ترقی دے گا اور محکوموں کے ذہن ونظر کو محدود کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ نوجوان کی بہترین صفات حوصلہ مندی، من چلے پن، جدت طبع، تیزی اور طراری کو کچل ڈالے گا اور بزدلی، کائیاں پن، کورانہ اطاعت، افسروں کو خوش رکھنے اور ان کی خوشامد کرنے کی خواہش کو بڑھائے گا۔ ایسا نظام سچے جذبہ خدمت کو نہیں ابھارتا قوم کی خدمت کا حوصلہ اور نصب العین کی محبت نہیں پیدا کرتا، بلکہ ان لوگوں کو چن لیتا ہے جن میں جوش قومی سب سے کم ہو اور جن کا مقصد صرف ذاتی ترقی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کو کس قسم کے آدمی ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض تیز فہم ہوتے ہیں اور اچھا کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ سرکاری یا نیم سرکاری ملازمتوں کی طرف ڈھل جاتے ہیں اور اچھا کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ سرکاری یا نیم سرکاری کی طرف ڈھل جاتے ہیں اس لئے کہ اور کسی طرف جانے کا موقع نہیں ہوتا یہاں ان کی ساری تیزی جاتی رہتی ہے، وہ اس بڑی مشین کے پرزے بن کر رہ جاتے ہیں اور ان کے ذہن میں اس مرہٹی گھس گھس میں پڑ کر کند ہو جاتے ہیں۔ ان میں دفتری حکومت کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، یعنی کلرکی قابلیت اور دفتری کام کی حکمت عملی بہت ہوا تو انہیں اپنے کام سے کچھ دھیمی سی محبت ہو جاتی ہے۔ سرگرمی اور جوش کا تو کوئی سوال ہی نہیں، کیونکہ غیروں کی حکومت میں

یہ چیز ناممکن ہے۔

ان کو چھوڑ کر، چھوٹے عہدہ دار عموماً کچھ قابل تعریف نہیں ہوتے کیونکہ وہ بس اپنے افسروں کی خوشامد کرنا اور اپنے ماتحتوں پر دھونس جمانا چاہتے ہیں۔ اس میں ان کا قصور نہیں۔ یہ نظام حکومت انہیں تربیت ہی ایسی دیتا ہے۔ اگر اس فضا میں خوشامد اور رعایت کا زور ہو، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟ ان لوگوں کا ملازمت میں کوئی نصب العین نہیں ہے، بے روزگاری اور اس کے ساتھ ساتھ فاقہ کشی کا خوف بھوت کی طرح ان کے پیچھے لگا رہتا ہے اور ان کا سارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے عہدوں پر برقرار رہیں اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لئے اور نوکریاں حاصل کرلیں۔ جہاں جاسوس اور وہ ذلیل ترین مخلوق، یعنی مخبر ہمیشہ گھات میں لگے رہتے ہوں وہاں لوگوں میں عمدہ صفات کا نشوونما پانا آسان نہیں۔

حال کے واقعات نے ان لوگوں کے لئے جو حساس طبیعت اور جذبہ قومی رکھتے ہیں، سرکاری ملازمت اختیار کرنا اور بھی دشوار کردیا ہے۔ حکومت ان کو پسند نہیں کرتی اور وہ بھی جب تک معاشی حالات انہیں مجبور نہ کردیں۔ حکومت سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔

لیکن دنیا جانتی ہے کہ، برطانوی سامراج کا بار گورے آدمی سنبھالے ہوئے ہیں، نہ کہ کالے آدمی، ہمارے یہاں سامراج کا بار گورے آدمی سنبھالے ہوئے ہیں، نہ کہ کالے آدمی۔ ہمارے یہاں سامراج کی روایات کو قائم رکھنے کے لئے متعدد امپیریل سروسیں ہیں۔ اور ان کے خاص حقوق کی حفاظت کے لئے کافی تحفظات ہیں اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ سب ہندوستان کے مفاد کے لئے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کا مفاد اسی چیز پر موقوف ہے جس میں ان سروسوں کا صریحی فائدہ ہو۔ اگر انڈین سول سروس کا کوئی خاص حق یا کوئی بڑا عہدہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے تو ایک شور مچ جاتا ہے کہ اس سے بدانتظامی اور بددیانتی پھیلے

گی۔ انڈین میڈیکل سروس کے وہ عہدے جو گورے آدمیوں کے لئے مخصوص ہیں کم کردیئے جائیں تو ہندوستانیوں کی صحت عامہ کے لئے خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر فوج کے اس حصے کو جس میں انگریز ہیں ہاتھ بھی لگایا گیا تو دنیا بھر کی آفتیں ہم پر ٹوٹ پڑیں گی۔

میرے خیال میں یہ ایک حد تک ٹھیک ہے کہ اگر اعلیٰ عہدیدار سب یکبارگی چلے جائیں اور اپنے محکموں کو اپنے ماتحتوں کے حوالے کر دیں تو کارکردگی کا معیار گر جائے گا۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سارا نظام قائم ہی اس ڈھنگ سے ہوا ہے۔ اور ماتحت نہ تو قابلیت کے لحاظ سے منتخب کئے گئے ہیں اور نہ کبھی ان پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں قابل آدمی کثرت سے موجود ہیں اور اگر صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ لوگ کام کے بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری حکومت اور ہماری سماج کا نقطہ نظر بالکل بدل جائے۔ یعنی ایک نئی ریاست وجود میں آئے۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ ہم سے کہا جاتا ہے دستور میں چاہے جیسے تغیرات ہوں ان بڑی سروسوں کا جو ہماری محافظ اور پشت پناہ ہیں، یہ سنگین قلعہ بدستور قائم رہے گا۔ یہ سروسیں حکومت کے اسرار کی حامل ہیں وہ اپنے مندر کی پاسبانی کریں گی اور نامحرموں کو اس حریم پاک میں قدم نہیں رکھنے دیں گی۔ رفتہ رفتہ، جوں جوں ہم اس عزت کے مستحق ہوتے جائیں گے وہ پردوں کو ایک ایک کر کے ہٹاتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ کبھی نہ کبھی وہ دن آئے گا جب آخری پردہ ہٹ جائے گا اور یکا یک اس معبد کا اندرونی حصہ ہماری متحیر اور مودب نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔

امپیریل سروسوں میں سب سے بڑا درجہ ہندوستانی سول سروس کا ہے اور ہندوستان کی حکومت کو چلانے کی نیک نامی یا بدنامی اسی کے حصے میں آتی ہے۔ اس سروس کے چند در چند اوصاف ہمیں بار بار سنائے جا چکے ہیں۔ اور سامراج کے

نظام میں اس کو جو عظمت حاصل ہے وہ ضرب المثل ہوگئی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس کا مسلمہ اقتدار، اسے قریب سے قریب استبدادی حکومت کے اختیارات حاصل ہونا اور پھر اس طرح آسمان پر چڑھایا جانا کسی فرد یا جماعت کے ذہنی توازن کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ سول سروس کی میرے دل میں جو قدر ہے اس کے باوجود مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے یہ حضرات بہت جلد اس بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں جو پرانے زمانے سے چلی آتی ہے اور آج کل اور بڑھ گئی ہے یعنی اپنی بڑائی کا مالیخولیا۔

سول سروس کی خوبیوں سے انکار کرنا فضول ہے اس لئے کہ انہیں بھولنے کا ہم کو موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ لیکن اس کی تعریف میں اتنی لغو باتیں کہی جا چکی ہیں اور کہی جا رہی ہیں کہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے ذرا ان لغویات کی قلعی کھول دی جائے۔ امریکی ماہر معاشیات دبلن نے امتیازی حقوق، رکھنے والے طبقوں کو داشتہ طبقے کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آئی سی ایس اور دوسری امپیریل سروسوں کو داشتہ سروسیں کہا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ یہ عیش ہمیں بڑا مہنگا پڑتا ہے۔

میجر گراہم پول نے، جو پارلیمنٹ کے سابق ممبر ہیں اور ہندوستان کے معاملات سے بھی بہت دلچسپی رکھتے ہیں، کچھ دن ہوئے موڈرن ریویو میں لکھا تا کہ ابھی تک کسی نے اس سے انکار نہیں کیا کہ آئی سی ایس ایک نہایت قابل اور مستعد سروس ہے۔ چونکہ انگلستان میں ایسی باتیں اکثر کہی جاتی ہیں اور مان لی جاتی ہیں اس لئے اس قول پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح کے قطعی دعوے جن کی آسانی سے تردید ہو سکتی ہے، خطرے سے خالی نہیں اور میجر گراہم کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس بات سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ بارہا اس کا انکار کیا جا چکا ہے۔ بہت دن ہوئے مسٹر گوکھلے نے آئی سی ایس کو کھری کھری سنائی تھیں۔ آج بھی تمام ہندوستانی خواہ وہ کانگریسی ہو یا نہ ہوں میجر گراہم پول کے اس قول کی تردید کے

لئے تیار ہو جائیں گے۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں فریقوں کی رائے اپنی اپنی جگہ صحیح ہو۔ ان کا اشارہ مختلف صفات کی طرف ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ سول سروس میں جو قابلیت اور مستعدی ہے وہ کس قسم کی ہے۔ اگر اس قابلیت اور مستعدی کا اندازہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کس حد تک مستحکم کی گئی اور اسے ملک سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کتنی مدد پہنچائی گئی تو بے شک آئی سی ایس والے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انہوں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ لیکن اگر معیار ہندوستان کے عوام کی بہبودی ہے تو وہ صریحاً ناکامیاب رہے اور ان کی ناکامیابی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آمدنی اور معیار زندگی کے لحاظ سے ان میں اور عام لوگوں میں جن کی خدمت کے لئے وہ رکھے گئے ہیں اور جن پر ان کی تنخواہوں کا بار پڑتا ہے، زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ مجموعی حیثیت سے اس سروس نے ایک خاصی معیار قائم رکھا ہے۔ یہ معیار لازمی طور پر اوسط درجے کی قابلیت کا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اس میں غیر معمولی لوگ بھی نکلے ہیں۔ اس قسم کی سروس سے اس سے زیادہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اصل میں اس میں انگلستان کے پبلک اسکول کی اسپرٹ مع اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے کام کر رہی ہے۔ (اگرچہ اس وقت آئی سی ایس کے بہت سے پبلک سکول کے تعلیم یافتہ نہیں) گو آئی سی ایس نے ایک معیار قائم رکھا، مگر وہ مقررہ نمونے کے مطابق نہ ہونے کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اس کے افراد کی خاصی صلاحیتیں کچھ تو ایک بندھے ہوئے ڈھرے میں پڑ جانے کی وجہ سے اور کچھ اس خوف سے کہ کہیں وہ دوسروں سے مختلف نہ ہوں، ٹھٹھر کر رہ گئیں۔ اس میں بہت سے لوگ دل سے کام کرنے والے تھے، بہت سے ایسے جن کے سامنے خدمت کا ایک نصب العین تھا، مگر یہ خدمت برطانوی سلطنت کی خدمت تھی، ہندوستان کا نمبر دوسرا تھا اور بہت بعد میں آتا تھا۔ اپنی تربیت کے لحاظ سے سول سروس کا طرز عمل

اس کے ساتھ کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چونکہ وہ تعداد میں کم تھے اور انہیں ایک غیر قوم سے سابقہ تھا جو اکثر ان کی مخالف رہتی تھی اس لئے انہوں نے باہمی اتفاق، اور ایک خاص معیار قائم رکھا اور چونکہ انہیں بڑی حد تک مطلق العنانی حاصل تھی، انہیں ہر قسم کی تنقید ناگوار ہونے لگی، اسے گناہ کبیرہ سمجھنے لگے۔ ان کی ناروا داری بڑھتی گئی، ان کا انداز معلمانہ ہوتا گیا اور ان میں غیر ذمہ دار حاکموں کے بہت سے عیب پیدا ہو گئے۔ وہ خود پسند اور بر خود غلط تنگ نظر اور بے لوچ ہو کر رہ گئے یعنی ایک ترقی پذیر ماحول سے انہیں بالکل مناسبت نہیں رہی۔ جب ان سے زیادہ قابل اور ماحول مطابقت رکھنے والے دماغ، ہندوستان کے مسئلے پر غور کرنے لگے تو انہیں بہت برا معلوم ہوا اور وہ ان لوگوں کو برا بھلا کہنے لگے انہیں دبانے لگے اور ان کے راستے میں ہر طرح کے روڑے اٹکانے لگے۔ جب جنگ عظیم کے بعد کے تغیرات نے دنیا میں ایک ہیجان اور حرکت پیدا کر دی تو ان کی عقل چکرا گئی اور یہ نئے حالات سے نبٹنے کے قابل نہیں رہے۔ ان کی محدود اور جامد تعلیم نے انہیں غیر معمولی موقعوں پر اور نئی صورتوں کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ ایک مدت تک غیر ذمہ دار رہنے سے ان کی عادتیں بگڑ گئی تھیں۔ ایک جماعت کی حیثیت سے وہ قریب قریب خود مختار تھے محض برائے نام برطانوی پارلیمینٹ کے ماتحت ہے۔ لارڈ ایکٹن نے کہا کہ اقتدار آدمی کو بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار تو بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اپنی بساط کے موافق یہ لوگ بھروسے کے عہدہ دار تھے، جو اپنا روزمرہ کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے اگر چہ اس میں کوئی خاص ذہانت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کی تربیت ہی ایسی تھی کہ اگر کوئی غیر متوقع صورت پیدا ہو جاتی تو وہ رہ جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی خود اعتمادی، ضابطہ پسند طبیعت اور باہمی اتحاد کی بدولت فوری مشکلات پر قابو پا لیتے۔ عراق میں جو گڑبڑ ہوئی تھی اس نے ظاہر کر دیا کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت کتنی سست اور ٹھس

ہے۔ اس قسم کے واقعات بہت ہوتے ہیں مگر ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ سول نافرمانی کے روکنے کے لئے جو کاروائیاں حکومت نے کیں وہ بھی بہت بھونڈی تھیں۔ بندوق اور لاٹھی چلا کر مخالفوں کو تھوڑی دیر کے لئے دبا سکتے ہیں مگر اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، بلکہ خود وہ برتری کا احساس جس کا تحفظ مقصود ہے اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان لوگوں نے ایک بڑھتی ہوئی جارحانہ قومی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے تشدد سے کام لیا۔ یہ لازمی تھا کیونکہ سلطنتوں کا دارومدار اسی پر ہے اور ان کو مخالفت کا سامنا کرنے کا اور کوئی طریقہ سکھایا نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ بے ضرورت اور حد سے زیادہ تشدد سے کام لیا۔ یہ لازمی تھا کیونکہ سلطنتوں کا دارومدار اسی پر ہے اور ان کو مخالفت کا سامنا کرنے کا اور کوئی طریقہ سکھایا نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ بے ضرورت اور حد سے زیادہ تشدد سے کام لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاملہ ان کے قابو سے باہر ہو گیا تھا اور معمولی حالت میں جو ضبط و استقلال ان میں نظر آتا تھا وہ اس وقت باقی نہیں رہا تھا اکثر وہ بالکل بدحواس ہو جاتے تھے اور ان کی پبلک تقریروں میں ہسٹیریا کی سی کیفیت نظر آتی تھی۔ کوئی نازک موقع آتا ہے تو بے رحمی سے وہ سب کی قلعی کھول دیتا ہے اور طبیعت کی گہرائیوں میں جو کمزوریاں چھپی ہوں انھیں سطح پر لے آتا ہے۔ سول نافرمانی ایسا ہی آزمائش کا موقع تھا اور مورچے کے دونوں طرف یعنی کانگریس اور گورنمنٹ دونوں کے یہاں، ایسے لوگ بہت کم ہی تھے جو اس آزمائش میں پورے اترے۔ مسٹر لائڈ جارج کہتے ہیں نازک موقعوں پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد اور عورتیں جن میں واقعی اعلیٰ درجے کی قابلیت ہے بہت کم ہیں اور باقی لوگ ایسے موقعوں پر بیکار رہیں۔ جب کوئی بڑا سیلاب آتا ہے تو وہ ٹیلے جو یوں خاصے بلند نظر آتے تھے، ڈوب جاتے ہیں اور صرف سب سے اونچی چوٹیاں پانی کی سطح کے اوپر نظر آتی ہیں۔

آئی سی ایس کے لوگ اپنے ذہن اور جذبات کے اعتبار سے اس طوفان کے

لئے جو ہندوستان میں آیا بالکل تیار نہ تھے۔ ان میں سے اکثر کی تعلیم کلاسیکی طرز پر ہوتی تھی، جس سے ان میں ایک خاص قسم کی شائستگی اور خاص قسم کی دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن یہ طرز پرانے زمانہ کا تھا جو عہد وکٹوریہ کے لئے موزوں تھا مگر موجودہ حالات سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ اپنی ایک تنگ و محدود دنیا اینگلو انڈین دنیا میں رہتے تھے، جو نہ انگریزی تھی نہ ہندوستانی۔ وہ ان قوتوں کی قدر و قیمت کا جو اس عہد کی سماج میں کارفرما ہیں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ باوجود اس مضحک دعوے کہ وہ ہندوستان کے عام لوگوں کے ولی اور امین ہیں وہ ان سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے اور نئے اوسط طبقے کے شہریوں سے اور بھی کم۔ وہ ہندوستانیوں کی سیرت کا اندازہ ان خوشامدیوں اور ملازمت کے خواستگاروں کو دیکھ کر کرتے جو انھیں گھیرے رہتے تھے، باقی سب کو مفسد اور شریر جان کر قابل التفات نہ سمجھتے۔ لڑائی کے بعد ساری دنیا میں جو تغیرات خصوصاً معاشی زندگی میں ہوئے، ان کا علم انہیں بہت ہی کم تھا۔ وہ اپنے اسی پرانے ڈھرے پر تھے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو بدلنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ جس نظام کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں وہ اب فرسودہ اور بے کار ہو گیا ہے اور وہ ایک جماعت کی حیثیت سے وہی طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جس کا نقشہ ٹی ایس ایلیٹ نے اپنی تصنیف کھوکھلے آدمی میں کھینچا ہے۔

یہ فرسودہ نظام ہے اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ برطانوی سلطنت قائم ہے۔ اور اب بھی خاصی طاقتور ہے اور اس کے چلانے والے قابل اور باتدبیر ہیں۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت اس دانت کی طرح ہے جو سڑ گیا ہے مگر مسوڑھوں میں جڑ پکڑے ہوئے ہے اس سے درد ہوتا ہے مگر اسے اکھاڑنا آسان نہیں۔ یہ درد اسی طرح ہوتا رہے گا بلکہ اور بڑھتا جائے گا جب تک کہ دانت نکالا جائے یا خود ہی نہ گر جائے۔

انگلستان میں بھی پبلک سکول کے پڑھے ہوئے لوگوں کا دور دورہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ اب تک ملکی معاملات میں دخیل ہیں مگر اب ان کی وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ ہندوستان میں اور بھی زیادہ بے محل ہیں۔ جارحانہ قومی تحریک سے نبھانا ان کے لئے محال ہے اور سماجی انقلاب کی تحریک سے نبھانا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں

بے شک آئی سی ایس میں بہت سے اچھے لوگ ہیں، انگریز بھی اور ہندوستانی بھی۔ لیکن جب تک موجودہ نظام قائم ہے ان کے یہ اوصاف ان مقاصد میں کام آئیں گے جو ہندوستانیوں کے حق میں مفید نہیں۔ سول سروس کے بعض ہندوستانی پبلک سکول کے رنگ میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ وہ بادشاہ سے بھی زیادہ بادشاہی کے حامی بن جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں آئی سی ایس کے ایک نوجوان ہندوستانی سے ملا تھا جو اپنے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے مگر افسوس ہے کہ مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہ تھا انہوں نے سروس کے بہت سے اوصاف جتائے اور آخر میں برطانوی راج کی حمایت میں وہ دلیل پیش کی جو کا کوئی جواب نہیں کہ کیا برطانوی راج رومی اور چنگیزی اور تیموری راج سے بہتر نہیں؟

آئی سی ایس والوں کے خیالات کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض نہایت قابلیت سے انجام دیتے ہیں اس لئے انہیں حق ہے کہ اپنے چند در چند مطالبات پر جتنا چاہیں زور دیں۔ اگر ہندوستان غریب ہے تو یہ اس کے معاشرتی رسم و رواج کا قصور ہے یا اس کے بنیوں اور ساہو کاروں اور سب سے زیادہ اس کی بے شمار آبادی کا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے بنیئے یعنی برطانوی حکومت کو وہ چپ چاپ نظر انداز کر جاتے ہیں، معلوم نہیں آبادی کی کثرت کا وہ کیا علاج کریں گے اس لئے کہ گو انہیں آئے دن کے قحط، وبا اور شرح اموات کی زیادتی سے بہت بڑی مدد ملتی ہے مگر پھر بھی آبادی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لوگ ضبط تولید کی تجویز پیش کرتے ہیں اور میں خود اس سے پوری طرح متفق ہوں کہ ضبط تولید کے طریقوں کے متعلق

لوگوں کو معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ لیکن ان تدبیروں پر عمل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عام لوگوں کا معیار زندگی بہت بلند ہو، ان میں تھوڑی بہت تعلیم پھیل جائے اور سارے ملک میں بے شمار اسپتال قائم ہوں۔ موجودہ حالات میں ضبط تولید کے وسائل عام لوگوں کی پہنچ سے بالکل باہر ہیں، البہ اوسط طبقے کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور میرے خیال میں بڑی حد تک اٹھا بھی رہے ہیں۔

لیکن آبادی کی کثرت کا مسئلہ دوسرے پہلو بھی غور و توجہہ کا مستحق ہے۔ آج کل دنیا کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ غذا یا اور ضروریات کی کمی نہیں۔ اگرچہ آبادی بڑھ گئی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اشیائے خوردنی کی رسد آبادی کے تناسب سے زیادہ بڑھی ہے اور بڑھائی جاسکتی ہے اور پھر ہندوستان کی آبادی کا یہ اضافہ جس کا اس قدر شور ہے (بجز پچھلے دس سال کے) اکثر مغربی ممالک کے مقابلہ میں بہت کم رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آگے چل کر فرق بہت زیادہ ہو جائے گا کیونکہ مختلف محرک مغربی ملکوں میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار کم کر رہے ہیں بلکہ روک رہے ہیں۔ لیکن ایسے اسباب ہندوستان میں بھی جلد پیدا ہو جائیں گے جو آبادی کو بڑھنے سے روکیں گے۔

جب کبھی ہندوستان آزاد اور اس قابل ہوگا کہ اپنی نئی زندگی کو حسب دلخواہ تعمیر کرے تو اسے لازمی طور پر اس کام کے لئے اپنے بہترین مرد اور عورتیں درکار ہوں گی۔ اچھے آدمی ہمیشہ کمیاب ہوتے ہیں اور ہندوستان میں اور بھی کمیاب ہیں اس لئے کہ برطانیہ کی حکومت میں ہمارے لئے مواقع کی کمی رہی ہے۔ ہم کو اپنے اجتماعی کاروبار کے کئی شعبوں میں غیر ملکی ماہروں کی ضرورت پڑے گی، خاص طور پر ان شعبوں میں جن کے لئے میکانکی یا علمی واقفیت درکار ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں جنھوں نے آئی سی ایس یا دوسری امپیریل سروسوں میں کام کیا ہے بہت سے ہندوستانی اور غیر ملکی ہوں گے جو نئے نظام کے لئے مفید ہوں گے اور خوشی سے

رکھے جائیں گے۔ لیکن اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی نیا نظام اس وقت تک تعمیر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ آئی سی ایس کی روح ہمارے نظام حکومت اور سرکاری محکموں میں سمائی ہوئی ہے۔ تحکم پسندی شہنشاہی کی رفیق ہے اور آزادی کے ساتھ کسی طرح نبھ نہیں سکتی۔ یا تو یہ آزادی کو مٹا کر رہے گی یا خود مٹا دی جائے گی۔ یہ تو ریاست کے صرف ایک طرز میں کھپ سکتی ہے یعنی فاشٹی طرز میں باقی رہنا ممکن ہے۔ ان کو توڑے بغیر حقیقی معنی میں کوئی نیا نظام تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ افراد کی حیثیت سے ان سروسوں کے لوگ اگر وہ نیا کام کرنا چاہتے ہوں اور کرنے کی استعداد رکھتے ہوں خوشی سے لے لئے جائیں گے، مگر نئی شرائط پر۔ اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں یہ لمبی چوڑی تنخواہیں اور الاؤنس جو آج کل ملتے ہیں دیئے جا سکیں گے۔ نئے ہندوستان کی خدمت کے لئے ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوگی جو مخلص اور مستعد ہوں، جو اپنے نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کے حاصل کرنے کی دل و جان سے کوششیں کرتے ہوں، جو کام اس لئے کرتے ہوں کہ اس سے مسرت اور عزت حاصل ہوتی ہے اس لئے نہیں کہ بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ روپے کے لالچ کو جہاں تک ہو سکے کم کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ سب سے کم مانگ ان انتظامی افسروں کی ہوگی جو کسی قسم کی فنی واقفیت نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ ہندوستان میں بہت نکل آئیں گے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہمارے لبرل پارٹی اور دوسری جماعتوں نے ہندوستان کے نظم و نسق کے معاملے میں برطانوی خیالات کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا ہے۔ سروسوں کے معاملے میں یہ بات خاص طور پر نمایاں ہے، کیونکہ ان حضرات کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ان میں ہندوستانی رکھے جائیں، یہ نہیں کہ ان سروسوں کی نوعیت اور ذہنیت اور ریاست کا سارا نظام بدلا جائے۔ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس میں دوسرے کی بات مان لینا ممکن نہیں، کیونکہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ

صرف برطانوی فوج اور سروسوں کے چلے جانے سے حل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ سرکاری ملازموں کی تحکم پسندی مٹائی جائے اور ان کی تنخواہ اور امتیازی حقوق عام طور پر کم کیے جائیں۔ اس دستور سازی کے زمانے میں تحفظات کا بڑا چرچا ہے۔ اگر یہ تحفظات ہندوستان کے فائدے کے لئے ہیں تو ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہونی چاہیے کہ آئی سی ایس اور اسی قسم کی دوسری سروسوں کی موجودہ صورت کا، جس میں انہیں غیر محدود اختیارات اور امتیازی حقوق حاصل ہیں خاتمہ کر دیا جائے اور انہیں نئے دستور میں کوئی دخل نہ ہو۔

آئی سی ایس سے بھی زیادہ پراسرار وہ سروسیں ہیں جو محافظ سروسیں کہلاتی ہیں۔ ہم ان کے بارے میں زبان بھی نہیں ہلا سکتے، اس لئے کہ بھلا ہم ان معاملات کو کیا جانیں؟ ہمارا کام تو صرف یہ ہے کہ چپ چاپ کروڑوں روپیہ دیئے جائیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے، ستمبر ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے کمانڈر ان چیف سر فلپ چیٹووڈ نے کونسل آف اسٹیٹ کے جلسے میں جو شملے میں ہو رہا تھا ہندوستان کے سیاست دانوں سے اپنی اکھڑ فوجی زبان میں کہا کہ تم لوگ اپنے کام سے کام رکھو میرے کام میں دخل نہ دو۔ کسی صاحب نے ایک رزولیوشن میں ترمیم پیش کی تھی، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا، کیا وہ اور ان کے دوست یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں جیسی جنگ آزمودہ قوم جس نے تلوار کے زور سے سلطنت حاصل کی اور تلوار ہی کے زور سے اس پر اب تک قابض ہے آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کی باتوں کو اپنی صدیوں کی جنگی قابلیت اور تجربے کے مقابلے میں کوئی وقعت دیگی؟ اس کے علاوہ انہوں اور دلچسپ باتیں کہیں اور اس خیال سے کہ کہیں ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ انہوں نے وقتی جوش میں یہ باتیں کہہ دی تھیں، ہم کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ انہوں نے اپنی تقریر بہت سوچ سمجھ کر لکھی تھی اور اسے دیکھ دیکھ کر پڑھ رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ناواقف فن کے لئے کسی کمانڈر ان چیف سے فوجی

معاملات پر بحث کرنا گستاخی ہے، لیکن دو چار باتیں کہنے کی اجازت تو آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کو بھی ملنی چاہیے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کی اغراض جو سلطنت پر تلوار کے زور سے قابض ہیں، کچھ اور ہوں اور ان غریبوں کی اغراض کچھ اور جس کے سر پر یہ تلوار منڈلاتی رہتی ہے۔ ہندوستانی فوج سے ہندوستان کے فائدے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اور برطانوی سلطنت کے فائدے کا بھی اور ان دونوں کا مفاد کچھ ضروری نہیں کہ ایک ہو۔ اس میں اختلاف بلکہ تصادم بھی ہوسکتا ہے کہ آرام کرسی پر بیٹھنے والا نقاد اس بات میں بھی شبہ کا اظہار کرسکتا ہے کہ جنگ عظیم کے تجربے کے بعد بڑے بڑے جرنیلوں کا یہ مطالبہ کہ ان کے کام میں دخل نہ دیا جائے جائز ہے یا نہیں۔ جنگ عظیم میں یہ حضرات سفید و سیاہ کے مالک تھے اور ہر طرف سے یہی سننے میں آتا ہے کہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، آسٹروی، اطالوی، روسی غرض تمام فوجوں میں انہوں نے ہر کام کو چوپٹ کردیا۔

انگلستان کی فوج کے نامور مورخ اور فن جنگ کے ماہر کیپٹن لڈل ہارٹ نے اپنی جنگ عظیم کی تاریخ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب انگریزی سپاہی دشمنوں سے لڑ رہے تھے اور انگریز جرنیل آپس میں لڑ رہے تھے۔ فوجی خطرے ان کے خیالات اور جدوجہد میں یک جہتی نہیں پیدا کرسکے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس لڑائی نے ہماری بت پرستی کو ہیرو ورشپ کے اس عقیدے کو کہ بڑے آدمی معمولی مٹی کے نہیں کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں بالکل مٹا دیا۔ لیڈروں کی اب بھی ضرورت ہے بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ، لیکن یہ احساس جو ہم میں اب پیدا ہوگیا ہے کہ وہ بھی ہمارے ہی جیسے آدمی ہیں ہم کو اس غلطی سے محفوظ رکھے گا کہ ان سے بہت زیادہ توقع رکھیں یا ان پر حد سے زیادہ بھروسہ کریں۔

سیاست دانوں کے جگت گرو مسٹر لائڈ جارج نے اپنے تذکرہ جنگ میں جرنیلوں اور امیر البحروں کی ان کمزوریوں اور غلطیوں کی ایک ہیبت ناک تصویر کھینچی

ہے جس کی بدولت لاکھوں آدمیوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ انگلستان اور اس کے اتحادی لڑائی تو جیت گئے لیکن خون میں نہا کر لڑکھڑاتے ہوئے فتح کی منزل تک پہنچے۔ بڑے افسروں نے آدمیوں اور موقعوں سے اس ناعاقبت اندیشی سے کام لیا کہ انگلستان کی تباہی کی نوبت آ گئی تھی اور وہ اور اس کے اتحادی زیادہ تر اس وجہ سے بچ گئے کہ ان حریفوں سے ان سے بھی زیادہ ناقابل یقین حماقتیں سرزد ہوئی ہیں۔ یہ ہے انگلستان کے عہد جنگ کے وزیراعظم کا بیان۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں عمل جراحی کے ذریعے امیر البحر لارڈ جیلیکو کی کھوپڑی میں معقول خیالات ٹھونسنے پڑے، خصوصاً بدرقہ جہاز بھیجنے کے معاملے میں۔ فرانسیسی مارشل ژوفرے کے متعلق ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا خاص وصف یہی تھا کہ ان کی صورت سے مستقل مزاجی ظاہر ہوتی تھی اور اس سے لوگوں کی ہمت بڑھتی تھی۔ پریشانی کے مارے ہوئے لوگ مصیبت کے وقت میں ایسی ہی چیزوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انسان کی عقل ٹھوڑی میں ہوتی ہے۔

لیکن مسٹر لائڈ جارج نے سب سے زیادہ قابل الزام فوج کے افسر اعلیٰ فیلڈ مارشل ہیگ کو قرار دیا ہے۔ انہوں نے واقعات سے ثابت کیا ہے کہ لارڈ ہیگ انتہائی خودپسندی کی وجہ سے سیاست دانوں اور دوسرے لوگوں کی رائے سننا بھی نہیں چاہتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے خود برطانوی مجلس وزرا سے بعض نہایت اہم معاملات پوشیدہ رکھے اور فرانس میں برطانوی فوج کو اتنا سخت نقصان پہنچایا جتنا ساری لڑائی میں کہیں نہیں پہنچا تھا اور اس وقت بھی جب شکست سر پر کھڑی تھی وہ آخر تک اپنی بات پر اڑے رہے اور کئی مہینے تک انہوں نے پاشدیل اور کامبرے کی بے پناہ کیچڑ میں اپنی غلط پیش قدمی جاری رکھی، یہاں تک کہ ۷ ہزار تو صرف افسر کام آئے اور چار لاکھ بہادر انگریزی سپاہی مقتولوں اور مجروحوں کی فہرست میں داخل ہو گئے۔ غنیمت ہے کہ گمنام سپاہی کی آج اس کے مرنے کے بعد عزت کی

جارہی ہے۔اس کا خون پانی کی طرح بہایا گیا اور جب تک وہ زندہ تھا کسی کو اس کی پرواہ بھی نہ تھی۔

دوسرے لوگوں کی طرح سیاست داں بھی اکثر غلطی کرتے ہیں، لیکن جمہوری ملک کے سیاست دانوں کو اشخاص اور واقعات سے متاثر ہونا اور ان کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔عموماً وہ اپنی غلطیوں کو محسوس کر لیتے ہیں اور ان کی تلافی کی کوشش کرتے ہیں۔ سپاہی کی تربیت اور ہی فضا میں ہوتی ہے۔ جہاں تحکم پسندی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اور تنقید گوارا نہیں کی جاتی۔اس لئے سپاہی کو دوسروں کا مشورہ برا لگتا ہے اور جب وہ غلطی کرتا ہے تو دل کھول کر کرتا ہے اور اس پر اڑا رہتا ہے۔اس کے لئے ٹھوڑی ذہن اور دماغ سے زیادہ اہم چیز ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ہم نے ایک مشترک ٹائپ پیدا کیا ہے۔ہمارے ملکی نظام حکومت نے تحکم پسندی اور خود بینی کی ایک نیم فوجی فضا میں پرورش پائی ہے۔اس لئے ملکی حکام کی ٹھوڑی بھی بڑی حد تک سپاہیوں کی سی ہے اور ان میں دوسرے سپاہیانہ اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ فوج میں ہندوستانی عنصر بڑھایا جارہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ تیس پینتیس برس کے بعد کوئی ہندوستانی جنرل بھی ہندوستانی اسٹیج پر نمودار ہو۔ شاید سو سوا سو سال میں ہماری فوج میں ہندوستانی عنصر ایک معقول حد تک بڑھ جائے۔ہم یہ سوچتے ہیں کہ آخر انگلستان نے ایک دو سال کے اندر کروڑوں آدمیوں کی زبردست فوج کیسے تیار کر لی۔اگر اسے ہمارے جیسے دانا مشیر نصب ہوئے ہوتے تو شاید اس نے زیادہ احتیاط سے اور پھونک پھونک کر قدم رکھا ہوتا، یہ اور بات ہے کہ اس اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کے تیار ہونے سے پہلے لڑائی کا فیصلہ ہو جاتا۔اسی کے ساتھ ہمیں روسی فوج کا بھی خیال آتا ہے جو کچھ دن پہلے صفر کے برابر تھی جس نے تھوڑی سی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی بے شمار دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ان پر فتح پائی اور اب دنیا کی سب سے جرار فوجوں میں سمجھی جاتی ہے۔شاید انہیں

مشورہ دینے کے لئے ایسے جنگ آزمودہ جرنیل نہیں ملے تھے۔

اب ہمارے یہاں دہرہ دون میں ایک فوجی اکادمی ہے جہاں شریف خاندانوں کے امیدوار فوجی افسر کی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ہم سے کہا جاتا ہے کہ پریڈ میں وہ بہت ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور یقیناً بہت اچھے افسر ہوں گے لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس ٹریننگ سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔اگر اسی کے ساتھ جدید آلات جنگ کا استعمال بھی نہ سکھایا جائے۔ پیادے اور سوار آج کل نئے اتنے ہی کام آسکتے ہیں جتنی رومی لشکر کی صفیں اور ایسے زمانے میں جب کی ہوائی جہاز، گیس کے بم، ٹینک اور بڑی زبردست توپیں جنگ کے آلات ہیں، رائفل بھی تیر کمان سے کچھ ہی زیادہ کارآمد ہوسکتی ہے۔فوجی اکادمی کے استاد اور دانشمند مشیران سب باتوں کو سمجھتے ہی ہوں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگذاری کیسی رہی؟ ہم اس کی خامیوں کی کس منہ سے شکایت کریں، جب یہ خامیاں ہماری اپنی کمزوریوں کا نتیجہ تھیں۔اگر ہم دنیا کے تغیرات کے دھارے کو چھوڑ کر کسی کھاڑی میں پناہ لیں، اپنے قدح کی خیر منائیں اور اپنی حالت میں مگن رہیں کنویں کے مینڈک کی طرح یہ نہ جانیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے تو یہ ہمارا ہی قصور ہے اور ہمیں کو اس کی سزا بھگتنی ہے۔انگریز یہاں بحر ہستی کے ایک نئے سیلاب کے زور میں، زبردست تاریخی قوتوں کے نمائندے بن کر آئے اگر چہ انہیں خود اس کا احساس نہ تھا۔اس سے کیا فائدہ کہ ہم اس طوفان کی شکایت کریں جو ہمیں اٹھا کر پھینک دیتا ہے یا اس سرد ہوا کی جس سے ہمارا بدن کانپتا ہے؟ ہمیں چاہیے کہ ماضی کے جھگڑوں سے پیچھا چھڑا کر مستقبل کا سامنا کریں۔ہمیں انگریزوں کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ وہ سائنس اور اس کی بیش بہا ایجادات کا تحفہ اپنے ساتھ لائے۔لیکن یہ بات ہمارے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور ہم اسے کبھی نہیں بھول سکتے کہ

برطانوی حکومت ہمارے ملک میں تفرقہ پیدا کرنے والے رجعت پسند، فرقہ پرست اور مطلب پرست عناصر کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مگر شاید یہ بھی ہمارے لئے ایک ضروری آزمائش ہے اور ہندوستان کو نئی زندگی اسی وقت عطا ہوگی جب وہ بار بار اس آگ میں تپے جو کھوٹ اور میل کو جلا دیتی ہے اور کچے لوہے کو فولاد بنا دیتی ہے۔

ا۔ یہ اقتباس ہندوستان کے دستور کی اصلاح کے متعلق جو مشترک پارلی منٹر کمیٹی بنی تھی۔ اسی کی رپورٹ میں سے لئے گئے تھے۔

۲۔ مشترک پارلیمینٹری کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۳۴ء

۳۔ یہ اقتباسات ایک امریکی شاعر مارک ہیم کی نظم 'پھاوڑے والے'' سے لیے گئے ہیں۔

سول میرج اور رسم الخط کا مسئلہ

میں تقریباً ایک ہفتہ پونا اور بمبئی رہ کر وسط ستمبر ۳۳ء میں لکھنو واپس آیا، والدہ ابھی تک ہسپتال ہی میں تھیں اور رفتہ رفتہ صحت یاب ہو رہی تھیں۔ کملا بھی لکھنو میں تھی، اور تیمارداری کی کوشش کرتی تھی حالانکہ خود اس کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، بہنیں ہر سنیچر کو الہ آباد سے آجاتی تھیں، میں دو تین ہفتے لکھنو ہی میں رہا، الہ آباد میں شاید اتنی فرصت نہ ملتی جتنی یہاں نصیب ہوئی، میں دن میں دوبار اسپتال جایا کرتا تھا۔ فارغ اوقات میں اخبارات کے لئے چند مضامین لکھنا شروع کردیئے جن کی اشاعت سارے ملک میں خوب ہوئی۔ اس سلسلہ مضامین کا عنوان تھا ہندوستان کدھر جارہا ہے اور ان مضامین میں، میں نے واقعات عالم کا تعلق ہندوستانی حالات سے بتا کر ان واقعات کا جائزہ لیا تھا۔ یہ مضامین بہت مقبول ہوئے بلکہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کابل اور طہران میں بھی ان مضامین کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع کیا گیا۔ جو لوگ حالات حاضرہ اور جدید مغربی افکار اور خیالات سے واقف ہیں ان کے لئے ان مضامین میں نہ کوئی ندرت تھی نہ کوئی جدت۔ لیکن ہندوستان میں ہم لوگ اپنی خانگی مشکلات اور مصائب میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ ہمیں مطلق خبر نہیں، کہ دوسرے ملکوں پر کیا گزری ہے۔ میرے مضامین کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے نیز بہت سی اور علامتوں سے یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگوں میں بھی زیادہ وسیع نقطہ نظر اب پیدا ہو رہا ہے۔

والدہ اسپتال میں رہتے رہتے عاجز آگئی تھیں۔ اس لئے ہم لوگوں نے انہیں الہ آباد واپس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری بہن کرشنا کی نسبت کا اعلان حال ہی میں ہو چکا تھا اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ قبل اس کے کہ میں اچانک پھر جیل خانہ پہنچا دیا جاؤں جس قدر جلد ممکن ہو شادی سے فراغت کرلی جائے۔ مجھے بھی مطلق اس کا اندازہ نہ تھا کہ کتنے دن اور مجھے آزاد رہنے دیا جائے گا، اس لئے کہ

کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک باقاعدہ جاری تھی اور خود کانگریس اور اس کے علاوہ بیسیوں دیگر انجمنیں اور ادارے خلاف قانون قرار دیئے جا چکے تھے۔

شادی اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں بمقام الہ آباد قرار پائی اور یہ بھی طے ہوا کہ مروجہ سول قانون نکاح کے مطابق عقد کیا جائے۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم لوگوں کے طے کرنے نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دو مختلف ذاتوں یعنی برہمن اور غیر برہمن کے درمیان رشتہ قائم کیا جا رہا تھا اور برطانوی ہندی قانون کے مطابق یہ عقد جائز نہیں، لیکن خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں ایک نیا سول نکاح کا قانون بنا تھا، جس نے ہمیں تمام پریشانیوں سے بچا لیا۔ اس وقت دو قانون رائج ہیں اور دوسرا قانون جس کے مطابق میری بہن کی شادی ہوئی، صرف ہندوؤں یا اس قبیل کے دیگر مذاہب مثلاً بدھ مت، جین اور سکھ مت والوں کے لئے ہے لیکن اگر فریقین کا شمار بوجہ پیدائش یا بوجہ تبدیلی دین ان مذاہب میں نہیں ہو سکتا تو پھر پہلے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے اور یہ پہلا قانون فریقین سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام مشہور مذاہب سے انکار کریں یا کم از کم یہ بیان داخل کریں کہ ان کا تعلق ان سے نہیں ہے۔ یہ بلا ضرورت انکار بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے اور اکثر لوگ جنہیں گو مذہبی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن وہ اس قسم کا غیر ضروری اعلان کرنے پر معترض ہوتے ہیں، اس قانون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے یا مختلف مذاہب کے اکثر لوگ ان تمام باتوں کی مخالفت کرتے ہیں جن سے آپس کے شادی بیاہ میں آسانیاں پیدا ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مجبور ہو کر یا تو انکاری بیان داخل کرتے ہیں یا محض حدود قانون میں رہنے کی خاطر صرف زبان سے تبدیلی مذہب کا اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں تو مختلف فرقوں کے درمیان شادی بیاہ کا حامی ہوں، لیکن خواہ اس کی کوئی حمایت کرے یا نہ

کرے یہ بے حد ضروری ہے کہ سول نکاح کا ایک عام قانون ہو جس کا اطلاق تمام مذاہب کے لوگوں پر ہو اور ان کو اجازت دی جائے کہ مذہب کی تبدیلی یا کسی دین کو ترک کرنے کا اعلان کئے بغیر آپس میں شادی بیاہ کر سکیں۔

میری بہن کی شادی بغیر کسی دھوم دھام کے نہایت سادے طریقے سے ہوئی۔ ہندوستان میں شادیوں کے موقع پر جو بکھیڑا اور دھوم دھام ہوتی ہے وہ مجھے یوں بھی ناپسند ہے۔ پھر والدہ بیمار تھیں اور علاوہ اس کے سول نافرمانی ابھی جاری تھی، میرے بہت سے ساتھی جیل خانہ میں تھے، ان حالات میں کوئی ایسی بات کرنا جس سے جشن کی صورت پیدا ہو بے موقع اور نامناسب تھی، صرف چند اعزا اور مقامی دوستوں کو شرکت کی دعوت دی حالانکہ میرے والد کے بعض قدیم دوستوں کو بجا طور پر یہ ملال بھی ہوا کہ میں نے انہیں اس موقع پر عمداً نظر انداز کیا۔

شادی کے سلسلہ میں نیوتہ کا جو مختصر سا خط ہم لوگوں نے بھیجا وہ ہندوستانی زبان اور لاطینی رسم الخط میں لکھا گیا تھا، یہ ایک جدت تھی اس لئے کہ نیوتے ہمیشہ یا ناگری یا فارسی رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں اور علاوہ فوجی یا عیسائی مشنری حلقوں کے کسی جگہ لاطینی رسم الخط میں ہندوستانی زبان لکھنے کا بالکل رواج ہی نہیں۔ میں تجربہ کے طور پر لاطینی رسم الخط اختیار کیا تھا، محض یہ دیکھنے کے لئے کہ مختلف لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس نیوتے کے متعلق موافق اور مخالف دونوں طرح کی رائیں معلوم ہوئیں لیکن زیادہ لوگ مخالف ہی تھے۔ بہت تھوڑے لوگ بلائے گئے تھے، اگر اور زیادہ لوگوں کو یہ نیوتہ بھیجا جاتا تو مخالفت بھی اور زیادہ ہوتی۔ گاندھی جی نے بھی میری اس جدت کو ناپسند کیا۔

گو لاطینی رسم الخط مجھے ایک عرصہ سے پسند ہے لیکن نہ میں اس کا قائل ہوں اور اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا تھا۔ ترکی اور وسط ایشیاء میں اس کی کامیابی سے میں متاثر ضرور ہوا اور اس کی تائید میں دلائل بھی خاصے وزنی ہیں، لیکن اس کے

باوجود میں اس کا حامی نہیں ہوں اور اگر میں اس کا قائل بھی ہوتا تو بھی میں خوب جانتا تھا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کو اختیار کرنے کا ذرہ برابر امکان نہیں ہے۔قوم پرست، مذہب پرست، ہندو، مسلمان قدیم اور جدید غرض ہر گروہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت کی جائے گی اور یہ بھی میں جانتا ہوں کہ یہ مخالفت محض جذباتی نہیں ہوگی۔رسم الخط کا اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہے۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم اب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے، جس زبان میں کوئی ایسا ادب موجود نہیں کہ اس کی حفاظت کی ضرورت ہو وہاں البتہ یہ تبدیلی کر کے دیکھ لینا چاہیے لیکن ہندوستان میں رسم الخط تبدیل کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔نہ صرف اس لئے کہ ہمارے ادب اور زبان کا خزانہ بے حد گراں قدر اور انمول ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ہماری تاریخ اور ہماری ذہنی ترقی اس سے وابستہ ہے نیز عوام الناس کی زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔زبردستی اس قسم کی تبدیلی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی زندہ زبان کو بے رحمی سے ذبح کرنا چاہتے ہیں جس سے عوام الناس کی تعلیمی ترقی بالکل مسدود ہو جائے گی۔

لیکن ہندوستان میں یہ مسئلہ اب صرف ایک علمی مسئلہ نہیں ہے اور میرے نزدیک رسم الخط کی اصلاح کے سلسلہ میں دوسرا قدم یہ ہوگا کہ سنسکرت کی مختلف شاخوں یعنی ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔اس لئے ایک مشترکہ رسم الخط کی اصل ایک ہے اور ان میں بہت زیادہ اختلاف بھی نہیں ہے اس لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کر لینا زیادہ دشوار نہ ہوگا

جس کی بدولت یہ چاروں زبانیں ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں۔

منجملہ دیگر افسانوں کے ایک یہ افسانہ بھی ہمارے انگریز حکمرانوں نے تمام دنیا میں مشہور کررکھا ہے کہ ہندوستان میں کئی سو زبانیں (مجھے تعداد اس وقت یاد نہیں ہے!) رائج ہیں اور یہ بھی ایک عجیب دلچسپ واقعہ ہے کہ بہت تھوڑے انگریز ایسے ملیں گے جو تمام عمر ہندوستان میں گزار دینے کے باوجود ان سینکڑوں زبانوں میں سے ایک زبان بھی معمولی طور پر جانتے ہوں۔ یہ لوگ تمام زبانوں کو ایک ہی درجہ میں شمار کرتے ہیں۔اس کا نام ورنا کولر یعنی غلاموں کی زبان رکھا ہے (لاطینی زبان میں ورنا کے معنی ہیں خانہ زاد غلام) اور ہم میں سے اکثر لوگوں نے بغیر جانے بوجھے اس اصطلاح کو اختیار کرلیا ہے۔واقعی یہ حیرت کی بات ہے کہ یہ انگریز ساری ساری عمر ہندوستان میں گزار دیتے ہیں لیکن ہماری زبان اچھی طرح سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، ان لوگوں نے خانساموں اور آیاؤں کی مدد سے ایک عجیب زبان ایجاد کی ہے جو ایک طرح کی گٹ پٹ گوراشاہی ہندوستانی ہے یہ اسی کو اصل زبان سمجھتے ہیں۔ جیسے ہندوستان کی طرز معاشرت اور زندگی کے متعلق وہ اپنے ماتحتوں اور خوشامدیوں کی باتوں سے حالات معلوم کرتے ہیں اسی طرح ہندوستانی زبان کے متعلق بھی ان کی معلومات کا واحد ذریعہ گھر کے نوکر اور بیرے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اپنی زبان توڑ مروڑ کر صاحب لوگوں سے انہیں کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بات چیت کرتے ہیں، اس خیال سے کہ کوئی اور زبان صاحب سمجھ ہی نہیں سکتے۔ انگریز لوگوں کو یہ بالکل معلوم ہی نہیں کہ ہندوستانی زبان میں نیز دیگر ملکی زبانوں میں ہر قسم کا اعلیٰ ادب موجود ہے۔

اگر ہمیں مردم شماری کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں دو تین سو زبانیں ہیں تو اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں بھی پچاس ساٹھ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن میں تو یہ نہیں جانتا کہ کسی شخص نے بھی اس واقعہ کو جرمنی کے اندر

اختلافات اور جھگڑوں کے ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل کے پیش کیا ہو؟ اصل بات یہ ہے کہ مردم شماری میں تو ہر قسم کی ان چھوٹی چھوٹی زبانوں کو بھی گنوا دیا جاتا ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی اور بسا اوقات ایک ہی زبان کی مختلف بولیوں کو جو مقامی طور پر بولی جاتی ہیں محض علمی ترتیب کی خاطر اصل زبان کے درجہ میں شمار کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی وسعت اور رقبہ کو دیکھتے ہوئے مجھے تو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ یہاں اتنی کم زبانیں کیوں ہیں۔ یورپ کے اسی رقبہ آبادی سے مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ یہاں باعتبار زبان ایک دوسرے سے بہت قریب تر ہیں۔ لیکن چونکہ بے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لئے کوئی مشترکہ معیاری زبان نہیں پیدا ہوسکی اور مقامی بولیاں رائج ہو کر رہ گئیں، برما کو چھوڑ کر ہندوستان کی خاص خاص زبانیں یہ ہیں۔ ہندوستانی (جس کی دو شاخیں ہیں یعنی اردو اور ہندی) بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلنگو، ملیالم، اور کناری اور اگر اس میں آسامی، اوڑیا، سندھی، پشتو، اور پنجابی کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس پورے ملک کی زبانیں آجاتی ہیں سوائے چند پہاڑی اور جنگلی قبائل کی بولیوں کے اس میں سے ہندی آریائی نسل کی تمام زبانیں جو شمالی، مغربی اور وسطی ہند میں بولی جاتی ہیں ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں، البتہ جنوبی ہند کی درواڑی زبانیں گو بہت مختلف ہیں لیکن اس پر بھی سنسکرت کا بہت اثر پڑا ہے اور یہ بھی سنسکرت لفظوں سے بھری پڑی ہیں۔

مندرجہ بالا آٹھ خاص زبانوں کا ادب بہت قدیم اور گرانقدر ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک زبان آج ایک بہت وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے۔ ہر لسانی علاقے کے حدود بھی متعین طور پر بتلائے جاسکتے ہیں، چنانچہ یہ زبانیں بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ۵ کروڑ آدمی بنگالی بولتے ہیں، جہاں تک ہندوستانی کا تعلق ہے مجھے صحیح اعداد تو یاد نہیں

پڑے لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیوں کے بولنے والوں کی تعداد ۱۴ کروڑ سے کم نہیں، اس کے علاوہ اس زبان کے تھوڑا بہت سمجھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اور ہے جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہیں۔ یہ سنسکرت زبان کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے اور فارسی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہے، چنانچہ دونوں زبانوں کے خزانوں سے یہ مالا مال ہوسکتی ہے اور اب تو کچھ عرصہ سے انگریزی زبان سے بھی اس نے استفعادہ کیا ہے، جنوبی ہند میں صرف دراوڑی علاقہ ہی ایسا ہے جہاں ہندوستانی زبان تقریبا ایک اجنبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے لیکن وہاں بھی لوگ اس کو سیکھنے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ دو سال ہوئے ۳۳ء میں ایک انجمن نے جو محض خدمت کی غرض سے جنوبی ہند میں ہندی زبان پھیلانے کا کام کر رہی ہے چند اعداد و شمار شائع کئے تھے، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ ۱۴ سال کے اندر جب سے کہ وہ انجمن قائم ہوئی تقریبا ساڑھے پانچ لاکھ آدمیوں نے محض اس انجمن کی کوشش سے احاطہ مدراس کے اندر ہندی زبان سیکھ لی۔ ایک ایسے ادارے کی کوشش جو کو سرکار کی طرف سے کوئی مدد نہ ملے بہت قابل تعریف ہے۔ اکثر لوگ جو ہندی زبان سیکھ لیتے ہیں وہ خود بھی اس زبان کی تبلیغ کا کام کرنے لگتے ہیں۔

بہر حال مجھے تو اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی آگے چل کر پورے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن جائے گی، اور سچ پوچھئے تو آج بھی معمولی کاموں کے لئے اس زبان کی حیثیت یہی ہے، لیکن فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے متعلق احمقانہ جھگڑوں کی وجہ سے اور فریقین کی اس غلط روش کی وجہ سے کہ ہر ایک یا تو اپنی زبان میں سنسکرت کے الفاظ ضرورت سے زائد ٹھونستا ہے یا فارسی کے الفاظ، اس زبان کی ترقی رک گئی ہے۔ چونکہ اس جھگڑے کی وجہ سے بڑا غصہ اور گرمی پیدا ہوتی ہے اس لئے رسم الخط کی مشکل حل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

سوائے اس کے کہ دونوں کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ اورلوگوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ جس خط میں وہ چاہیں لکھیں۔ لیکن یہ کوشش ضرور کرنا چاہئے کہ انتہا پسندی کے رجحانات کو روکا جائے اور بول چال کی زبان جو عام طور پر رائج ہے اسی طرح کی ایک ملی جلی ادبی زبان پیدا کی جائے، جب تعلیم عام ہوگی تب تو لازماً اس کا نتیجہ یہی نکلے گا، لیکن اس وقت متوسط طبقے کے کچھ لوگ جو ادبی ذوق اور طرز انشاء کے ناقد اور استاد سمجھے جاتے ہیں بدقسمتی سے بہت زیادہ تنگ نظر اور لکیر کے فقیر واقع ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بس ایک مردہ قالب اور فرسودہ زبان کے محاوروں میں الجھے ہوئے ہیں جس میں نہ کوئی زندگی ہے نہ اپنی قوم کے عوام الناس کی زبان ہے اور نہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے کوئی واسطہ۔

ہندوستانی زبان کی ترقی اور رواج میں کوئی تصادم نہ ہوگا۔ ان میں بعض زبانیں ہندوستانی زبان کے مقابلے میں پہلے ہی سے زیادہ ترقی یافتہ اور علمی حیثیت سے افضل ہیں اور اپنے اپنے علاقے میں ان زبانوں کی تعلیمی و دیگر کاموں کے لئے سرکاری زبان کی حیثیت برقرار رکھنا چاہیے، انہیں زبانوں کے ذریعہ تعلیم اور تمدن عوام الناس میں پھیلایا جاسکتا ہے۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ شاید انگریزی ہندوستان کی مشترکہ عام زبان بن جائے گی۔ لیکن مجھے تو یہ خیال بالکل دور دراز کا اور لغو معلوم ہوتا ہے اعلیٰ طبقہ کے مٹھی بھر پڑھے لکھے لوگوں میں ممکن ہے کہ یہ زبان رائج ہو۔ لیکن جہاں تک عوام الناس کی تعلیم اور ان کے تمدنی مسائل کا تعلق ہے۔ انگریزی زبان ہمارے لئے محض بے کار ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی زبان کا استعمال کاروباری ضروریات، علمی اور فنی کاموں میں بالخصوص بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں روز بروز بڑھتا جائے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہم میں سے کچھ لوگوں کے لئے بدیسی زبانوں کا جاننا ضروری ہے تاکہ دنیا کے حالات اور واقعات سے ہم لوگ باخبر رہیں، اس لئے میں چاہتا

ہوں کہ یونیورسٹیوں میں علاوہ انگریزی کے فرانسیسی، جرمنی، روسی، اسپینی اور اطالوی زبانیں سکھانے کا بھی انتظام کیا جائے۔انگریزی زبان سے بے توجہی ہرگز نہ برتی جائے، لیکن اگر واقعات عالم کے متعلق ہم صحیح رائے قائم کرنا چاہتے ہیں تو صرف انگریزی کی عینک لگا کر نہ دیکھنا چاہئے۔ایک ہی پہلو اور ایک ہی رجحان فکر کو دیکھتے دیکھتے ہماری ذہنی اور دماغی صلاحیتیں بالکل چوپٹ ہوگئی ہیں اور ہمارے بڑے بڑے جوشیلے قوم پرست مشکل ہی سے یہ محسوس کرسکتے ہیں کہ ہندوستانی معاملات کے متعلق برطانوی نقطہ نظر نے ہمارے لئے غوروفکر کا میدان کتنا محدود اور تنگ کر دیا ہے۔

بہر حال دوسری بدیسی زبانوں کو رواج دینے کی چاہے جو کوشش کی جائے بیرونی دنیا کے ساتھ ہمارا رشتہ اور تعلق یقیناً انگریزی زبان کے ذریعہ قائم رہے گا اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔گزشتہ کئی نسلوں سے ہم لوگ اس زبان کو سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں ہمیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے، ہم لوگ سخت حماقت کریں گے اگر اس زبان کو بھلانا چاہیں یا اس سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھائیں۔یوں بھی انگریزی زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جو تمام دنیا میں پھیل گئی ہے اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بازی لئے جارہی ہے۔اور اگر امریکن زبان نے اس کی جگہ نہ لی تو اغلب ہے کہ بین الاقوامی تعلقات اور ریڈیو کی بات چیت میں اس کا رواج روز بروز بڑھتا جائے گا، اس لئے ہم لوگوں کو چاہئے کہ انگریزی زبان کی اشاعت کی کوشش برابر جاری رکھیں، اس زبان کو جتنا اچھی طرح سیکھ سکتے ہیں سیکھنا اچھا ہے۔لیکن میرے نزدیک یہ کوشش جو ہم میں سے اکثر لوگ کرتے ہیں کہ زبان کے نکات اور باریکیوں کو سمجھیں، تضیع اوقات ہے۔ چند افراد اگر ایسا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔لیکن ایک بہت بڑی تعداد کے سامنے یہ مقصد اگر رکھا جائے تو ان پر خواہ مخواہ کا ایک بوجھ ڈالنا ہوگا اور اس سے دوسری راہوں میں ترقی مسدود

ہو جائے گی۔

مجھے بنیادی انگریزی بہت پسند آئی ہے اور میرا خیال ہے کہ انگریزی زبان کی اس سہل کی ہوئی شکل کے سامنے بڑا اچھا مستقبل ہے اور ہم لوگوں کے لئے یہ مفید ہوگا کہ بجائے معیاری انگریزی زبان کے یہ بنیادی انگریزی سکھلانے اور پڑھانے کا کام وسیع پیانہ پر شروع کریں۔ معیاری انگریزی صرف محققوں اور خاص خاص طالب علموں کے لئے رہنے دی جائے۔

ذاتی طور پر میں اس کا بھی حامی ہوں کہ ہندوستانی بنا کر داخل کیا جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے یہاں جدید اصطلاحیں بالکل نہیں ہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ معروف الفاظ ہی کو اختیار کیا جائے بہ نسبت اس کے کہ نئے اور مشکل الفاظ سنسکرت، فارسی اور عربی زبانوں کے نکالے جائیں۔ خالص زبان کے حامی بدیسی الفاظ کے استعمال پر معترض ہوتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، اس لئے کہ اپنی زبان کو ترقی دینے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس میں لچک اور دوسری زبانوں کے الفاظ اور خیالات حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

بہن کی شادی کے بعد ہی مجھے اتفاق سے بنارس جانا پڑا۔ وہاں میرے پرانے دوست اور رفیق کار بابو شیو پرساد گپتا تقریباً ایک سال سے بیمار تھے اور میں ان کی عیادت کی غرض سے وہاں گیا تھا۔ بابو صاحب لکھنؤ کے جیل میں تھے کہ وہیں اچانک ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اب رفتہ رفتہ مرض کا ازالہ ہو رہا تھا، بنارس کے اس سفر میں ایک چھوٹی سی ہندی ادبی انجمن نے مجھے ایک سپاس نامہ دیا اور اس انجمن کے اراکین سے میری بڑے مزے سے گفتگو رہی۔ میں نے پہلے تو معذرت کی کہ جس مضمون کو میں نہیں جانتا اس مضمون کے متعلق ماہرین کے سامنے بات چیت کرتے ہوئے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے مگر بالآخر میں نے اپنی چند تجاویز ان کو بتلائیں اور میں نے مروجہ قدیم طرز کی ہندی پر اعتراض کیا جو اس وقت لکھی جاتی

ہے جس میں یا تو سنسکرت کے مشکل الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے یا ایسی پر تکلف اور پیچیدہ زبان ہوتی ہے جس کو کوئی نہ سمجھے، میں نے یہ خیال بھی جرات کر کے ظاہر کیا کہ اس درباری طرز نشاء کو ترک کرنا چاہیے جس کے مخاطب صرف چند منتخب لوگ ہی ہو سکتے ہیں اور اب ہندی لکھنے والوں کو عوام الناس کے لئے لکھنا چاہئے جس کو سب لوگ سمجھ سکیں۔ عوام کے ساتھ تعلق پیدا ہو جانے سے زبان میں ایک طرح کی صداقت اور زندگی پیدا ہو جائے گی اور ادیبوں میں بھی عوام کی جذباتی قوت کا کچھ اثر آئے گا۔ اور وہ زیادہ بہتر کام انجام دے سکیں گے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندی مصنف مغربی افکار و خیالات اور ادب کا اور زیادہ مطالعہ کریں تو اس سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور یہ بھی مفید ہوگا اگر مغربی زبان کی مستند کتابوں کا نیز ایسی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے جن میں جدید خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اس نقطہ نظر سے ہندی کے مقابلہ میں جدید بنگالی، گجراتی، اور مرہٹی زبانیں غالبا زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور یہ تو یقینی ہے کہ بمقابلہ ہندی کے بنگالی زبان میں تخلیقی کام اس زمانہ میں بہت کیا گیا ہے۔

غرض ان مسائل پر دیر تک دلچسپ گفتگو اور بات چیت ہوئی اور پھر میں چلا آیا۔ مجھے اس کا گمان نہ تھا کہ میری گفتگو اخبارات کو بھیج دی جائے گی۔ لیکن کوئی صاحب جو وہاں موجود تھے انہوں نے ایک رپورٹ ہندی اخبارات میں بھیج دی۔

پھر کیا تھا، ہر طرف سے میرے خلاف ہندی اخبارات میں ایک آفت مچ گئی کہ مجھے محض مغالطہ ہے۔ میں نے کیوں ہندی زبان کو برا بھلا کہا اور بنگالی، گجراتی اور مرہٹی کا مقابلہ کر کے ہندی زبان کی تنقیص کی۔ مجھے جاہل مطلق کہا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے میں واقعی جاہل ہوں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سخت سست الفاظ میرے متعلق کہے گئے۔ تاکہ مجھے دبایا جائے اور میری زبان

بند کردی جائے۔

میرے پاس تو اتنا وقت تھا نہیں کہ اس بحث و مباحثہ کو پڑھتا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ کئی مہینے تک یہ بحث جاری رہی یہاں تک کہ میں پھر جیل خانہ چلا گیا۔

اس واقعہ سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ اس سے معلوم ہوا ہندی ادیب اور اخبار نویس غیر معمولی طور پر زود رنج ہوتے ہیں اور اگر ان کا کوئی بھی خواہ دیانتداری کے ساتھ تنقید کرے تو اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ خود کو ذلیل اور کمتر سمجھنے کے مرض میں مبتلا ہیں، خود اپنی تنقید کرنے کا ان میں بالکل مادہ نہیں، عام تنقید کا معیار بہت پست ہے اور بالعموم یہ ہوتا ہے کہ مصنف اور اس کے ناقد میں جھگڑا ہونے لگتا ہے اور ایک دوسرے کی نیت پر حملہ کرتا ہے۔ ان کی ساری ذہنیت وہی محدود اور تنگ بورژوا (سرمایہ دار) طبقہ والوں کی ذہنیت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اور اخبار نویس دونوں یا تو ایک دوسرے کے لئے لکھتے ہیں یا ایک مختصر سے حلقہ کے لئے اور عوام الناس کو نیز ان کے وسیع مفاد کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مجھے اس پر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف بے کار اتنی محنت ضائع کی جا رہی ہے اور دوسری طرف اتنا وسیع میدان عمل موجود ہے جو مفید کام کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

ہندی ادب کا ماضی بہت شاندار رہا ہے، لیکن اپنے ماضی پر وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا، مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بھی بہت شاندار رہا ہے، اور ہندی صحافت اس ملک میں ایک بہت زبردست قوت بن سکتی ہے۔ لیکن جب تک عوام الناس کو بے دھڑک مخاطب نہ کیا جائے اور رسمی زبان کی پابندیوں سے آزادی حاصل نہ کی جائے۔ اس وقت تک نہ صحافت ترقی کر سکتی ہے نہ ادب۔

فرقہ پرستی اور رجعت پسندی

جس زمانہ میں میری بہن کی شادی تھی اسی زمانہ میں یورپ سے یہ خبر آئی کہ وٹھل بھائی پٹیل کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک عرصہ سے بیمار تھے اور اسی علالت کی وجہ سے ان کو قید خانہ سے رہا کردیا گیا تھا۔ ان کی موت ہم لوگوں کے لئے ایک اندوہناک سانحہ تھا اور یہ خیال کرکے دل بیٹھا جاتا تھا کہ ہماری جدوجہد ابھی جاری ہے اور ہمارے مقتدر رہنما ایک ایک کرکے دنیا سے اٹھتے چلے جارہے ہیں۔ وٹھل بھائی کی تعریف میں یوں تو بہت کچھ کہا گیا لیکن سب سے زیادہ تعریف اس بات کی گئی کہ ہندوستانی پارلیمنٹ میں انہوں نے اپنی قابلیت کا سکہ جمایا اور اسمبلی کے صدر کے حیثیت سے وہ بہت کامیاب رہے۔ یہ تعریفیں اپنی جگہ بالکل درست تھیں لیکن جب بار بار ان کا ذکر کیا جاتا تھا تو مجھے اس سے چڑ ہونے لگی کہ کیا ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کچھ کمی ہے جو اسمبلی کی صدارت کے فرائض قابلیت کے ساتھ انجام دے سکیں یا جو پارلیمینٹ کی رکنیت کے اہل ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ لے دے کے صرف یہی ایک کام ہے جس کے لئے وکالت کے پیشہ نے ہم کو تیار کیا ہے اور میرے نزدیک وٹھل بھائی کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ بلند تھی، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک بہت بڑے سورما اور سپاہی تھے۔

نومبر کے مہینے میں مجھے بنارس جانے کا اتفاق ہوا۔ ہندو یونیورسٹی کے طلباء نے مجھے تقریر کرنے کی دعوت دی میں نے اس دعوت کو قبول کرلیا اور ایک بہت بڑے جلسے میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت مدن موہن مالویہ کی زیر صدارت میں نے تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران میں فرقہ پرستی کے متعلق بہت کچھ کہا اور پر زور الفاظ میں ہر قسم کی ذہنیت کی مذمت کی۔ بالخصوص ہندو مہاسبھا کی حرکتوں کو میں نے بہت برا کہہ ڈالا۔ لیکن میں نے جو کچھ کہا اس میں پہلے سے سوچ بچار کو زیادہ دخل نہ تھا۔ ایک مدت سے مختلف جماعتوں کے فرقہ پرستوں کی روز افزوں رجعت

پسندی کو دیکھ دیکھ کر مجھے غصہ آتا تھا اور اس موضوع پر تقریر کرتے وقت جب مجھے جوش آیا تو قدرتاً اس غصہ کا بھی کچھ اظہار ہو گیا۔ میں اس وقت ہندوؤں کے جلسہ میں تقریر کر رہا تھا، اس لئے مسلمانوں کے اعمال کی مذمت کرنے کا یہ کوئی موقع نہ تھا اور میں نے عمداً صرف ہندو فرقہ پرستوں کی رجعت پسندی پر زیادہ زور دیا، مگر تقریر کرتے وقت مجھے یہ خیال نہ آیا کہ مالوی جی جلسہ کی صدارت کر رہے ہیں۔ وہ ہندو مہا سبھا کے رکن رکین رہے ہیں اس لئے ان کے منہ پر مہا سبھا کو یہ باتیں سنانا ذرا نامناسب بات تھی۔ ممکن ہے کہ یہ خیال مجھے اس لئے نہ رہا ہو کہ اس زمانہ میں انہیں مہا سبھا سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہا سبھا کہ نئے تیز مزاج لیڈروں نے انہیں مہا سبھا سے نکال باہر کر دیا ہے۔ جب تک مالوی جی مہا سبھا کی روح رواں رہے اس وقت تک مہا سبھا باوجود اپنی فرقہ پرستی کے سیاسی حیثیت سے رجعت پسند نہیں ہوئی تھی، لیکن بعد میں چل کر اس کی رجعت پسندی سب کے لئے ایک مسلم اور امتیازی خصوصیت بن گئی تھی اور مجھے اپنی جگہ یہ یقین تھا کہ مالوی جی کو اس سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہیں، پھر بھی مجھے بعد میں یہ محسوس ہوا کہ میرے لئے یہ کسی طرح بھی مناسب نہ تھا کہ انکی دعوت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایسی باتیں کہوں جس سے وہ مخمصے میں پڑ جائیں، واقعی مجھے اپنی اس غلطی پر بہت افسوس ہوا۔

ایک اور غلطی بھی مجھ سے سرزد ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے کہ کسی شخص نے بذریعہ ڈاک مجھے ایک قرارداد کی نقل بھیجی اور لکھا کہ اجمیر میں ہندو نوجوانوں کی کسی انجمن نے اس کو پاس کیا ہے۔ یہ رزولیوشن بہت زیادہ قابل اعتراض نہ تھا۔ چنانچہ میں نے بنارس والی تقریر میں اس کا بھی حوالہ دے دیا حالانکہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کسی انجمن نے اس قسم کا کوئی رزولیوشن کہیں منظور نہیں کیا اور ہم لوگوں کو محض دھوکہ دے کر بیوقوف بنایا گیا۔

میری بنارس کی تقریر کی مختصر رپورٹ سے ایک ہنگامہ مچ گیا، اس میں شک نہیں کہ میں اس قسم کے شوروغل سننے کا عادی ہو گیا ہوں لیکن پھر بھی ہندو مہا سبھا کے رہنما تو اس بری طرح میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں حیران رہ گیا۔ زیادہ تر حملے ذاتیات پر کیئے گئے شاذونادر ہی کسی نے اصل معاملے کی طرف توجہ کی (یہ لوگ اس معاملہ میں حد سے تجاوز کر گئے) مجھے ان سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی اس لئے کہ انہوں نے مجھے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کا ایک موقع بہم پہنچا دیا۔ کئی مہینہ سے اس مسئلہ پر میں بھرا بیٹھا تھا یہاں تک کہ جیل خانہ میں بھی بہت بے چین رہا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس مسئلہ کو چھیڑا کس طرح جائے۔ اس کی کیفیت بھڑوں کے چھتے کی سی تھی اور اس چھتے کو چھیڑنے سے میں ڈرتا نہیں تھا۔ پھر اپنے دل میں سوچتا تھا کہ ایسی بحثوں می پڑے نے کیا لطیف آئے گا جس کا خاتمہ گالی گلوچ پر ہو، مگر اب تو خاموش رہنے کا کوئی موقع نہ تھا، چنانچہ میں نے ہندو اور مسلم فرقہ پرستی پر ایک مضمون لکھا جو میرا خیال ہے کہ بہت مدلل تھا اور کی میں میں نے ثابت کیا تھا کہ ان دونوں میں کوئی حقیقی فرقہ پرستی بھی نہیں ہے بلکہ محض سیاسی اور معاشرتی رجعت پسندی ہے جو فرقہ پرستی کے بھیس میں چھپ کر کام کر رہی ہے۔ اتفاق سے میرے پاس فرقہ پرست لیڈروں کی تقریروں اور بیانوں کے تراشے موجود تھے جو میں نے بڑے پرانے پرانے اخبارات سے کاٹ کر جیل خانہ کے قیام میں جمع کئے تھے اور میرے پاس اتنا زیادہ مواد جمع ہو گیا تھا کہ ایک اخباری مضمون کے لئے ان سب سے پورا فائدہ اٹھانا مشکل ہو گیا، ہندوستانی اخبارات میں میرے اس مضمون کی بہت اشاعت ہوئی اور تعجب کی یہ بات ہے کہ فرقہ پرست ہندو اور فرقہ پرست مسلمانوں دونوں میں سے کسی طرف سے اس کوئی جواب نہیں دیا گیا حالانکہ دونوں کے متعلق میں نے اس مضمون میں بہت کچھ لکھا تھا۔ ہندو مہا سبھا کے رہنما جنہوں نے مجھے گالیاں تک دی تھیں اب بالکل خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ مسلمانوں کی طرف سے

صرف سر محمد اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق میرے چند بیانات کی تردید کرنے کی کوشش کی لیکن میرے دلائل کا کوئی جواب انہوں نے بھی نہ دیا۔ انہیں کو جواب دیتے ہوئے میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک نمائندہ اسمبلی منعقد کر کے تمام سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل کا تصفیہ کرنا چاہئے۔اس کے بعد میں نے ایک یا دو مضامین اور فرقہ پرستی پر لکھے۔ یہ دیکھ کر کہ ان مضامین کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور جو لوگ ان مسائل پر خود غور وفکر کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں انہوں نے بھی ان مضامین کو پسند کیا مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ یہ تو بہر حال میں جانتا تھا کہ میں اپنی جادو بیانی کے زور سے ان جذبات پر ہرگز قابو نہیں پا سکتا ہوں جو کہ فرقہ پرستی کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔میرا مقصد تو صرف یہ اقرار کرنا تھا کہ فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسندی لوگ کہے جا سکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی اور سیاسی سے بھی زیادہ معاشرتی اصلاح اور ترقی کے دشمن ہیں۔ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک مطالبہ بھی عوام الناس کے فائدے کے لئے نہیں ہے۔ان مطالبات کی غرض صرف یہ ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔میرا تو مقصد تھا کہ اس سلسلہ مضامین کو جاری رکھوں لیکن جیل خانہ نے مجھے پھر بلا لیا۔ہندو مسلم اتحاد کی جو کوششیں بار بار کی جاتی ہیں اس میں شک نہیں کہ یہ مفید ضرور ہیں لیکن میرے نزدیک اس وقت تک ان کوششوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا جب تک کہ اختلافات کے اصل اسباب وجوہ سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے گی،بعض نا سمجھ اسی دھوکہ میں ہیں کہ محض ہندو مسلم اتحاد پکارنے اور رٹنے میں کوئی ایسا جادو ہے کہ اتحاد آپ ہی آپ ہو جائے گا۔

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد سے فرقہ وارانہ معاملات میں برطانوی حکومت کا جو طرز عمل رہا ہے اسکی تاریخ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔میرے خیال میں (حکومت

کے اس طرزعمل کی بنیادی اصول اور مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو اتحاد عمل سے روکا جائے اور ایک جماعت کو دوسرے کے خلاف کھڑا کیا جائے۔

۱۸۵۷ء کے بعد بمقابلہ ہندوؤں کے مسلمانوں پر برطانیہ کا ہاتھ زیادہ صاف ہوتا رہا۔ مسلمانوں کے دل میں حکومت کی یاد ابھی تازہ تھی اور وہ مقابلتاً ذرا زیادہ جنگجو اور لڑاکا سمجھے جاتے تھے اس لئے حکومت بھی ان کو زیادہ خطرناک سمجھتی تھی، مسلمانوں نے جدید تعلیم سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اس لئے سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ کم تھا۔ ان تمام وجوہ سے ان کے متعلق حکومت کو طرح طرح کے شبہات اور خطرات تھے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے زیادہ شوق سے آگے بڑھ کر انگریزی زبان سیکھی اور کلرکی کی ملازمتیں حاصل کیں، اس سے حکومت نے یہی اندازہ کیا کہ ہندو زیادہ آسانی سے قابو میں آسکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ دور آیا کہ اعلیٰ طبقہ کے انگریزی پڑھے لکھے لوگوں میں جدید قسم کی ذہنیت پیدا ہونا شروع ہوئی اور چونکہ تعلیمی حیثیت سے مسلمان پیچھے رہ گئے تھے اس لئے قدرتاً صرف ایک خاص طبقہ کے ہندوؤں ہی تک جذبہ وطنیت محدود رہا۔ اس وطنیت کا اظہار نہایت ہی ملائم اور حد درجہ خوشامدانہ الفاظ میں ہوا کرتا تھا لیکن حکومت اس کو بھی پسند نہ کرتی تھی۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب مسلمانوں کے سر پر ہاتھ رکھا جائے اور انہیں وطن پرستی کے اس نئے خطرے سے علیحدہ رکھا جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا انگریزی تعلیم کا نہ حاصل کرنا بجائے خود ان کی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی، لیکن رفتہ رفتہ اس رکاوٹ کا دور ہو جانا بھی یقینی تھا، چنانچہ برطانیہ نے پوری دور اندیشی سے مستقبل کے لئے انتظام کرنا شروع کیا اور اس کام میں سرسید احمد خان جیسی ممتاز شخصیت سے حکومت کو بڑی مدد ملی۔

مسلمانوں کی ابتر حالت اور بالخصوص تعلیمی پستی کو دیکھ کر سرسید کو بڑا افسوس ہوا تھا اور یہ دیکھ کر بھی ان کو تکلیف ہوتی تھی کہ حکومت میں نہ مسلمانوں کا کوئی اثر ہے نہ

رسوخ اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح وہ بھی برطانیہ کے بہت بڑے مداح تھے اور یورپ کے سفر نے تو ان پر اور بھی گہرا اثر ڈالا۔ انیسویں صدی کے آخری پچاس سال کا وہ زمانہ ہے جب یورپ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مغربی یورپ اپنی تہذیب اور ترقی کے شباب پر تھا اور بلا خوف تردید ملکہ عالم بنا ہوا تھا اور جن خوبیوں کی بدولت اس کو یہ عظمت نصیب ہوئی وہ بھی نمایاں طور پر منصۂ مشہور تھیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ اپنی موروثی املاک اور جائدادوں پر قبضہ جمائے اطمینان اور چین سے بیٹھتے تھے بلکہ اس میں برابر اضافہ کرتے جاتے تھے۔ ان کو ذرہ برابر یہ گمان نہ تھا کہ ان کے مقابل کوئی اور دعویدار بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ آزاد خیالی کی ترقی کا عہد تھا اور ہر شخص ایک عظیم الشان مستقبل کا یقین واثق رکھتا تھا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جو ہندوستانی وہاں اس زمانہ میں گئے وہ بھی ان حالات اور خیالات سے متاثر اور مرعوب ہوئے۔ شروع شروع میں ہندو زیادہ تعداد میں گئے اور پورے یورپ بالخصوص انگلستان کے مداح بن کر واپس لوٹے۔ لیکن رفتہ رفتہ آنکھیں اس ظاہری دمک کی عادی ہونے لگیں اور تحیر کا پہلا پردہ چاک ہوا۔ سرسید پر جو رعب اور اچنبھے کی کیفیت یورپ کے پہلے سفر میں طاری ہوئی اس کا نمایاں ثبوت جا بجا ملتا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں جب انہوں نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں سے جو خطوط انہوں نے لکھے ان میں تاثرات کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتے۔ اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی بد اخلاقی اور ہندوستانیوں کو جانوروں سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل سمجھنا گو میرے لئے نا قابل معافی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں سے ناواقفیت کی بنا پر وہ ایسا کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کے متعلق جو رائے انہوں نے قائم کی ہے وہ زیادہ غلط بھی نہیں ہے۔ انگریزوں کی بیجا تعریف کئے بغیر میں سچ کہتا ہوں کہ ہندوستانی خواہ اونچے طبقے کے ہوں یا نیچے طبقے کے ہوں سوداگر ہوں یا معمولی دوکاندار، تعلیم یافتہ یا جاہل جب ان کا مقابلہ تعلیم

اخلاق اور ایمانداری میں انگریزوں سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ نسبت ہے جو ایک گندہ جانور کو ایک خوبصورت اور لائق انسان سے ہوتی ہے۔ انگریز اگر ہندوستانیوں کو بزدل اور جانور سمجھتے ہیں تو ان کے پاس اس کے وجوہ بھی ہیں۔۔۔۔ جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہے اور ہر روز دیکھتا ہوں وہ ہندوستان کے باشندوں کے تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ وہ تمام روحانی اور مادی خوبیاں جو ایک انسان میں ہونی چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ نے یورپ کو بالخصوص انگلستان کو عطا فرمائی ہیں۔

یورپ اور برطانیہ کی اس سے زیادہ تعریف کوئی انسان نہیں کرسکتا اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید بہت زیادہ مرعوب اور متاثر ہو گئے تھے۔ موازنہ اور تقابل کے لئے جو شدید الفاظ انہوں نے استعمال کئے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ اپنی قوم کو غفلت کی نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھانا چاہتے تھے اور شرمندہ کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ لوگ بھی ترقی کی طرف قدم بڑھائیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ترقی کا یہ قدم وہ مغربی تعلیم ہی کی طرف اٹھانا چاہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ بغیر مغربی تعلیم کے ان کی حالت روز بروز کمزور اور پست ہوتی جائے گی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سرکاری ملازمت ملے۔ امن چین سے روزی ملے، اعزاز اور رسوخ حاصل ہو، چنانچہ انہوں نے اس قسم کی تعلیم کو رواج دینے کے لئے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں تمام تر توجہ وقف کردی۔ وہ کسی دوسری طرف اپنی توجہ کو منتشر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے جمود اور جھجک پر غلبہ پانے کا کام خود ہی بہت مشکل تھا۔ دوسری طرف بورژوا ہندوؤں کی کوششوں سے وطن پرستی کی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ اس میں شرکت سے ان کے نزدیک انتشار کا ڈر تھا اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ ہندو جو مغربی تعلیم میں نصف صدی مسلمانوں سے آگے تھے حکومت وقت پر نکتہ چینی کرنے مشغلہ تفریحا کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے تعلیمی کاموں کو حکومت کے تعاون اور امداد کے بھروسے پر شروع کیا تھا اور اس

لئے وہ کوئی ایسا قدم بے سوچے سمجھے نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کام کو نقصان پہنچے۔ چنانچہ انہوں نے نوزائیدہ نیشنل کانگریس، کو پس پشت ڈال دیا، ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت یہی چاہتی تھی اور اس نے ان کی پوری حمایت کی۔

سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کردینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا، بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔ جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔

ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورژوا طبقہ پیدا نہیں ہوا تھا، اس لئے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ ان کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ مسلمان بورژوا تحریک وطنیت میں شامل ہو جاتے۔

سرسید کی یہ تمام کاروائیاں جو بظاہر ہمیں معتدل قسم کی معلوم ہوتی ہیں حقیقتاً ایک قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ مسلمان ابھی تک اپنے خیالات کے اعتبار سے جمہوریت کے مخالف اور منصب داری نظام کے حامی تھے، برخلاف اس کے ہندوؤں میں جو متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا یہ یورپ کے آزاد خیال لوگوں سے متاثر تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک سے ایک بڑھ کر اعتدال پسند تھے اور دونوں حکومت برطانیہ کے وابستگان میں تھے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ تھا کہ سرسید کا اعتدال زمیندا طبقہ کا اعتدال تھا۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں تھوڑے بہت صاحب حیثیت لوگ جو رہ گئے تھے وہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ہندوؤں کا اعتدال ایک ہوشیار پیشہ کاروباری آدمی کا اعتدال تھا جو اپنی تجارت کی ترقی اور سرمایہ لگانے کے لئے راستہ نکالنا چاہتے ہے۔ ہندو مدبرین کی نظریں ہمیشہ گلیڈ اسٹون اور برائٹ وغیرہ کی طرف اٹھتی تھیں، اس لئے کہ انگلستان کے آزاد خیال گروہ کے یہی

چشم و چراغ ہیں۔ مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ غالباً انگلستان کے قدامت پرست گروہ تو ریز اور طبقہ امرائے کے زیادہ قائل اور مداح تھے۔گلیڈ اسٹون نے چونکہ ترکی کی آرمینی قتل عام کی مذمت کی تھی اس لئے گلیڈ اسٹون کو مسلمان ہوا سمجھتے تھے اور ڈسرائیلی چونکہ ترکی سے کسی قدر ہمدردی رکھتا تھا اس لئے ان معاملات سے دلچسپی لینے والے مسلمان جن کی تعداد بہت تھوڑی تھی ذرا ڈسرائیلی کے طرفدار تھے۔

سرسید کی بعض تقریروں کو اگر آج پڑھا جائے تو بہت عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ دسمبر ۱۸۸۷ء میں انہوں نے لکھنو میں ایک تقریر کی نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس بھی اسی زمانہ میں ہو رہا تھا چنانہ اس تقریر میں انہوں نے کانگریس کے حد درجہ معتدل مطالبات پر بھی نکتہ چینی کی اور اس کی مذمت کی۔سرسید نے کہا کہ حکومت اگر افغانستان سے جنگ کرتی ہے یا برما پر قبضہ کرلیتی ہے تو ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اس کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کریں۔۔۔۔اس کونسل کے لئے وہ ہر صوبہ سے ایسے افسروں کا انتخاب کرتی ہے جو ملکی انتظامات اور لوگوں کی حالت سے سب سے زیادہ واقف ہیں۔اس کے علاوہ کچھ رئیسوں کو بھی لیا جاتا ہے جو اپنے بلند مرتبہ کی وجہ سے اس مجلس میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ کچھ لوگ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ بجائے قابلیت کے محض بلند مرتبہ کی وجہ سے انہیں کیوں منتخب کیا جائے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے امراء اور روسا کا طبقہ اس کو پسند کرے گا کہ ایک نیچ ذات یا ایک بے نام و ننگ خاندان کے کسی آدمی کو خواہ وہ بی اے، ایم اے ہی پاس کرلے اور اس میں تمام قابلیتیں بھی کیوں نہ موجود ہوں کیا ایسا اختیار اور رتبہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ ان پر حکومت کرے اور اس کو ایسے قوانین بنانے کا اختیار حاصل ہو جس کا اثر ان کی زندی اور املاک پر پڑے؟ ہرگز نہیں!۔۔۔۔سوائے اعلیٰ خاندان کے لوگوں کے اور کسی شخص کو وائسرائے بہادر اپنا رفیق کار نہیں بنا سکتے، نہ اس سے برادرانہ

تعلقات رکھ سکتے ہیں، نہ ایسی عورتوں میں اس کو شریک کر سکتے ہیں جہاں اس کو ڈیوک اور ارل طبقہ کے لوگوں کے ساتھ ایک میز پر کھانا ہو۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت نے قانون سازی کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں وہ رائے عامہ کا کوئی لحاظ نہیں کرتی؟ اور کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قانون بنانے میں ہم لوگوں کا کوئی نفع نہیں؟ میں دعوی کر کے کہہ سکتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

ہندوستان میں جمہوریت اسلام کے ایک نماہندہ اور رہنما کے یہ خیالات ہیں! کیا اودھ کے تعلقدار یا صوبہ آگرہ، بہار اور بنگال کے بڑے بڑے زمیندار بھی اس قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی جرات آج کر سکتے ہیں لیکن ایک بیچارے سرسید ہی اس قسم کے خیالات نہ رکھتے تھے۔ خود کانگریس کی بہت سی تقریریں، آج اگر پڑھی جائیں تو اتنی ہی عجیب معلوم ہوں گی، بہرحال یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کا سیاسی اور معاشی پہلو یہ تھا۔ کہ ہندوؤں کا ایک متوسط طبقہ تھا جو معاشی حیثیت سے ذرا بہتر حالت میں تھا اور ترقی کر رہا تھا۔ اس طبقہ کے اقتدار اور ترقی کی مخالفت کسی حد تک زمیندار طبقے کی طرف سے کی گئی جس میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ ہندو زمیندار بالعموم اپنے بورژوا طبقے سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اور اس لئے اپنے متوسط طبقہ کے مطالبات میں یا وہ غیر جانب دار رہے یا ان سے ہمدردی کرتے رہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اکثر اوقات یہ مطالبات انھیں کے اشاروں سے کئے جاتے تھے۔ حکومت برطانیہ حسب معمول اس کش مکش میں منصب داروں اور جاگیرداروں کا ساتھ دیتی رہی اور جہاں تک بیچارے عوام الناس یا ادنیٰ متوسط طبقہ کا تعلق ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اس پوری تصویر میں ان کا چہرہ کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

بالاخر سرسید کی پرزور اور چھا جانے والی شخصیت نے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں پر اپنا سکہ جما دیا اور ان کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کی تشکیل علی گڑھ کالج کی

صورت میں ہوئی۔تغیر اور تبدیلی کے زمانہ میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ترقی کی تحریک جلد ہی اپنی قوت ختم کر چکتی ہے اور پھر بجائے محرک کے الٹے روک کا کام کرنے لگتی ہے۔اس کی ایک روشن مثال ہندوستان کی لبرل جماعت ہے وہ اکثر ہم لوگوں کو یاد دلاتے ہیں کہ کانگریس کی قدیم روایات کے اصل حامل اور جائز وارث وہی ہیں۔ ہم لوگ جو بعد میں داخل ہوئے خواہ مخواہ دخل بیجا کرنے والے لوگ ہیں۔اور یہ بالکل درست ہے، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ بدلتی رہی ہے اور کانگریس کی قدیم روایات اسی طرح محو ہو چکی ہیں جیسے پارسال کا برف پہاڑوں پر سے گھل کر غائب ہو گیا اب صرف اس کی یاد ہی یاد باقی ہے۔شاید سرسید کا پیغام بھی اسی طرح اس وقت کے لئے مناسب حال اور ضروری تھا،لیکن ایک ترقی کرنے والی جماعت کے لئے وہ آخری نصب العین نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ممکن ہے کہ اگر وہ ایک نسل تک اور زندہ رہتے تو وہ خود اپنے پیغام کو کوئی نیا رخ دیتے۔ یا دوسرے رہنماؤں کا فرض تھا کہ وہ ان کے پیغام کی تاویل کر کے تغیر پزیر حالات میں اس سے کام لیتے۔لیکن یہ ایسی عظیم الشان کامیابی سرسید کو حاصل ہوئی تھی اور ان کی ایسی عظمت لوگوں کے دلوں پر اسی وجہ سے قائم ہوگئی تھی کہ دوسرے لوگوں کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ ان کے عقیدے سے ہٹ کر کوئی نئی راہ نکالی جائے اور بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایسی غیر معمولی قابلیت کے لوگوں کا بھی فقدان تھا جو کوئی نئی راہ نکال سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ کالج نے بڑا اچھا کام کیا۔قابل لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا کر دی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کا رنگ ہی بدل دیا لیکن جن اصولوں پر اس کی بنیاد اول روز قائم کی گئی تھی ان میں پھر پوری طرح تبدیلی نہیں ہوسکی۔امیرانہ ذہنیت وہاں ہمیشہ کارفرما رہی اور ایک اوسط درجہ کے طالب علم کا حوصلہ اور مقصد سرکاری ملازمت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔نہ اس میں تحقیق کا جذبہ ہے

نہ تلاش اور جستجو کا حوصلہ اگر اس کو ڈپٹی کلکٹری مل جائے تو بس وہ خوش ہے اور مطمئن۔ اس کا جذبہ افتخار اس سے مطمئن ہو جاتا۔ اگر اس کو یاد دلایا جائے کہ وہ بھی جمہوریت اسلام کا ایک رکن ہے اور اپنے اس جذبہ اخوت کو نمایاں کرنے کے لئے وہ ایک سرخ ٹوپی ذرا ترچھی کر کے پہنتا ہے۔ (یہ ترکی ٹوپی کہلاتی ہے حالانکہ خود ترکوں نے اب اس کو بالکل ترک کر دیا ہے) جمہوریت اسلام میں شرکت کا یہ ناقابل انکار حق یقینی طور پر حاصل کر لینے کے بعد جس سے کہ اس کو دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کا حق مل جاتا ہے اب اس کو اس مطلق فکر نہیں ہوتی کہ اس کے وطن ہندوستان میں سیاسی جمہوریت کا وجود بھی کہیں ہے کہ نہیں ہے۔

سرکاری ملازمت کرنے کا یہ شوق اور تنگ نظری صرف علی گڑھ یا دوسرے مقامات کے مسلمان طلبہ ہی میں نہیں بلکہ ہندو طلبہ میں بھی پائی جاتی تھی جو طبعا بہت ہی کم حیثیت ہوتے تھے، لیکن حالات نے انہیں بالآخر اب اس چکر سے نکلنے پر مجبور کر دیا، ان کی تعداد بہت بڑھ گئی اور ملازمتوں میں اتنی جگہ نہ تھی کہ سب کو دی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا ایک طبقہ ہو گیا جو قومی انقلابی تحریکات کے پشت پناہ ہیں۔

سرسید کے سیاسی پیغام کا اثر ابھی ہندی مسلمانوں پر باقی تھا کہ بیسویں صدی کے اوائل میں چند واقعات نے برطانوی حکومت کو یہ موقع دیا کہ قومی تحریک اور مسلمانوں کے درمیان جو خلیج پہلے سے حائل ہے اس کو اور زیادہ وسیع کر دے، میں سر ولنٹائن چرول اپنی کتاب انڈین ان ریسٹ میں لکھتے ہیں کہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے مفاد اور قومی اغراض کو برطانوی حکومت کے قیام و استحکام کے ساتھ جس حد تک اب وابستہ کر لیا ہے اس سے پہلے کبھی اس کی مثال نہیں ملتی لیکن سیاسی پیشنگوئیاں خطرناک ہوتی

ہیں۔سر ولنٹائن نے جب یہ لکھا اس کے پانچ سال کے بعد یہ دیکھا گیا کہ تعلیم یافتہ مسلمان بھی ان بیڑیوں کو توڑ پھینکنے کی کوشش اور جدوجہد کر رہے ہیں اور کانگریس کے دوش بدوش چلنے چاہتے ہیں اور اسی سال کے اندر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندی مسلمان کانگریس سے بھی دو قدم آگے نکل جائیں گے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ کانگریس کی رہنمائی کرنے لگے۔ لیکن یہ دس سال کا زمانہ بہت ہی اہم تھا۔ جنگ عظیم اسی زمانہ میں شروع ہوئی اور دنیا کو تباہی اور بربادی کے عالم میں چھوڑ کر اسی زمانہ میں ختم بھی ہوئی۔

بہر کیف سطحی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو سر ولنٹائن چرول نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس کے لئے بھی معقول وجود موجود تھے۔ آغا خان نے مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے ظہور فرمایا تھا اور اسی ایک واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان ابھی تک قدیم منصب داری نظام کی روایات سے وابستہ تھے۔ اس لئے کہ آغا خان بورژوا لیڈر تو کسی صورت میں نہیں کہے جا سکتے تھے۔ آغا خان ایک متمول امیر و کبیر ہیں اور ایک مذہبی فرقہ کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔ برطانوی نقطہ نظر سے تو مقربین بارگاہ میں ان کا شمار کیا جاتا ہے اس لئے کہ برطانیہ کے حکمران طبقہ سے ان کے نہایت گہرے تعلقات ہیں۔ وہ ایک نہایت شائستہ اور وسیع المشرب آدمی ہیں ان کا قیام زیادہ تر یورپ میں رہتا ہے جہاں ان کی طرز معاشرت اور بود و باش بالکل وہی ہے جو ایک فارغ البال اور سیر و تفریح میں وقت گزارنے والے انگریز رئیس کی بالعموم ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ جہاں تک فرقہ وارانہ مذہبی مسائل اور معاملات کا تعلق ہے آغا خان خود ذاتی طور پر تنگ نظری سے بہت دور ہیں۔ لیکن ان کی قیادت کے معنی یہ تھے مسلمانوں میں زمیندار طبقہ، مسلمان بورژوا طبقہ دونوں برطانوی حکومت کی حمایت میں صف بستہ ہو جائیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس پر ظاہرا طور پر اس لئے زور دیا جاتا تھا کہ اصل مقصد حاصل ہو۔ سر ولنٹائن

چرول لکھتے ہیں کہ آغا خان نے وائسرائے لارڈ منٹو کو بتلا دیا تھا کہ تقسیم بنگالہ سے جو سیاسی صورت حال پیدا ہوئی اس کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نظر کیا ہے تا کہ ہندوؤں کے ساتھ کوئی ایسی سیاسی مراعات کہیں رواداری میں نہ کردیئے جائیں جس سے ہندو اکثریت کے اقتدار حاصل کرنے کے لئے راستہ صاف ہوجائے کہ یہ بات برطانوی حکومت کے استحکام اور مسلم اقلیت کے مفاد کے لئے جس کی وفاداری میں اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی یکساں طور پر خطرناک تھی۔

برطانوی حکومت کے ساتھ اسی سطحی حمایت کے پیچھے دوسری قوتیں بھی کام کررہی تھیں۔ ناگزیر طور پر جدید مسلم بورژوا طبقہ روز بروز موجودہ حالات سے غیر مطمئن ہوکر تحریک وطنیت کی طرف کھنچتا جارہا تھا۔ خود آغا خان کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا اور انہوں نے محض الفاظ میں برطانیہ کو متنبہ بھی کیا۔ انہوں نے جنوری ۱۹۱۴ء کے اڈنبرا ریویو میں (یعنی جنگ سے بہت پہلے) یہ لکھا تھا اور حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا طرزِ عمل ترک کرکے دونوں مذاہب کے معتدلین کو ایک مشترکہ محاذ پر جمع کرنا چاہیے تا کہ ہندوستان کے نوجوان ہندو اور مسلمان دونوں کے انتہاپسند قومی میلانات کا مقابلہ کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفاد کا اتنا خیال نہ تھا جتنا کہ ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو روکنے کا۔

لیکن قومیت کی تحریک کی طرف مسلم بورژوا طبقہ کے ناگزیر میلان کو نہ تو آغا خان روک سکے اور نہ حکومت برطانیہ۔ عالمگیر جنگ نے اس عمل میں اور زیادہ تیزی پیدا کردی اور جیسے جیسے نئے رہنما پیدا ہوئے آغا خان کنارہ کش ہوتے گئے، یہاں تک کہ علی گڑھ کالج کا رنگ بدلا۔ نئے رہنماؤں میں سب سے زیادہ زوردار علی برادران تھے اور یہ دونوں علی گڑھ ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور متعدد بورژوا لیڈروں نے مسلمانوں کے سیاسی معاملات

میں بہت اہم حصہ لینا شروع کیا۔ اسی طرح مسٹر محمد علی جناح آگے بڑھے لیکن ذرا زیادہ اعتدال کے ساتھ۔ گاندھی جی ان میں سے اکثر مسلم لیڈروں کو (مسٹر جناح کو چھوڑ کر) اور مسلمانوں کو بالعموم تحریک ترک موالات میں اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئے اور ان لوگوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک تمام واقعات بہت نمایاں حصہ لیا۔

اس کے بعد ردعمل شروع ہوا، ہندو اور مسلمانوں دونوں جماعتوں کے فرقہ پرست اور پھسڈی لوگ جو مجبوراً کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے تھے نکلنا شروع ہو گئے۔ اس عمل کی رفتار بہت سست تھی لیکن مسلسل جاری رہی۔ چنانچہ ہندو مہاسبھا کو پہلی بار کچھ شہرت حاصل ہوئی لیکن یہ شہرت زیادہ تر فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے تھی ورنہ سیاسی حیثیت سے وہ کانگریس کو کچھ زیادہ مرعوب نہ کر سکی۔ اسلامی فرقہ وارانہ انجمنوں کو البتہ عام مسلمانوں میں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے میں نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی لیکن اس کے بعد بھی مسلمان رہنماؤں کی ایک قومی جماعت برابر کانگریس کے ساتھ رہی۔ اسی اثناء میں حکومت برطانیہ نے ان تمام فرقہ پرست مسلمان لیڈروں کی ہمت افزائی اور حمایت کی جو سیاسی حیثیت سے بالکل رجعت پسندی میں ان کا مقابلہ شروع کیا اور اس امید پر کہ حکومت کی خوشنودی اس طریقہ سے حاصل ہو جائے گی، مہاسبھا کے ترقی پسند عناصر یا تو نکال باہر کئے گئے یا آپ اپنی مرضی سے علیحدہ ہو گئے اور مہاسبھا روز بروز اعلیٰ متوسط طبقہ کی طرف اور بالخصوص ساہوکاروں اور مہاجنوں کی طرف جھکتی چلی گئی۔

دونوں طرف کے فرقہ پرست سیاسین جو کونسلوں کی نشستوں کی تقسیم پر برابر لڑ جھگڑ رہے تھے اگر کچھ سوچتے تھے تو بس یہ کہ حکومت میں اقتدار حاصل ہونے سے ان کو ہم قوموں کی سرپرستی کے مواقع ملیں گے غرض یہ سارا جھگڑا صرف متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ملازمتوں کے لئے تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ اتنی ملازمتیں تو تھیں نہیں جو سب کو ملا سکیں اس لئے ہندو مسلم فرقہ پرست اسی کے لئے جھگڑتے تھے اور

اول الذکر کے قبضہ میں چونکہ اکثر ملازمتیں تھیں اس لئے وہ ان کا تحفظ کرنا چاہتے تھے اور آخر الذکر برابر اور زیادہ چھیننے کی فکر میں تھے۔ ملازمتوں کے لئے اس جھگڑے کے پیچھے ایک اور بھی بہت زیادہ اہم مقابلہ تھا جو ٹھیک ٹھیک فرقہ وارانہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن فرقہ وارانہ امور پر اس کا اثر ضرور پڑتا تھا۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو پنجاب، سندھ اور بنگال میں ہندو زیادہ مالدار، زیادہ قرض دینے والے اور زیادہ تر شہر کے رہنے والے ہیں۔ برخلاف اس کے ان صوبوں میں مسلمان زیادہ غریب، زیادہ مقروض اور زیادہ تر دیہات کے رہنے والے ہیں، چنانچہ ان دونوں کی لڑائی زیادہ تر معاشی ہے لیکن ہمیشہ اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا اور ادھر کچھ عرصے سے تو مختلف صوبجات کی کونسلوں میں اور بالخصوص پنجاب کونسل میں جہاں دیہی قرضوں کی تخفیف کا مسودہ قانون پیش ہوا تو بحث مباحثوں میں یہ کیفیت خاص طور پر ظاہر تھی اور ہندو مہا سبھا کے نمائندوں نے ہمیشہ ان قوانین کی مخالفت کی اور ساہوکار طبقہ کا ساتھ دیا ہے۔

ہندو مہا سبھا جب کبھی مسلمانوں کی فرقہ پرستی پر نکتہ چینی کرتی ہے تو اپنی اس خالص وطنیت کا ادعا بھی کرتی ہے جسے کوئی انکا نہیں سکتا۔ یہ بات مسلم انجمنوں نے اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر فرقہ پرست ظاہر کیا ہے ہر شخص پر عیاں ہے، لیکن ہندو مہا سبھا کی فرقہ پرستی اتنی آشکارا نہیں ہے اس لئے کہ وہ وطنیت کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ اس کی وطنیت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کسی جمہوری اور قومی تصفیہ سے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اس کو اندیشہ ہو اور اس وقت اس امتحان میں مہا سبھا بار بار ناکام ثابت ہو چکی ہے یہی وجہ تو ہے کہ اکثریت کی مرضی کے خلاف اور اقلیت کے معاشی مفاد کی خاطر یہ لوگ ہمیشہ سندھ کی علیحدگی کی مخالفت کرتے رہے۔

لیکن فرقہ پرست ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے وطن پرستی کی مخالفت

اور رجعت پسندی کی غیر معمولی نمائش گول میز کانفرنس میں ہوئی۔ برطانوی حکومت نے چن چن کر صرف فرقہ پرست مسلمانوں کو نامزد کرنے پر اصرار کیا تھا اور یہ لوگ آغا خان کی قیادت میں بڑے بڑے رجعت پسندوں سے جا کر مل گئے جو نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام ترقی پسند جماعتوں کے نقطہ نظر سے برطانیہ کی سیاسی زندگی میں سب سے خطرناک عناصر سمجھے جاتے ہیں۔ آغا خان اور ان کی جماعت کا لارڈ لائڈ اور ان کی جماعت کے ساتھ اتنا گہرا میل جول دیکھ کر یوں ہی تعجب ہوتا تھا، لیکن یہ لوگ تو ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور انہوں نے گول میز کانفرنس میں یورپین ایسوسی ایشن کے نمائندوں کے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے نمائندوں کے ساتھ جا کر عہد و پیان کر لئے۔ یہ بات بہت زیادہ تکلیف دہ اس لئے تھی کہ یہ ایسوسی ایشن (انجمن) ہندوستان میں ملکی آزادی کی سب سے بڑی مخالف اور دشمن ہمیشہ سے رہی ہے اور آج بھی ہے۔

ہندو مہا سبھا کے نمائندوں نے اس کے جواب میں یہ مطالبہ کیا، کہ ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص پنجاب کی خود اختیاری پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کی جائیں یعنی ایسے تحفظات، رکھے جائیں جو برطانیہ کے حق میں مفید ہوں، انہوں نے کوشش کی کہ برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے میں مسلمانوں سے بھی آگے بڑھ جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ تو کچھ نہیں لگا البتہ اپنے ہی مقدمہ کو نقصان پہنچایا اور تحریک آزادی کے ساتھ غداری کی۔ مسلمانوں نے کم از کم وقار کے ساتھ تقریریں کی تھیں لیکن فرقہ پرست ہندوؤں کے پاس یہ بھی نہ تھا۔

سب سے زیادہ نمایاں حقیقت مجھے تو یہ نظر آتی ہے کہ دونوں طرف کے فرقہ پرست لیڈر کس طرح صرف ایک چھوٹے سے اعلیٰ طبقہ کے رجعت پسند گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور کس طرح یہ لوگ بھی اپنی اغراض کے لئے عوام کے مذہبی

جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ دونوں طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اصل معاشی مسئلہ پر غور وفکر کی خواہش کو دبایا جائے اور اس سے احتراز کیا جائے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ان امور کو اور زیادہ نہ دبایا جاسکے گا اور اس وقت پھر دونوں طرف کے فرقہ پرست لیڈروں کی زبان سے آغا خان کی بیس برس پہلے والی تنبیہہ کی آواز بازگشت آئے گی کہ معتدلین ایک مشترکہ محاذ پر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر انقلابی میلانات کے مقابلہ کے لئے مجتمع ہو جائیں، کسی حد تک تو یہ بات اب بھی ظاہر ہونے لگی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرقہ پرست خواہ عام جلسوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔معاہدہ اتاوہ بھی اسی قسم کا ایک رشتہ تھا جس نے تینوں کو متحد کر دیا تھا۔

یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ کنزرویٹو جماعت کے انتہائی رجعت پسند لوگوں کے ساتھ آغا خان کا گہرا تعلق اب تک قائم ہے۔اکتوبر ۱۹۳۴ء میں برطانوی بحری افواج کی لیگ کے ڈنر میں آغا خان بطور خاص مہمان کے مدعو تھے جس میں لارڈ لائڈ نے صدارت کی تھی اور انہوں نے دل وجان سے ان تجاویز کی تائید کی تھی جو برطانوی بحری بیڑے کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے لارڈ لائڈ نے برسٹل کی کنزرویٹو کانفرنس میں پیش کی تھیں۔

چنانچہ ایک ہندوستانی لیڈر کو اتنی زیادہ فکر برطانوی سلطنت اور بالخصوص انگلستان کی محافظت کی تھی کہ برطانوی افواج و اسلحہ کے اضافہ کے معاملہ میں مسٹر بالڈون اور نیشنل گورنمنٹ سے بھی وہ آگے جانا چاہتے تھے۔ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ وہ صرف قیام امن کی خاطر کر رہے تھے!۔

اس کے بعد دوسرے مہینہ نومبر ۳۴ء میں یہ خبر ملی کہ ایک تصویر (فلم) نجی طور پر لندن میں دکھلائی گئی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی دنیا کے مستقل دوستانہ تعلقات کا رشتہ تاج برطانیہ کے ساتھ قائم کیا جائے ہم لوگوں کو اطلاع دی گئی کہ اس

موقع پر خاص مہمان آغا خان اور لارڈ لائڈ سلطنتی معاملات میں اس طرح ایک دوسرے سے متحد اور ایک جان دو قالب ہو گئے ہیں جیسے ہماری قومی سیاسیات میں ترتیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم آر جیکر ہیں اور یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ اسی چند مہینہ کے عرصہ میں جب یہ دونوں ایک دوسرے سے بار بار ساز باز کرر ہے تھے، لارڈ لائڈ کنزرویٹو (قدامت پسند) جماعت کی باضابطہ قیادت پر اور اپنی نیشنل گورنمنٹ پر تلخ اور ناگوار حملے بھی کرر ہے تھے اور یہ الزام دے رہے تھے کہ حکومت ہندوستان کو ضرورت سے زیادہ دے کر گویا کمزوری دکھلا رہی ہے۔

ادھر کچھ عرصہ سے بعض فرقہ پرست لیڈروں کے بیانات اور تقریروں میں ایک دلچسپ بات اور پیدا ہوگئی ہے۔اس کی کوئی خاص اہمیت تو ہے نہیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ اور لوگوں کا بھی یہی خیال کہیں نہ ہو۔بہر کیف فرقہ پرستی کی ذہنیت تو اس سے ظاہر ہی ہوتی ہے اور اس کو بہت زیادہ اہمیت بھی دی گئی ہے۔پہلے تو ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تمدن پر اور ہندو تمدن پر اور اسلامی تمدن کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے (گو اس کو بھونڈے طریقہ پر نہیں پیش کیا جاتا) کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں تمدنوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کر سکے۔

تھوڑے سے فرقہ پرست ہندو لیڈر بھی ٹھیک اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ چونکہ وہ اکثریت میں ہیں اس لئے انہیں توقع ہے کہ ہندو تمدن بالآخر غالب آجائے گا۔

ہندو اور مسلم تمدن اور ملت اسلامی، ان الفاظ سے ماضی کے کیسے کیسے دل پسند تاریخی واقعات اور موجودہ اور آئندہ کے متعلق کیسی کیسی امیدوں کے باب کھل جاتے ہیں! لیکن ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم (موجود ہے) جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم

ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطہ نظر سے یہ بہت دور دراز کا ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے۔ بہر کیف اس ذہنیت کے سمجھنے میں اس سے تھوڑی مدد ملے گی جو اس کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ اس قسم کی چند قوموں کا وجود عہد وسطیٰ میں اور اس کے بعد بھی پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں اور گھل مل نہ سکتی تھیں۔ سلاطین عثمانی کے ابتدائی عہد کے قسطنطنیہ میں اس قسم کی ہر قوم علیحدہ علیحدہ وجود رکھتی تھی اور اس کو کسی حد تک خود مختاری حاصل تھی مثلاً لاطینی عیسائی، ارتھوڈاکس عیسائی اور یہودی وغیرہ۔ یہ گویا ابتدا تھی اپنے وطن کے علاوہ دیگر ممالک سے رشتہ اخوت جوڑنے کی جو اس زمانہ میں اکثر مشرقی ممالک کے لئے ایک بہت ہی پریشان کن خواب بن گیا۔ اس لئے مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں صرف مذہبی اخوت کا رشتہ ایک چیز ہے اور اس لئے کوئی قوم (جدید مفہوم میں) ترقی نہ کرنے پائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید تہذیب وتمدن کو ترک کر کے ہم لوگ عہد وسطیٰ کے طریقوں کو پھر اختیار کریں، یا پھر اس کا مطلب یہ ہے مطلق العنان حکومت یہاں رہنا چاہیے یا بدیسی حکومت۔ اور آخر میں تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ ذہن کی محض ایک جذباتی کیفیت ہے اور محسوس طریقہ پر یہ خواہش کہ حقائق سے بالخصوص معاشی حقائق سے کسی طرح دوچار ہونا نہ پڑے۔ جذبات کے سامنے منطق اوندھی ہو جاتی، مگر محض اس وجہ سے کہ وہ غیر معقول ہوتے ہیں ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے، اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد بھی ہوتا تو بھی حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔

یہی حال ہندو اور مسلم تمدنوں کے تخیل کا ہے۔ اب قومی تمدن کا زمانہ بھی بہت

تیزی کے ساتھ ختم ہوتا جارہا ہے اور پوری دنیا ایک تمدنی وحدت بنتی جارہی ہے۔ قوموں کو یہ حق ہے اور آئندہ بھی ایک عرصہ تک یہ حق رہے گا کہ اپنی خصوصیات کو مثلاً زبان، عادات اور طریق فکر کو باقی اور محفوظ رکھیں، لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ زمانہ اور تیزی سے سفر کرنے کی سہولتیں، اخبار عالم کا مسلسل ملتا رہنا، ریڈیو اور سینما وغیرہ کی ترقی کی وجہ سے روز بروز دنیا میں یک رنگی پیدا ہوتی جائے گی۔ اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، اگر اس کو کوئی روک سکتا ہے تو بس ایک عالمگیر تباہی جو جدید تہذیب اور تمدن کو تہ و بالا کردے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو اور مسلم فلسفہ زندگی میں بہت سے روایتی اختلافات موجود ہیں لیکن یہ اختلافات مشکل ہی سے نظر آسکتے ہیں جب کہ ان دونوں کا مقابلہ زندگی کے متعلق جدید علمی اور تجارتی نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس آخرالذکر اور اول الذکر دونوں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج موجود ہے۔ آج ہندوستان میں اصل کش مکش ہندو تمدن اور اور مسلم تمدن کے درمیان نہیں ہے بلکہ ایک طرف یہ دونوں ہیں اور دوسری طرف تہذیب جدید کا فاتح علمی و عملی تمدن، جو لوگ مسلم تمدن کا، خواہ اس کا مطلب جو کچھ بھی ہو تحفظ چاہتے ہیں، انہیں ہندو تمدن کے متعلق فکر کرنے کی بجائے مغرب کے اس دیو کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ ذاتی طور پر مجھے تو اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ جدید علمی اور تجارتی تمدن کے مقابلے کے لئے جتنی بھی کوشش کی جائے گی خواہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا ہندوؤں کی طرف سے ان کا حشر ناکامی ہوگا اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں بغیر کسی تاسف کے اس ناکامیابی کا تماشہ خوشی سے دیکھوں گا۔ جس دن ریلیں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں یہاں آئیں ہماری پسند کا فیصلہ تو اسی دن بالکل غیر محسوس طریقہ پر اور بلا کسی خواہش کے ہوگیا تھا۔ سرسید احمد خان نے بھی ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے اپنی پسند کا فیصلہ اسی دن کرلیا تھا جس دن علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم میں سے کسی کی پسند کا

کوئی دخل ہی نہ تھا، یا اگر تھا بھی تو اس کی مثال وہی ہے کہ جب آدمی ڈوبنے لگتا ہے تو وہ تنکے کا سہارا پکڑتا ہے کہ شاید وہی اس کی جان بچائے۔

لیکن یہ مسلم تمدن ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں۔ مجھے نہیں یاد آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا کبھی ذکر کرتا ہو، جن دو زبانوں نے ہندی مسلمانوں کے خیالات و افکار پر اثر ڈالا ہے وہ عربی اور بالخصوص ایرانی زبان ہے، لیکن ایرانی زبان کے اثر میں کوئی جذبی عنصر شامل نہیں۔ ایرانی زبان اور بہت سی ایرانی رسوم اور روایات، ہزارہا سال کے عرصہ میں ہندوستان میں آئیں اور پورے شمالی ہند پر اپنا نقش قائم کیا۔ ایران گویا مشرق کا فرانس تھا جو اپنی زبان اور اپنے تمدن کو تمام پردیس کے ملکوں میں پھیلاتا تھا اور یہاں ایک ایسا گراں قدر ورثہ ہے جس میں ہم تمام ہندوستانی برابر کے شریک ہیں۔

مسلم اقوام اور ممالک کے تاریخی کارناموں پر فخر کرنا غالباً ایک بہت ہی مضبوط اسلامی رشتہ سمجھا جاتا ہے، لیکن کیا کوئی شخص مختلف اقوام کے عظیم الشان کارناموں پر فخر کرنے سے مسلمانوں کو روکتا ہے، جب تک وہ ان کی یاد کو تازہ رکھنا چاہیں گے اس وقت تک کوئی شخص انہیں اس سے محروم نہیں کر سکتا بلکہ واقع تو یہ ہے کہ تاریخی کارنامے بہت بڑی حد تک ہم سب لوگوں کے لئے بھی ایک مشترکہ ورثہ ہیں۔ اس لئے کہ ایشیائی ہونے کی وجہ سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے درمیان یہی ایک رشتہ ہے جو یورپ کی دست درازیوں کے خلاف ہمیں متحد کرتا ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ جب کبھی میں نے اسپین میں یا صلیبی جنگوں میں عربوں کی لڑائیوں کا ذکر پڑھا ہے تو میری ہمدردی ہمیشہ انہیں کے ساتھ رہی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جانب داری نہ کروں اور صرف واقعات پر بحث کروں، لیکن چاہے جتنی کوشش

کروں جہاں ایشیائی لوگوں کا تعلق ہوتا ہے میری ایشیائیت کا اثر میری قوت فیصلہ پر ضرور پڑتا ہے۔

میں نے اسلامی تمدن کا مطلب سمجھنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں صرف ایک مٹھی بھر متوسط طبقہ کے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی جن پر ایرانی زبان اور ایرانی روایات کا اثر ہے، اور اگر عوام پر نظر ڈالی جائے تو اسلامی تمدن کی نشانی بظاہر یہ ہے، ایک خاص قسم کا پاجامہ جو نہ زیادہ لانبا ہو اور نہ زیادہ اونچا، ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کی تراش خراش اور داڑھی رکھنا اور ایک لوٹا جس میں ایک خاص قسم کی ٹونٹی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوؤں میں رواج ہے دھوتی پہننے کا، سر پر چوٹیا رکھنے کا اور ذرا مختلف قسم کا لوٹا رکھنے کا۔ درحقیقت یہ اختلافات بھی زیادہ تر شہری ہیں اور رفتہ رفتہ غائب ہوتے جا رہے ہیں، ورنہ ایک ہندو اور ایک مسلمان کسان اور کارخانہ کے مزدور میں مشکل ہی سے کوئی تمیز کی جا سکتی ہے۔ مسلمان تعلیم یافتہ شاذونادر داڑھی رکھتے ہیں، البتہ علی گڑھ والے ابھی تک ترکی ٹوپی کے فریفتہ ہیں (یہ ٹوپی ترکی کہلاتی ہے حالانکہ ترکی کو اب اس سے کوئی سروکار نہیں ہے) مسلمان عورتیں ساڑی پہننے لگی ہیں اور رفتہ رفتہ پردے سے بھی نکل رہی ہیں۔ میرا اپنا مذاق ان میں سے بعض عادات اور خصائل سے میل نہیں کھاتا اور مجھے داڑھی پسند ہے نہ مونچھیں نہ چوٹیا، لیکن مجھے اس کی بھی خواہش نہیں ہے کہ اپنے مذاق کے اصول وقوانین دوسروں پر عائد کروں۔ جہاں تک داڑھیوں کا تعلق ہے، امان اللہ خان نے کابل میں جب سرسری طور پر ان کا صفایا کرنا شروع کیا تو مجھے خوشی ضرور ہوئی تھی۔

ان ہندوؤں اور مسلمانوں کی حالت بھی حد درجہ درد انگیز ہے جو ہمیشہ ماضی کی طرف نظر رکھتے ہیں اور ہمیشہ انہیں چیزوں کو پکڑتے ہیں جو ان کی گرفت سے نکلتی چلی جا رہی ہیں۔ میں نہ ماضی کو برا کہتا ہوں نہ اس کو رد کرتا ہوں اس لئے کہ ہمارے

ماضی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو حسن و جمال میں یکتا ہیں اور بلا شبہ باقی رہنے والے بھی ہیں لیکن یہ لوگ اس حسن و جمال کو باقی رکھنے کے آرزومند نہیں بلکہ ایسی چیزوں کے پیچھے پڑے ہیں جو آئندہ رکھنے کے قابل ہی نہیں بلکہ مضر ہیں۔

اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے غازی مرد ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لئے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور ہی لئے جا رہے ہیں۔ ترکی کے جدید دستور اساسی میں ایک دفعہ تھی کہ ترکی اسلامی ریاست ہے، لیکن اس اندیشہ سے کہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کمال پاشا نے ۱۹۲۷ء میں اعلان کیا کہ دستور اساسی کی یہ دفعہ کہ ترکی ایک اسلامی ریاست ہے محض سمجھوتہ کے طور پر داخل کی گئی ہے اور مقصد یہ ہے کہ اولین موقع ملتے ہی اس کو خارج کر دیا جائیگا۔ میرا خیال ہے کہ جو اشارہ اس نے کیا تھا اس پر بعد میں اس نے عمل بھی کیا۔ مصر بھی اسی راستے پر جا رہا ہے گو نسبتاً بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ اور مذہب سے سیاست کو بالکل علیحدہ رکھتا ہے۔ یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت زیادہ پیچھے ہے، ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیاء کے لئے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ وطنیت کے پیچھے پیچھے اور بہت سے مسلک ہیں جو معاشرتی اور معاشی زبان میں گویا ہیں۔ ہاں مسلم قوم اور مسلم تمدن کا کیا ہو گا؟ کیا یہ آئندہ صرف شمالی ہند میں سرکار دولت مدار برطانیہ کے زیر سایہ پھلے پھولے گا؟

اگر ترقی کے معنی یہی ہیں کہ سیاست میں وسعت نظر سے کام لیا جائے تو آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا ہمارے فرقہ پرستوں نے اور حکومت نے جان بوجھ کر اور

متواتر اس کے بالمقابل تنگ نظری کو اپنا مقصود نظر قرار دیا ہے۔

یہ مقولہ ہانس کون کی کتاب مشرق کی تاریخ وطنیت سے نقل کیا گیا ہے

یہ ٹکڑا ہانس کون کی کتاب مشرق کی تاریخ میں وطنیت سے نقل کیا ہے

نوٹ:۔ یہ پوری تقریر سرسید کے مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز میں شائع ہوئی ہے۔ہم یہاں ان کی اصل تقریر کا وہ حصہ نقل کرتے ہیں جس کا پنڈت جواہر لال نے متن میں اقتباس دیا ہے۔

اگر کوئی ملک گورنمنٹ فتح کرے۔ برہما لے لے۔ افغانستان سے لڑے، اس سے صلح کرے۔ان سے ہم لوگ جو ملک کے باشندے ہیں کچھ سروکار نہیں رکھتے۔

اس کونسل میں چند ممبر تنخواہ دار ہیں۔علاوہ ان کے ہر صوبہ میں جو گورنمنٹ کی دانست میں نہایت ہوشیار اہلکار گورنمنٹ کے ہیں۔مثلاً کمشنر یا اور کوئی واقف کار حال صوبہ۔ جس نے مدت تک وہاں زندگی بسر کی ہے۔ عدالت کے کام فوجداری،کلکٹری کے کام سے اوراس ملک اوراس ملک کے حال سے واقف ہے ہر صوبہ سے بلاتی ہے۔ پنجاب سے اودھ، سے شمالی و مغرب، مدراس و بمبئی سے، اور ان کو مشورہ میں شریک کرتی ہے۔گورنمنٹ ہندوستانی رئیسوں میں سے جن کو اس کرسی پر بیٹھنے کے قابل اور باعتبار عزت کے مناسب سمجھتی ہے ان کو بھی بلاتی ہے۔ شاید اس بات پر لوگوں کو شبہہ ہوا ہو گا کہ باعتبار عزت کے کیوں بلاتی ہے۔باعتبار لیاقت کے کیوں نہیں بلاتی؟ اس کی بابت اے حضرات میں کچھ بیان کروں گا۔کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنے قوم یا ادنے درجہ کا آدمی خواہ اس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی اور گو وہ لائق بھی ہو ان پر بیٹھ کر حکومت کرے۔ان کے مال، جائیداد اور عزت پر حاکم ہو کبھی نہیں، کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا (چیرز)۔ گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے گورنمنٹ مجبور ہے

کہ سوائے معزز کے کسی کو نہیں بٹھا سکتی اور نہ وائسرائے اس کو (مائی کلیگ یا مائی آنز ایبل کلیگ) یعنی برادر یا معزز صاحب کہہ سکتا ہے نہ شاہانہ ڈنروں میں اور نہ شہنشاہی جلسوں میں جہاں (ڈیوک) اور (ارل) اور بڑے بڑے معززین شامل ہوتے ہیں بلایا جا سکتا ہے۔

بہر حال قانون میں کچھ نقص ہو یا نہ ہو مگر طریقہ بنانے کا ایسا ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ گورنمنٹ خودمختاری سے جو چاہتی ہے وہ کرتی ہے۔ہم رعایا کی رائے نہیں لیتی اور نہیں سنتی ہے اور جو لوگ عذر کرنا چاہتے ہیں ان پر غور نہیں کرتی بلکہ اس بیان کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ گورنمنٹ کوئی قانون جاری نہیں کرتی جب تک رعایا اور اخباروں کی رائے نہیں سن لیتی اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا حصہ قانون پر نہیں ہے۔ بے شک ہے اور بلاشبہ ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کچھ برطانوی امراء اور ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کونسل قائم کی گئی ہے جو ان دو انتہا پسند رجعت پسند عناصر کو متحد کرے اور اس اتحاد کو اور زیادہ فروغ دے۔

تعطل

دوبارہ گرفتاری اور سزایابی کا امکان مجھے برابر پریشان کرتا رہا یہ امکان اس لئے اور بھی قوی تھا کہ ملک پر آرڈی نینس اور اسی نوع کے دیگر قوانین کا رواج تھا اور خود کانگریس ایک خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی، برطانوی حکومت کی آئینی ساخت اور اپنی طبیعت کو دیکھتے ہوئے میری گرفتاری ناگزیر معلوم ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں کام اطمینان کے ساتھ جم کر نہیں کرسکتا تھا یہی فکر تھی کہ جتنا زیادہ کام ہو سکے جلد نبٹا دیا جائے۔

پھر بھی میں خواہ مخواہ کی گرفتاری مول لینا نہیں چاہتا تھا اور حتی الواسع ایسی کاروائیوں سے احتیاط سے احتیاط کرتا تھا جن سے میری گرفتاری عمل میں آئے اپنے صوبہ کے اکثر مقامات سے اور باہر سے بھی بہت سی دعوتیں آئیں کہ میں دورے پر نکلوں، لیکن میں نے ان سب کو مسترد کردیا اس لئے کہ تقریر کرنے کی غرض سے اس قسم کا دورہ ایک اندھا دھندوھاوے کی صورت کی اختیار کرلیتا جو یقین تھا کہ بیچ ہی سے یکا یک ختم کردیا جائے گا مگر میرے لئے کوئی اور درمیانی راستہ بھی نہ تھا، میں جب کبھی کسی دوسرے کام سے مثلاً گاندھی جی سے اور اراکین ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کرنے کہیں باہر گیا تو میں نے عام جلسوں میں نہایت آزادی سے تقریریں کیں۔ جبل پور میں ایک بڑا جلسہ ہوا اور نہایت شان دار جلوس نکلا اور دہلی کا اجتماع تو ان بڑے بڑے مجمعوں کے مقابلہ کا تھا جو میں نے وہاں دیکھے ہیں اور فی الحقیقت ان جلسوں کی کامیابی ہی سے یہ صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ حکومت بار بار اس قسم کے جلسوں کا انعقاد گوارا نہ کرے گی۔ بلکہ دہلی میں تو جلسہ کے بعد ہی میری گرفتاری کی افواہ بہت گرم تھی، لیکن بچ گیا اور الٰہ آباد واپس چلا آیا البتہ راستہ میں مسلم یونیورسٹی کے طلباء کے سامنے تقریر کرنے کے لئے علی گڑھ میں بھی اتر گیا۔

جب حکومت یوں ہر قسم کے مفید سیاسی کاموں کو روکنے کی کوشش کررہی تو اس

وقت غیر سیاسی پبلک کاموں میں حصہ لینے کا خیال مجھے بہت برا لگتا تھا۔ میں نے کانگریسیوں میں شدت کے ساتھ یہ میلان دیکھا کہ کانگریس کے کام سے جان بچا کر ایسے انٹ سنٹ کاموں میں لگتے جا رہے تھے جو اگر چہ بجائے خود پسندیدہ ہی مگر ہماری جدوجہد سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، یہ میلان طبع قدرتی لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کو تقویت نہ دینا چاہیے۔

وسط اکتوبر ۳۳ء میں صورت حال پر غور کرنے اور آئندہ کے لئے طریق کار کا فیصلہ کرنے کی غرض سے ہم لوگوں نے صوبہ متحدہ کے کارکنان کانگریس کے جلسے الہ آباد میں منعقد کیے، صوبہ کانگریس کمیٹی ایک غیر قانونی جماعت تھی اور ہم لوگوں کا منشا صرف مشاورت کرنا تھا نہ کہ قانون کی خلاف ورزی کرنا۔ اس لئے ہم نے اس کمیٹی کو باقاعدہ طلب بھی نہیں کیا تھا، ہم نے صرف ان تمام اراکین کو جو جیل سے باہر تھے نیز چند اور منتخب کارکنوں کو ایک غیر رسمی جلسہ میں مدعو کر لیا تھا۔ یہ جلسے بالکل نجی تھے مگر ان کے متعلق کوئی رازداری بھی نہیں کی گئی تھی، چنانچہ آخر وقت تک ہم لوگوں کی زیادہ توجہ واقعات عالم پر مبذول رہی مثلاً شدید کساد بازاری، جرمنی میں نازی تحریک اور کمیونزم وغیرہ وغیرہ، ہم چاہتے تھے کہ ہمارے ساتھی ہندوستان کی جدوجہد کا مطالعہ ان واقعات کے تعلق سے کریں جو دیگر ممالک میں پیش آ رہے ہیں۔ بالآخر کانفرنس نے ایک اشتراکی قرارداد منظور کی، جس میں ہمارے نصب العین کی توضیح اور تعریف کی گئی تھی اور یہ اعلان کیا کہ کانفرنس سول نافرمانی بند کر دینے کی مخالف ہے۔ ہم میں سے ہر شخص یہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وسیع پیمانہ پر سول نافرمانی کرنے کا اس وقت کوئی امکان نہیں بلکہ انفرادی سول نافرمانی بھی یا تو بہت جلد ختم ہو جائے گی یا بہت ہی محدود پیمانے پر جاری رہے گی۔ لیکن جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے سول نافرمانی جاری رکھنے یا نہ رکھنے سے کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ حکومت کی طرف سے حملے اور قوانین آرڈی نینس

کا نفاذ برابر جاری تھا۔ چنانچہ اور کسی غرض سے نہیں صرف اپنے طرز عمل کو ظاہر کرنے کی خاطر ہم نے رسمی طور پر سول نافرمانی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا لیکن اسی کے ساتھ ہم نے اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ اپنے کسی کام کو چھوڑ کر گرفتار ہونے کی کوشش نہ کریں، بلکہ اپنا معمولی کام کیے جائیں اور اگر اس سلسلہ میں گرفتار ہو جائیں تو خندہ پیشانی سے اس کو قبول کر لیں۔ انہیں خصوصیت کے ساتھ یہ ہدایت کی گئی کہ دیہاتی علاقوں سے اپنے تعلقات اور رواسطہ دوبارہ قائم کریں اور یہ معلوم کریں کہ تخفیف لگان اور حکومت کے تشدد سے کسانوں کا حال کیسا ہے اس وقت عدم ادائیگی لگان کی تحریک کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ تحریک پونا کانفرنس کے بعد ہی با قاعدہ روک دی گئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت حالات ایسے نہ تھا کہ اس کو دوبارہ شروع کیا جاتا۔

یہ پروگرام بہت ہی بے ضرر اور مدہم قسم کا تھا اور اس میں بظاہر کوئی بات ایسی خلاف قانون بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود ہم جانتے تھے کہ اس کی وجہ سے گرفتاریاں کی جائیں گی۔ چنانچہ جون میں ہمارے کارکن دیہاتوں میں گئے۔ ان کو گرفتار کر کے یہ الزام بالکل غلط طور پر لگایا گیا کہ وہ عدم ادائیگی لگان کا پرچار کرتے ہیں (جو آرڈیننس کے مطابق جرم قرار دیا گیا تھا) اور وہ سزایاب ہوئے، بہت سے رفقاء کار کی گرفتاری کے بعد میرا مقصد بھی دیہاتی علاقوں میں جانے کا تھا لیکن بعض اور کاموں میں لگ گیا اور مجھے اپنا دورہ ملتوی کرنا پڑا یہاں تک کہ اس کا وقت ہی نکل گیا۔

ان چند مہینوں کے دوران میں دو مرتبہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین پورے ہندوستان کی صورت حال پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ خود کمیٹی کا تو کوئی وجود نہ تھا اور یہ اس لئے نہیں کہ وہ ایک خلاف قانون جماعت تھی بلکہ اس لئے کہ گاندھی جی کے ایماء سے پونا کے فیصلہ کے بعد تمام کانگریس کمیٹیاں اور ان کے

دفاتر بند کر دیئے گئے تھے۔ میری حیثیت بھی اس وقت اتفاق سے کچھ عجیب ہو گئی تھی اس لئے کہ جیل سے نکلنے کے بعد میں نے خود اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے آپ کو کانگریس کا جنرل سیکرٹری کہنے پر مصر تھا، لیکن اپنے فرائض منصبی صرف ہوائی طور پر ادا کر سکتا تھا۔ نہ تو کوئی دفتر تھا، نہ عملہ نہ قائم مقام صدر۔ گاندھی جی صلاح و مشورہ کے لئے ضرور موجود تھے مگر وہ سارے ملک کا ایک عظیم الشان دورہ کرنے میں مشغول تھے اور اس مرتبہ ان کا یہ دورہ ہریجن تحریک کے لئے تھا، اس دورہ میں بھی ہم لوگوں نے کسی نہ کسی طرح جبل پور اور دہلی جا کر انہیں پکڑا اور ان کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کے اراکین سے صلاح و مشورہ کیا۔ ان ملاقاتوں میں مختلف اراکین کا اختلاف رائے بھی بہت صاف ظاہر ہو گیا۔ اور ایک تعطل سا پیدا ہو گیا۔ کوئی ایسی سبیل نہیں نکلتی تھی جو سب کے لئے قابل قبول ہوتی۔ جو لوگ سول نافرمانی بند کرنا چاہتے تھے اور جو اس کے مخالف تھے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کن ذات بس گاندھی جی کی تھی اور چونکہ وہ اس وقت آخر الذکر گروہ کی رائے سے متفق تھے اس لئے معاملات جس طرح سے تھے بدستور جاری رہے۔

مجالس قانون ساز کے انتخابات میں کانگریس کی طرف سے مقابلہ کرنے کے مسئلہ پر کارکنان کانگریس میں کبھی کبھی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر ورکنگ کمیٹی کے اراکین کو اس وقت اس مسئلے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال اس وقت کسی طرح پیدا بھی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس وقت اس مسئلہ پر بحث کرنا بدیہی طور پر قبل از وقت تھا، اصلاحات کا نفاذ کم از کم آئندہ دو تین سال تک ہوتا نظر نہیں آتا تھا، اور نہ اس وقت اسمبلی کے لئے جدید انتخاب کا کوئی تذکرہ تھا۔ ذاتی طور پر الیکشن لڑنے کے خلاف مجھے کوئی اصولی اعتراض نہ تھا، اور مجھے اپنی جگہ پر پورا یقین تھا کہ جب وقت آئے گا تو کانگریس کو اس میں حصہ لینا ہی پڑے گا، لیکن اس وقت اس سوال کو پیدا کرنے کے معنی یہ تھے کہ توجہ دوسری طرف ہو جائے، میرا یہ خیال تھا کہ

اگر ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں تو جو مسائل درپیش ہیں وہ صاف اور واضح ہو جائیں گے اور اپنے اصولوں کو چھوڑ کر سمجھوتہ کرنے والے لوگوں کو معاملات پر حاوی ہونے سے روکا جاسکے گا۔

اس دوران میں برابر مضامین اور بیانات اخبارات کو بھیجتا رہا۔ کسی حد تک مجھے اپنی تحریروں کو نرم اور ملائم بنانا پڑا، اس لئے کہ وہ اشاعت کی غرض سے لکھی گئی تھیں اور ادھر سنسر صاحب موجود تھے اور مختلف قوانین تھے جن کی گرفت کے پنجوں کی طرح بہت دور تک پہنچتی تھی اور میں اگر ان خطرات میں پڑنے کے لیے تیار بھی ہوتا تو طابع اور ناشر اور مدیر اس کے لئے آمادہ نہ تھے، بہر حال مجموعی حیثیت سے اخبارات نے مجھ پر عنایت کی اور بہت سی باتیں میری تائید میں لکھیں۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات میرے بیانات اور مضامین کے حصہ کے حصہ حذف کر دیئے جاتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو میرا ایک پورا اور طویل مضمون جس کو میں نے بڑی محنت سے لکھا تھا شائع ہی نہیں ہوا۔ جنوری ۳۴ء میں جب میں کلکتہ میں تھا تو ایک مقتدر روزنامہ کے مدیر صاحب مجھ سے ملنے تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے آپ کا ایک بیان کلکتہ کے جملہ اخبارات کے مدیر خصوصی کے پاس استصواب رائے کے لیے بھیجا تھا، اور چونکہ انہوں نے اس کو مسترد فرما دیا اس لئے وہ شائع نہیں کیا گیا یہ مدیر خصوصی کلکتہ گورنمنٹ پریس کے سنسر صاحب تھے۔

میں نے اپنے بعض بیانات میں اور اخبارات کے نمائندوں سے گفتگو کے دوران میں چند افراد اور جماعتوں پر نکتہ چینی کی تھی، اس پر اظہار ناراضگی کیا گیا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا اور گاندھی جی نے بھی اس خیال کو پھیلانے میں مدد دی تھی کہ کانگریس پر بلا خوف انتقام ہر طرح کے حملے کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ خود گاندھی جی نے اس کی ایک مثال قائم کر دی تھی اور بعض سربرآوردہ کانگریسی بھی حسب مراتب ان کا اتباع کیا کرتے تھے اگر چہ سب نہیں۔

وجہ یہ تھی کہ علی العموم ہم لوگ مبہم اور دور از کار باتیں کیا کرتے تھے۔ جس سے ہمارے نکتہ چینیوں کو موقع ملتا تھا کہ غلط استدلال اور موقع پرستی کی چال بازیوں سے ہماری باتوں کو لے اڑیں اور پھر دونوں طرف سے اصل مسائل پر بحث کرنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے بحث و مباحثے جو دیانت داری سے کیے جائیں اور جن میں موقع بموقع وار اور بچاؤ کی نوبت بھی آئے شاذ و نادر ہی ہوتے تھے جیسے کہ ان مغربی ممالک میں ہوا کرتے ہیں۔ جہاں تحریک فاشزم رائج نہیں ہوئی ہے۔

ایک خاتون دوست نے جن کی رائے کی میں قدر کرتا ہوں مجھے لکھا تھا کہ اخبارات میں تمہارے بعض مضامین کا زور دیکھ کر مجھے ذرا تعجب سا ہوا کہ تم تو بالکل کٹ کھنے ہوتے جاتے ہو۔ میں نے سوچا کہ کیا یہ کیفیت اس وجہ سے ہوگئی ہے کہ مجھے مایوسیاں ہوئی ہیں۔ شاید کسی حد تک تو یہ بات صحیح ہے اس لئے کہ قومی حیثیت سے تو ہم سب ہی لوگ مایوسی کے مرض میں مبتلا ہیں اور انفرادی طور پر بھی میرے نزدیک یہ بات ضرور صحیح ہوگی لیکن خود مجھے اس کا پورا پورا احساس نہ تھا شاید اس وجہ سے کہ ذاتی طور پر مجھے اپنی ناکامی یا درماندگی کا مطلق کوئی خیال ہی نہیں پیدا ہوا۔ سیاسی حیثیت سے گاندھی جی کا میرا ساتھ جب سے ہوا ہے میں نے کم از کم ایک بات ان سے ضرور سیکھی ہے کہ نتائج کے ڈر سے اپنے خیالات کو اپنے دل میں دبائے نہ رکھوں سیاسی میدان میں اس عادت سے (دوسرے میدانوں میں تو کم از کم اس پر عمل کرنا زیادہ خطرناک ہے) مجھے بسا اوقات بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس سے بڑا اطمینان بھی ملا ہے اور میرا خیال ہے کہ اسی عادت کی بدولت ہم میں سے اکثر لوگ قلبی تکلیف اور رنج سے اور بدترین قسم کی مایوسیوں سے بچ گئے ہیں۔ یہ معلوم کر کے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کسی سے محبت کرتی ہے بڑا تشفی بخش اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور احساس شکست اور مایوسی کے مرض کے لئے یہ بڑا تریاق بھی ہے۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ تکلیف دہ

احساس انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے، اور سبھوں نے اس کو فراموش کر دیا ہے۔

اس سب کے باوجود انسان کو اس رنج و محن کی عجیب و غریب دنیا میں بھلا احساس مایوسی سے کس طرح مفر ہو سکتا ہے۔ بار بار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام غلط ہو رہا ہے اور اگرچہ کام جیسے تیسے جاری رہتا ہے اور پھر بھی جب ہم اپنے اردگرد کی انسانی خلقت کے خصائل پر نظر ڈالتے ہیں تو طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ بسا اوقات مختلف واقعات اور حالات پر بلکہ اشخاص اور جماعتوں پر بھی غم اور غصہ کے جذبات طاری ہوتے ہیں اور اب کچھ عرصہ سے تو میرا غصہ اور برہمی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ جب میں زندگی کے متعلق لوگوں کے آرام طلب طرز عمل کو دیکھتا ہوں نیز یہ کہ کس طرح اہم ترین امور سے چشم پوشی کی جاتی ہے بلکہ ان کا ذکر تک اس لئے نامناسب خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا اثر یا تو کسی کی جیب پر پڑتا ہے یا مرغوب خاطر تعصّبات پر، لیکن باوجود اس غصہ اور برہمی کے اور باوجود مایوسیوں کے اور اپنے کٹ کھنے ہونے کے اپنے متعلق مجھے یہ حسن ظن ضرور ہے کہ خود اپنی اور دوسروں کی حماقتوں پر ہنسنے اور قہقہے لگانے کی خداداد قابلیت مجھ میں ہنوز مفقود ہوئی ہے۔

ایک رحیم و کریم خدا پر لوگوں کا ایمان دیکھ کر مجھے بعض اوقات بہت تعجب ہوتا ہے کہ پیہم دھچکوں کے بعد یہ کس طرح قائم رہتا ہے اور کس طرح خود تباہیاں اور بربادیاں اور ایسی باتیں جن سے صفت رحیمی کا بطلان ہو صحت ایمان اور اعتقاء کی پختگی جانچنے کے لئے بس آزمائشیں سمجھی جاتی ہیں، رچرڈ ہاپکنس کے اندسرورانگیز اشعار کی صدائے بازگشت اکثر قلب محسوس کرتے ہوں گے۔

"اے میرے مولا اگر میں تیرے ساتھ تکرار کرتا ہوں تو حق
تیری طرف ہے لیکن جس بات کے لئے میں لڑتا ہوں وہ بھی تو حق

بجانب ہے؟ آخر تیرے گنہگار بندوں کے طور طریقے اس دنیا میں کیوں کامیاب ہوتے ہیں اور میری تمام سعی اور کوششیں مایوسی اور ناکامی پر کیوں ختم ہو جاتی ہیں تو جو میرا دم ساز ہے اگر تو بھی میرا دشمن ہوتا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تو اس سے زیادہ اور کون سی برائی میرے ساتھ کرتا جو تو مجھے شکست دینے اور کامیابی سے روکنے کے لئے کرتا ہے؟ افسوس کہ شراب میں مدہوش رہنے والے اور ہوا و ہوس کے بدمست بندے فارغ اوقات میں زیادہ خوش اور اطمینان سے رہتے ہیں جتنا کہ یہ عاجز بندہ جو تیری راہ میں اپنی ساری عمر گنوا رہا ہے۔"

اعتقاد خواہ ترقی پر ہو خواہ کسی تحریک اور نصب العین پر یا انسانی کی نیکی اور انسانی تقدیر پر، کیا یہ سب قریب قریب اعتقاد الٰہی سے ملتے جلتے نہیں؟ اگر ہم ان کی توجیہ عقل سے اور منطق سے کرنا چاہیں تو فوراً مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں، لیکن ہمارے سینوں میں کوئی چیز ہے جو اس اعتقاد اور آس کو پکڑے رہتی ہے ورنہ اگر زندگی اس سے بھی محروم کر دی جائے تو پھر وہ ایک ایسے دشت ویراں کے مانند ہو جائے جس میں کوئی نخلستان تک نہ ہو۔

میرے اشتراکی پروپیگنڈے کا جو اثر ہوا اس سے میرے ورکنگ کمیٹی کے رفقائے کار بھی گھبرا گئے۔ میں تو کئی سال سے یہ پروپیگنڈ جاری رکھ سکتا ہوں۔ اس لئے مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ بعض اراکین ورکنگ کمیٹی کی رائے میں مجھے یہ آزادی حاصل نہ تھی اور وہ برہم تھے کہ میں ان کے متعلق بھی غلط فہمی پیدا کر رہا ہوں، لیکن میں اس کے علاوہ اور کیا کرتا؟ میں اس چیز کو ترک نہیں کر سکتا تھا جس کو میں اپنے کام کا سب سے زیادہ اہم جزو سمجھتا تھا بلکہ اگر ان دونوں میں کوئی تصادم ہوتا تو میں شاید یہ گوارا کرتا کہ ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو جاؤں لیکن میں

استعفے کیسے دیتا جب کہ ورکنگ کمیٹی خلاف قانون جماعت تھی اور باقاعدہ طور پر اپنے فرائض منصبی تک ادا نہیں کرتی تھی۔

یہی دشواری ایک بار پھر بعد میں پیش آئی۔ غالبا دسمبر کا یہ آخری زمانہ تھا جب گاندھی جی نے مجھے مدراس سے خط لکھا اور اخبار مدراس میل کا ایک تراشہ بھیجا جس میں ان کی وہ گفتگو نقل کی گئی تھی جو اخبار مذکور کے نمائندہ سے انہوں نے کی تھی۔ نمائندہ نے میرے متعلق ان سے دریافت کیا تھا اور انہوں نے جواب میں میری کاروائیوں کے متعلق تقریباً اظہار افسوس کیا تھا لیکن میری دیانتداری کے متعلق اپنا پورا اعتماد ظاہر کیا تھا کہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کانگریس کو ان جدید طریقوں کا پابند بناؤں میرے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا اس پر خصوصیت کے ساتھ مجھے کوئی گمان نہیں گزرا لیکن جس بات نے مجھے زیادہ پریشان کیا وہ یہ تھی کہ اس گفتگو کے دوران میں آگے چل کر گاندھی جی نے بڑی بڑی زمینداریوں کے نظام کی حمایت کی تھی۔ ان کا یہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ یہ نظام ہماری دیہی اور قومی معیشت کا ایک مفید حصہ ہے۔ مجھے اس سے سخت حیرت ہوئی اس لئے کہ آج کل بڑی زمینداریوں اور تعلقداریوں کے حامی بہت کم ملیں گے۔ دنیا بھر میں ان کا خاتمہ ہو چکا ہے اور ہندوستان میں بھی اکثر لوگ یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ زیادہ عرصے تک یہ باقی نہیں رہ سکتی۔ خود زمیندار اور تعلقہ دار خوش ہوں گے اگر یہ نظام ختم کر دیا جائے بشرطیکہ اس کا معقول معاوضہ ملے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ نظام خود اپنے ہی بوجھ سے دب کر ڈوب رہا ہے پھر بھی گاندھی جی اس کے حامی ہیں اور اس کی تولیت وغیرہ کے متعلق گفتگو کرتے رہے، میں نے پھر اس بات پر غور کیا کہ ان کا مطمع نظر مجھ سے کس قدر مختلف ہے اور اس فکر میں پڑ گیا کہ آئندہ کہاں تک میرا اور ان کا اشتراک عمل ہو سکے گا۔ کیا ورکنگ کمیٹی میں میرا رہنا بدستور ضروری ہے؟ اس وقت تو اس کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا اور چند ہفتہ بعد

میرے جیل خانہ واپس جانے کی وجہ سے یہ سوال ہی بے محل ہوگیا۔

خانگی معاملات نے میرا بہت سا وقت لے لیا، والدہ کی صحت رو بہ ترقی رہی مگر بہت آہستہ آہستہ وہ اب بھی صاحب فراش تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے مالی معاملات کی طرف متوجہ ہوا جو ایک عرصہ سے بالکل ابتری میں پس پشت پڑے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اپنی استطاعت سے بہت زیادہ خرچ کرتے چلے جا رہے تھے اور اخراجات کم کرنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی کہ اخراجات آمدنی کے مطابق ہو جائیں بلکہ میں تو خوشی کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب میرے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ جدید دنیا میں روپیہ پیسہ اور املاک مفید ضرور ہیں لیکن اکثر اوقات اس شخص کے لئے جو ایک طول طویل سفر کی ٹھان رہا ہو یہ بار بھی بن جاتے ہیں۔ روپے پیسے والے لوگوں کے لئے ایسے کاموں میں حصہ لینا بہت مشکل ہو جاتا ہے جن میں خطرات ہوں۔ انہیں ہمیشہ اپنے مال و اسباب کے ضائع ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ ایسے زر و مال اور جائیداد سے فائدہ ہی کیا کہ حکومت جب چاہے اس پر قبضہ کر لے اور زبردستی اسے بحق سرکار ضبط کر لے؟ اس لئے جو کچھ تھوڑا بہت میرے پاس ہے اس سے گویا چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہم لوگوں کی ضروریات بہت تھوڑی تھیں اور مجھے پورا اعتماد تھا کہ میں اپنی قابلیت سے اتنا کما سکتا ہوں۔ مجھے صرف اتنی فکر تھی کہ والدہ کو اخیر عمر میں کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے اور انکے معیار زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہ ہونے پائے۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ میری لڑکی کی تعلیم میں جس کے لئے یورپ کا قیام میرے خیال کے بموجب ضروری تھا کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو، اس کے علاوہ روپیہ کی کوئی خاص ضرورت نہ مجھے تھی نہ میری بیوی کو، یا یوں کہا جائے کہ ایسا ہم لوگوں کا خیال تھا کہ صحیح معنوں میں کبھی روپیہ پیسہ کی تکلیف اٹھانے کی ہم لوگ عادی نہیں رہے تھے، چنانچہ مجھے یہ یقین ہے کہ جب وہ وقت آ جائے گا کہ ہم

کو بھی روپے کی قلت محسوس ہو تو ہم اس سے خوش نہ ہوں گے۔ اور ایک اسراف جس کو میں نے ابھی تک جاری رکھا ہے اس کو ترک کرنا میرے لئے بہت مشکل ہو جائے گا اور یہ کتابوں کی خریداری ہے۔

اپنی مالی حالت فوری طور پر درست کرنے کی غرض سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ بیوی کے زیورات، چاندی کی یا اسی قسم کی اور چیزیں جو ہمارے پاس تھیں اور اس کے علاوہ کئی چھکڑوں بھر مختلف قسم کا سامان گرہستی فروخت کر دیا جائے۔ زیورات علیحدہ کر دینے کی تجویز کملا کو پسند نہ تھی حالانکہ گزشتہ دس بارہ سال سے اس نے ایک زیور بھی نہیں پہنا تھا، سب بنک میں رکھے ہوئے تھے لیکن اس کی یہ آرزو تھی کہ یہ سب اپنی بیٹی کے حوالے کر دے۔

یہ جنوری ۳۲ء کا زمانہ تھا۔ ضلع الہ آباد کے دیہاتوں میں ہمارے کارکنوں کے بے ضرر مشاغل کے باوجود ان کی مسلسل گرفتاریوں کا تقاضا یہ تھا کہ ہم لوگ بھی ان کے نقش قدم پر جائیں اور انہیں دیہاتوں کا دورہ کریں۔ صوبہ متحدہ کی صوبہ کانگریس کمیٹی کے بہت ہی کام کرنے والے سیکرٹری رفیع احمد قدوائی بھی جیل میں تھے، ۲۶ جنوری کو یوم آزادی بھی قریب آ رہا تھا اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے کہ باوجود آرڈیننس اور امتناعی احکام کے ۱۹۳۰ء سے یہ دن ہر سال پابندی کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں منایا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس معاملہ میں رہنمائی کون کرے؟ اور پھر یہ کہ لوگوں کو ہدایت کس بات کی دی جائے۔ میرے علاوہ اور کوئی تھا نہیں جو آل انڈیا کانگریس کے عہدہ دار کی حیثیت سے عملی نہ سہی نظری طور پر بھی فرائض منصبی ادا کر رہا ہو۔ میں نے چند احباب سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے اس پر اتفاق نہ تھا۔ عام رجحان خیال میں نے یہ دیکھا کہ ایسی کارروائیوں سے اجتناب کیا جائے جن کی وجہ سے وسیع پیمانہ پر گرفتاریاں عمل میں آئیں، بالاخر یوم آزادی منانے کے متعلق میں نے ایک مختصر اپیل شائع کی اور یہ معاملہ کہ کس

صورت یہ دن منایا جائے، مقامی طور پر ہر علاقہ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا۔ خود الہ آباد میں ہم لوگوں نے تمام ضلع میں وسیع پیانہ پر یوم آزادی منانے کا اہتمام کیا۔

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ جشن یوم آزادی کے منتظمین اس دن گرفتار ہو جائیں گے۔ اس لئے قبل اس کے کہ میں جیل خانہ واپس جاؤں، میں بنگال کا ایک دورہ کرنا چاہتا تھا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اپنے قدیم رفقائے کار سے وہاں ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن اصل غرض یہ تھی کہ گذشتہ چند سال سے اہل بنگال جو مصائب برداشت کرر ہے ہیں اس کی داد دی جائے اور اس طریقہ سے اعتراف کیا جائے۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی اعانت اور مدد کے لئے میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے اور محض اظہار ہمدردی اور شرکت غم سے کچھ بہت فائدہ نہیں پہنچتا تاہم یہ بھی غنیمت ہے اور اس وقت بنگال خصوصیت کے ساتھ اپنی کسمپرسی کو محسوس کر رہا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ مصیبت کے وقت میں پورے ہندوستان نے اسے فراموش کر دیا۔ ان کا یہ خیال صحیح تو نہ تھا مگر بہر حال وہ سمجھتے یہی تھے۔

مجھے کملا کے ساتھ کلکتہ اس لئے بھی جانا تھا کہ وہاں اس کے علاج کے متعلق ڈاکٹروں سے مشورہ کروں۔ اس کی حالت کسی طرح بھی قابل اطمینان نہ تھی لیکن ہم دونوں نے ایک حد تک اس کی کوئی پرواہ نہ کی تھی اور کلکتہ یا کسی دوسری جگہ جانے کا خیال ملتوی کرر کھا تھا کہ جہاں زیادہ مدت تک علاج کے لئے ٹھہرنا پڑے۔ جیل خانہ کے باہر میری تھوڑے دنوں کی رہائی کے زمانہ میں ہم دونوں چاہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، پھر جب میں جیل خانہ چلا جاؤں گا تو ڈاکٹروں سے ہر مشورہ اور علاج کے لئے اس کو بہت کافی وقت ملے گا، اور اب چونکہ گرفتاری کا وقت بظاہر قریب آ گیا تھا اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کلکتہ جا کر اپنی موجودگی میں کم از کم ڈاکٹروں کو دکھلا دیا جائے باقی بعد میں ہوتا رہے گا۔

چنانچہ میں اور کملا نے ۱۵ جنوری کو کلکتہ جانا طے کیا اور یہ ارادہ تھا کہ ایسے وقت

پر واپس آجاؤں کہ یوم آزادی کے جلسوں میں شریک ہو سکیں ۔

۱۔ مسٹر پی ، ان ٹیگور صدر مجلس استقبالیہ آل بنگال زمیندار کانفرنس نے اپنے خطبہ صدارت میں ۲۳ دسمبر ۱۹۳۴ کو کہا تھا ۔ کہ ذاتی طور پر مجھے اس دن بالکل افسوس نہ ہوگا ۔ جب زمینداروں کو مناسب معاوضہ دے کر جائدادیں قومی ملک بنالی جائیں جیسا کہ آئر ستان میں کیا گیا تھا ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے ۔ کہ بندوبست استمراری کی وجہ سے بنگال کے زمیندار دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں جہاں بندوبست استمراری نہیں ہے زیادہ بہتر حالت میں ہیں ۔ لیکن مسٹر پی ، ان ٹیگور کے خیالات زمینوں کو قومی ملکیت بنانے کے متعلق بہت مبہم معلوم ہوتے ہیں ۔

زلزلہ

۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو سہ پہر کے وقت میں الہ آباد میں اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑا کسانوں کی ایک جماعت سے باتیں کر رہا تھا۔ سالانہ ماگھ میلہ شروع ہو چکا تھا اور دن بھر ہمارے یہاں ملنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ دفعتہً میرے پیر لڑکھڑانے لگے مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اور قریب کے ایک کھمبے کا سہارا لینا پڑا۔ سارے گھر کے کواڑ دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔ سوراج بھون قریب ہی تھا وہاں سے ایک گھڑ گھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی اس لئے کہ بہت سے کھپرے لڑھک لڑھک کر چھت کے نیچے گر رہے تھے۔ مجھے زلزلے سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا اس لئے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے مگر پھر فوراً ہی خیال آیا کہ یہ زلزلہ ہے۔ مجھے اس نئے تجربے میں ایک طرح کا لطف آ رہا تھا میں سلسلہ گفتگو جاری رکھا اور کسانوں کو زلزلہ کا حال بتانے لگا۔ میری بوڑھی چچی کچھ دور سے چلائیں کہ بھاگ کر باہر چلے جاؤ مگر مجھے یہ بات مہمل معلوم ہوئی۔ میں نے زلزلے کو کوئی اہمیت نہ دی اور پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا میں اپنی بوڑھی ماں کو جو کوٹھے پر بستر علالت پر پڑی ہوئی تھیں اور اپنی بیوی کو جو غالباً وہیں سامان سفر باندھ رہی تھی چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر کرتا۔ کچھ دیر جھٹکوں کا سلسلہ جاری رہا پھر ختم ہو گیا۔ چند منٹ زلزلہ کے موضوع پر گفتگو رہی اس کے بعد قریب قریب سب اسے بھول گئے۔ اس وقت ہمیں سان گمان بھی نہ تھا کہ ان چند لمحوں میں بہار اور دوسرے مقامات پر لاکھوں آدمیوں پر کیا کچھ گذر گئی۔

اسی دن شام کو میں اور کملا کلکتے روانہ ہو گئے۔ رات کو ہم بے خبری کی حالت میں زلزلہ کے جنوبی رقبے میں ہو کر گذرے۔ دوسرے دن اس حادثے کا کلکتہ میں کچھ چرچا نہیں تھا۔ اگلے دن تھوڑی تھوڑی خبریں آنے لگیں۔ چوتھے دن ہمیں اس ہولناک حادثہ کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ کلکتہ پہنچتے ہی ہم اپنے کاموں میں مشغول

ہو گئے بہت سے ڈاکٹروں سے متعدد مرتبہ ملے اور یہ قطعی طور پر طے کیا گیا کہ کملا علاج کے لئے مہینے دو مہینے بعد واپس آئے گی۔ بہت سے احباب اور کانگریسی رفقاء ایسے تھے جن سے ایک مدت سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ہر جگہ ایک افسردگی کی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ لوگ بڑی مصیبتیں اٹھا چکے تھے اس لئے اب قریب قریب کام کے لئے قدم اٹھاتے ڈرتے تھے کہ کہیں انہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔

یہاں کے اخبارات ہندوستان کے دوسرے مقامات کے مقابلے میں زیادہ محتاط تھے۔ اور مقامات کی طرح یہاں بھی لوگ آئندہ کام کے بارے میں شبہے اور الجھن میں پڑے ہوئے تھے۔ اصل میں یہی شبہات ہر قسم کی سیاسی جدوجہد میں مانع تھے ورنہ خوف کچھ زیادہ نہ تھا۔ ایک طرف فاشستی رجحانات تھے دوسری طرف اشتراکی اور اشتمالی رجحانات مگر سب مبہم تھے اور ایک دوسرے سے غلط ملط ہو گئے تھے۔ ان جماعتوں کی حدود معین کرنا بہت دشوار تھا۔ میرے پاس اتنا وقت تھا اور نہ اس کا موقع تھا کہ تخویفی تحریک کے متعلق کچھ زیادہ دریافت حال کر سکوں جس کی طرف حکومت اس قدر متوجہ تھی اور دنیا بھر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھی۔ جہاں تک مجھے اندازہ ہو سکا یہ تحریک کوئی سیاسی اہمیت نہیں رکھتی اور خود اس جماعت کے پرانے ارکان اب اس کے قائل نہیں رہے۔ ان کے خیالات کا رخ بدل گیا ہے البتہ بنگال میں حکومت کے تشدد سے مشتعل ہو کر کہیں کہیں بعض افراد اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ایک ذاتی لڑائی سی چھڑ گئی۔ سچ پوچھئے تو دونوں کے طرزِ عمل میں جنگ انتقام کا رنگ تھا۔ تخویف پسندوں کی حرکتوں میں تو یہ رنگ بالکل ظاہر تھا۔ حکومت کی طرف سے بھی یہ نہیں تھا کہ ان حرکتوں کو خلاف معاشرت جرائم سمجھ کر سکون کے ساتھ ان کے انسداد کی تدبیریں سوچی جائیں بلکہ وہی صورت تھی جیسے انتقام جنگ میں حریفوں سے بدلہ لیا جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر حکومت جس کو تخویفی حرکتوں سے سابقہ پڑے گا اس پر مجبور ہوگی کہ ان کا مقابلہ اور انسداد کرے مگر حکومت کی

شان یہ ہے کہ اطمینان اور وقار کے ساتھ ان مشکلات پر قابو حاصل کرے نہ یہ کہ بلا تفریق مجرموں اور بے گناہوں، بلکہ زیادہ تر بے گناہوں پر کیونکہ ان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے حد سے زیادہ تشدد شروع کردے۔ شاید ایسے خطرے کے وقت اوسان قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ تخویف کی حرکتیں بہت ہی کم ہوتی جاتی تھیں لیکن ان کا امکان ہر وقت موجود تھا اور جن لوگوں کو ان سے سابقہ تھا انہیں بدحواس کرنے کے لئے یہی بات کافی تھی یہ ظاہر ہے کہ یہ حرکتیں خود مرض نہیں بلکہ مرض کی علامتیں ہیں اور اصل مرض کو چھوڑ کر علامات کا علاج کرنا بے سود ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ بہت سے نوجوان مرد اور عورتیں جن کی بابت یہ بات سمجھا جاتا ہے کہ انہیں تخویف پسندوں سے تعلق ہے، حقیقت میں اس وجہ سے ان کی طرف کھنچتے ہیں کہ خفیہ کاروائیوں میں ایک خاص کشش ہوتی ہے۔ من چلے نوجوانوں کی طبیعتیں ہمیشہ چھپی ہوئی باتوں اور خطرات کی جانب مائل ہوتی ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ حالات سے باخبر ہوں اور پتہ چلائیں کہ یہ شوروغوغا کس بات کا ہے اور میں پس پردہ کون لوگ کام کر رہے ہیں۔ گویا جاسوسی کے قصوں کا ذوق انہیں کھینچتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ ارادہ ہرگز نہیں ہوتا کہ خود بھی کچھ کریں خصوصا کسی تخویفی حرکت سے انہیں قطعا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن پولیس کے نزدیک صرف ان کا مشتبہ لوگوں سے ربط ضبط رکھنا اس کے لئے کافی ہے کہ وہ بھی مشتبہ قرار دئے جائیں۔ اس لئے تھوڑے دن کے بعد اگر وہ اور زیادہ سخت مصیبت میں گرفتار نہ ہو گئے تو نظر بندوں کے کیمپ میں پہنچ جاتے ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قابل فخر کارناموں میں سے ایک کارنامہ نظم کا قیام اور قانون کا نفاذ ہے۔ میں بھی طبعاً امن پسند ہوں۔ ضبط و نظم کو اچھا سمجھتا ہوں اور بدامنی اور ابتری کو برا سمجھتا ہوں لیکن تلخ تجربات کی بنا پر اس نظم و قانون کی قدر و قیمت مجھے مشکوک نظر آتی ہے جو سلطنتیں اور حکومتیں رعایا پر

نافذ کرتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی جو قیمت ادا کرنی پڑی ہے وہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قانون کے معنی ہیں غالب طبقہ کی مرضی اور نظم نتیجہ ہے اس عام خوف کا جو سب پر طاری ہے۔ سچ پوچھئے تو بعض اوقات اس نام نہاد نظم و آئین کو بے نظمی اور بے آئینی کہنا زیادہ صحیح ہے۔ جس کارنامے کی بنیاد عام خوف و دہشت پر ہو اس کو مشکل سے پسندیدہ کہا جا سکتا ہے اور جو امن حکومت کے آلات جبر پر مبنی ہو اور بغیر ان کے قائم نہ رہ سکتا ہو وہ بمقابلہ آئینی حکومت کے فوجی تسلط سے زیادہ مشابہ ہے۔

راج ترنگنی ایک ہزار سال کی پرانی اور کلہان شاعر کی لکھی ہوئی کاشمیری تاریخی نظم ہے اس میں جو الفاظ نظم و قانون کے معنی میں بار بار آتے ہیں جن کا قائم رکھنا حکمران اور حکومت کا فرض قرار دیا گیا ہے وہ دھرم اور ابھائے ہیں یعنی راست بازی اور بے خوفی۔ یہاں قانون معمولی قانون سے برتر چیز ہے اور نظم رعایا کی بے خوفی کا نام ہے۔ لوگوں کو خوف زدہ کر کے نظم قائم کرنے کے بجائے بے خوفی کی تلقین کرنے کا خیال کتنا پاکیزہ ہے۔ کلکتے میں ہم لوگوں کے ساڑھے تین دن صرف ہوئے اور اس عرصے میں میں نے تین عام جلسوں میں تقریریں کیں۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی میں نے تخویف کی مذمت کی اور اس کے خلاف دلائل پیش کئے۔ اس کے بعد ان تدابیر سے بحث کی جو صوبہ بنگال میں حکومت نے اختیار کی تھیں۔ میں نے بڑے جوش میں تقریر کی کیونکہ اس صوبے میں جو واقعات پیش آ چکے تھے ان کے حالات سن کر میں بہت متاثر تھا۔ مجھے اس طرز عمل سے حد درجہ تکلیف پہنچی کہ انسانوں کے گروہ بلا تفریق بھیڑ بکری کی طرح باڑوں میں بند کر دیئے گئے۔ یہ انسانی وقار کی توہین تھی۔ سیاسی مسئلہ کتنا ہی اہم ہی مگر یہ انسانی مسئلہ اس وقت اس سے مقدم تھا۔ یہی تین تقریریں تھیں جن کی بنیاد پر بعد کو مجھ پر کلکتہ میں مقدمہ چلایا گیا اور وہ سزا جو آج میں کاٹ رہا ہوں انہیں کی وجہ سے ہوئی۔

کلکتہ سے ہم لوگ رابندرناتھ ٹیگور سے ملنے شانتی نکیتن گئے۔ ان سے مل کر

ہمیشہ طبیعت کو فرحت ہوتی تھی اس لئے اس قدر قریب آجانے کے بعد ہمارا جی نہ مانا کہ ان سے ملے بغیر چلے جائیں۔اس سے پہلے میں دوبار شانتی نکتین آچکا تھا۔ کملا پہلے پہل آئی تھی اور اس مدرسے کو دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ ہم لوگ یہ ارادہ کر رہے تھے کہ اپنی لڑکی کو وہاں بھیج دیں۔اندرا کچھ دنوں میں میٹریکولیشن کے امتحان میں شریک ہونے والی تھی اور اس کی آئندہ تعلیم کا مسئلہ ہمیں پریشان کر رہا تھا۔میں اس کے بالکل خلاف تھا کہ وہ کسی باقاعدہ سرکاری یا نیم سرکاری یونیورسٹی میں داخل ہو کیونکہ ان یونیورسٹیوں کو میں ناپسند کرتا تھا۔ان کا ماحول بالکل سرکاری، جابرانہ اور تحکم پسندانہ ہے۔اس میں شک نہیں کہ گذشتہ زمانہ میں ان یونیورسٹیوں نے بڑے بڑے قابل مرد اور عورتیں پیدا کی ہیں اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔لیکن یہ چند مستثنیات ان یونیورسٹیوں کو اس الزام سے نہیں بچا سکتیں کہ وہ نوجوانوں کے لطیف احساسات کو کچل دیتی ہیں۔شانتی نکتین نے اس استبداد سے بچنے کی صورت نکالی تھی۔اس لئے ہم نے اسی کو منتخب کیا، اگرچہ بعض باتوں کے لحاظ سے وہ دوسری یونیورسٹیوں سے پیچھے تھا۔

واپسی پر ہم پٹنہ میں ٹھہرے کہ زلزلے کے مصائب سے نجات دلانے کے مسئلے میں راجندر بابو سے گفتگو کریں۔وہ ابھی جیل سے چھوٹے تھے اور غیر سرکاری طور پر امداد پہنچانے کا کام لامحالہ انہیں کو شروع کرنا پڑا۔ہم لوگوں کا وہاں پہنچنا بالکل خلاف توقع تھا اس لئے کہ ہمارا کوئی تار انہیں نہیں پہنچا تھا۔جس مکان میں ہم کملا کے بھائی کے ساتھ ٹھہرنے والے تھے وہ ایک کھنڈر بن گیا تھا۔یہ بہت بڑا اپختہ دومنزلہ مکان تھا۔اس لئے ہم لوگوں نے بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح میدان ہی میں قیام کیا۔

دوسرے دن میں مظفر پور دیکھنے گیا۔زلزلے کو پورے سات روز گذر چکے تھے لیکن سوائے چند خاص خاص سڑکوں کے اور دوسرے مقامات سے ملبہ اٹھانے کا

بہت تھوڑا کام کیا گیا تھا۔ ان سڑکوں کی صفائی کے وقت لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ بعض لاشوں سے عجیب وغریب انداز نمایاں تھا گویا وہ گرتی ہوئی دیوار یا چھت کو اپنے جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بربادی کا یہ منظر نہایت موثر اور ہولناک تھا جو لوگ بچ رہے تھے انہیں ان دلدوز تجربات نے بالکل پست کر دیا تھا۔

الہ آباد واپس پہنچنے کے بعد روپے اور سامان کی فراہمی کا انتظام فوراً شروع کر دیا گیا اور ہم سب خواہ کانگرسی ہوں یا غیر کانگرسی اس میں سرگرمی سے شریک ہو گئے۔ میرے بعض ساتھیوں کی رائے تھی کہ زلزلے کی وجہ سے یوم آزادی منانا ملتوی کر دینا چاہئے لیکن دوسرے ساتھیوں کو اور خود مجھے اس کی کوئی معقول وجہ نظر نہ آئی کہ زلزلے کی وجہ سے ہم اپنا پروگرام بدل دیں۔ چنانچہ ۲۶ جنوری کو ضلع الہ آباد میں دیہات میں متعدد جلسے ہوئے اور ایک جلسہ شہر میں بھی ہوا۔ ان سب میں ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ بہت سے لوگوں کو یہ توقع تھی کہ پولیس مداخلت کرے اور گرفتاریاں عمل میں لائے گی۔ چھوٹے پیانہ پر کچھ مداخلت ہوئی بھی لیکن ہم لوگوں کو اس سے بہت تعجب ہوا کہ جلسے کے بعد ہم لوگ کس طرح گرفتاری سے بچ گئے۔ ہمارے یہاں کے بعض گاؤں میں اور بعض شہروں میں کچھ گرفتاریاں ہوئیں بھی۔

بہار سے واپسی کے بعد ہی زلزلہ کے بارے میں میں نے ایک بیان شائع کیا جس کے آخر میں سرمائے کی فراہمی کی درخواست تھی، اس بیان میں میں نے حکومت بہار کے اس تساہل پر نکتہ چینی کی جو اس نے زلزلہ کے بعد ابتدائی چند دنوں میں کیا۔ میرا منشا ان حکام کی نکتہ چینی کرنا نہ تھا جو زلزلے کے علاقوں میں موجود تھے۔ ان کو ایسے سخت اور مشکل حالات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا جن سے مضبوط طبیعت کا آدمی بھی گھبرا جاتا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے بعض الفاظ کا یہ مطلب بھی نکل سکتا تھا لیکن اس کا مجھے یقیناً دل سے صدمہ تھا۔ بہار کے اعلیٰ حکام نے ابتداً کچھ زیادہ

قابلیت کا ثبوت نہیں دیا۔خاص کر ملبے کے ہٹانے میں، کیونکہ اگر وہ ہٹا دیا جاتا تو بہت سی جانیں بچ جاتیں۔

اکیلے مونگو شہر میں ہزار ہا آدمی مر گئے اور تین ہفتے گذرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ملبہ ایک بہت بڑی مقدار میں اب بھی پڑا ہوا ہے جس میں ہاتھ تک نہیں لگایا گیا۔ حالانکہ چند ہی میل کے فاصلے پر جمال پور میں کئی ہزار ریلوے مزدوروں کی بستی موجود تھی جس سے اس حادثے کے چند ہی گھنٹے بعد یہ کام لیا جا سکتا تھا۔ زلزلہ کے بارہ دن بعد بھی آدمی زندہ برآمد ہوئے۔حکومت نے جائداد کی حفاظت کی فوری تدابیر اختیار کیں لیکن جو لوگ دبے پڑے ہوئے تھے ان کی جانیں بچانے میں اتنی عجلت نہیں کی۔میونسپلٹیوں کا کام ان علاقوں میں بالکل بند تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرا اعتراض بالکل ٹھیک تھا اور بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ زلزلے کے رقبہ میں رہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس سے متفق تھی۔لیکن چاہے یہ نکتہ چینی صحیح ہو یا نہ ہو ایمانداری سے ضرور کی گئی تھی اور اس کا مقصد حکومت پر الزام نہیں لگایا کہ اس نے قصداً غلط طریقے سے کام کیا یا جان بوجھ کر غفلت برتی۔یہ ایک بالکل نیا اور بہت سخت موقع تھا اس لئے یہ غلطیاں درگذر کے قابل تھیں۔جہاں تک مجھے علم ہے (کیونکہ میں جیل میں تھا) حکومت بہار نے بعد کو محنت اور قابلیت سے زلزلہ کی تباہ کاریوں کی تلافی کا کام انجام دیا۔

لیکن میری نکتہ چینی سے ناراضگی پیدا ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بہار کے چند لوگوں نے حکومت کی حمایت میں ایک بیان شائع کر دیا جو میرے اعتراضات کا گویا جواب تھا۔اس میں زلزلے اور اس کی ضرورتیں ان کے لئے محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔اہم بات یہ تھی کہ حکومت کی نکتہ چینی کی گئی اس لئے وفادار رعایا کا فرض تھا کہ اس کی صفائی پیش کرے۔یہ ایک دلچسپ مثال ہے اس عجیب وغریب چیز کی جو ہندوستان میں بہت عام ہے یعنی حکومت پر نکتہ چینی کرنا گناہ

سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ مغربی ممالک میں یہ معمولی بات ہے۔ یہ فوجی ذہنیت ہے جو نکتہ چینی کو برداشت نہیں کرسکتی۔ بادشاہ کی طرح ہندوستان میں حکومت برطانیہ اور اس کے تمام اعلیٰ حکام خطا سے بالاتر قرار دیئے گئے ہیں۔ اسی کسی بات کی طرف اشارہ بھی کرنا بغاوت سمجھا جاتا ہے۔

اس کا ایک عجیب وغریب پہلو یہ بھی ہے کہ حکومت پر ظلم و جور کا الزام لگانا اتنا زیادہ برا نہیں مانا جاتا جتنا نا اہلی اور قابلیت کا الزام لگانا۔ ظلم و جور کا الزام لگانے والا بے شک جیل پہنچا دیا جاسکتا ہے لیکن حکومت اس قسم کے الزامات کی عادی ہوچکی ہے اس لئے اصل میں اس کا کچھ زیادہ خیال نہیں کرتی۔ ایک حیثیت سے یہ تمام باتیں ایک حکمران قوم کی صفات میں داخل سمجھی جاسکتی ہیں۔ لیکن اگر اسے نا قابل اور بودا کہا جائے تو تکلیف پہنچتی ہے کیونکہ اس سے اس کی خود پسندی کی جڑیں ہل جاتی ہیں اور ہندوستان کے انگریز حکام کا ادعائے مسیحائی باطل ہوجاتا ہے۔ ان کی مثال کلیسائے انگلستان کے اس استعف کی سی ہے جو بے دین کے الزام کو صبر وتحمل سے برداشت کرتا تھا لیکن جب کوئی اس کو احمق اور نا قابل کہتا تو وہ ناراض ہوتا اور سختی سے جواب دیتا۔

انگریزوں کا عام عقیدہ ہے جس کا اعلان اکثر اس طور سے کیا جاتا ہے کہ گویا یہ ایک نا قابل انکار کلیہ ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت میں کوئی ایسا تغیر کیا گیا جس سے برطانوی اثر کم یا زائل ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت اور زیادہ ابتر اور خراب ہوجائے گی۔ انتہا پسند اور بلند نظر انگریز اس عقیدے کے باوجود جوش ہمدردی میں ہندوستانیوں کی حمایت یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اچھی حکومت اپنی حکومت کا بدل کبھی نہیں ہوسکتی اور اگر ہندوستانی اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی مارنا چاہتے ہیں تو ان کو ایسا کرنے دیا جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ برطانوی اثر کے زائل ہوجانے کے بعد ہندوستان کا کیا حشر ہوگا۔ اس کا دارومدار زیادہ تر اس پر ہے کہ

برطانیہ کس صورت سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اس وقت ہندوستان پر کس طبقہ کی حکومت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے قومی اور بین الاقوامی امور قابل لحاظ ہیں۔ بالکل قرین قیاس ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی مدد سے ایسی حکومت قائم ہو جو موجودہ حکومت سے بدتر ہو، جس میں موجودہ حکومت کی تمام خرابیاں ہوں اور خوبیاں کوئی نہ ہوں مگر اس سے زیادہ قرین قیاس ہے کہ ہندوستان کا نظم بالکل بدل جائے اور وہ اہل ہند کے نقطہ نظر سے موجودہ نظم سے کہیں بہتر اور مفید تر ہو۔ شاید اس وقت حکومت کے جابرانہ آلات اتنے کارگر نہ ہوں اور اس کی انتظامی مشین میں یہ چمک دمک نہ ہو۔ مگر یہ یقینی بات ہے کہ دولت کی پیداوار اور اس کا صرف بہت بہتر ہوگا۔ اور ان امور میں ترقی ہوگی جو عام لوگوں کے جسمانی، روحانی اور تمدنی معیار کو بلند کرتے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ خود اختیاری کو اپنی فوقیت ثابت کرنا ہے تو لازمی طور پر اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ مفاد عامہ کے لئے بہتر ثابت ہو۔ مجھے دل سے یقین ہے کہ برطانوی حکومت کا استحقاق عہد ماضی میں جو کچھ بھی رہا ہو موجودہ زمانہ میں وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتی کہ عام لوگوں کے لئے اچھی حکومت ثابت ہو اور ان کے معیار زندگی کو بلند کر سکے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دن پورے ہو چکے اور اس کے فوائد جتنے کچھ بھی، ختم ہو گئے۔ سچ پوچھئے تو ہندوستان کے دعویٰ آزادی کی بناء اسی امید پر ہے کہ آزاد حکومت بہتر حکومت ہوگی، عوام کے معیار زندگی کو بلند کر دے گی ملک کی صنعت اور تہذیب کو ترقی دے گی اور اس خوف اور دہشت کی فضا کو دور کر دے گی، جو ہمیشہ غیر ملکی شہنشاہی حکومت کے جلو میں ہوتی ہے۔ حکومت برطانیہ اور اس کے سول سروس چاہے اتنی قوی ہو کہ اپنا حکم ہندوستان سے منوالے لیکن اس میں یہ اہلیت و قابلیت نہیں ہے کہ ہندوستان کے آئندہ مسائل کو بھی حل کر سکے اس لئے کہ اس کی بنیادیں اور اس کے تصورات سراسر غلط ہیں اور وہ حقیقی حالات کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ ایک

حکومت یا حکمران طبقہ جس میں کافی قابلیت نہیں ہے یا جس کی بنیادیں پائدار نہیں ہیں زیادہ عرصے تک جبر سے بھی کام نہیں چلا سکتا۔

الہ آباد میں جو انجمن بہار کے مصیبت زدوں کی امداد کے لئے قائم ہوئی تھی اس نے مجھے متعین کیا کہ میں زلزلہ کے علاقہ کا معائنہ کروں اور وہاں جو طریقے امداد پہنچانے کے اختیار کئے گئے تھے ان کی بابت رپورٹ پیش کروں۔ میں فوراتن تنہا چل کھڑا ہوا اور دس دن تک برابر برباد شدہ علاقے میں پھرتا رہا۔ یہ بڑی محنت کا کام تھا اور مجھے اس عرصے میں رات کو نیند بھر سونا بھی نصیب نہیں ہوا۔ ۵ بجے صبح سے لے کر قریب قریب آدھی رات تک ہم لوگ دوڑ دھوپ کیا کرتے تھے۔ کبھی موٹر میں سوار ہو کر ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے گزرتے تھے کبھی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر ان مقامات کو پار کرتے تھے جہاں پل منہدم ہو گئے تھے اور سڑکیں سطح کے تہ و بالا ہو جانے سے زیر آب تھیں۔ شہروں اور قصبوں کا منظر کچھ کم ہیبت ناک نہ تھا۔ ان کے کھنڈر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سڑکوں میں شگاف پڑ گئے تھے اور اس قدر الٹ پلٹ گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی دیو پیکر ہاتھ نے انہیں توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے۔ بڑے بڑے شگافوں سے پانی اور ریت پھوٹ نکلی تھی اور سیلاب زور آدمیوں اور جانوروں کو بہا لے گیا تھا مگر ان قصبات سے بھی زیادہ شمالی بہار کے میدانوں میں جنہیں گلشن بہار کہا جاتا تھا، ویرانی اور تباہی کے آثار نمایاں تھے۔ میلوں تک ریت ہی ریت نظر آتی تھی رقبے کے رقبے زیر آب تھے۔ زمین میں جابجا بڑے بڑے شگاف اور بے شمار چھوٹے چھوٹے آتش فشاں کے سے دہانے تھے۔ جن سے یہ ریت اور پانی نکلا تھا۔ چند برطانوی افسر جو اس علاقے پر ہوائی جہازوں میں پرواز کر چکے تھے کہتے تھے کہ یہ علاقہ کچھ اس شکل سے مشابہت رکھتا ہے جو دوران جنگ میں یا اس کے فورا بعد شمالی فرانس کے میدان جنگ کی ہو گئی تھی۔

یہ تجربہ کس قیامت کا ہوگا! لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ پہلے تو زلزلے کی لہر ایک

جانب سے دوسری جانب گزر گئی اور جتنے آدمی کھڑے تھے سب گر گئے۔ پھر ایک ہالا ڈولا آیا اور ایک گڑگڑاہٹ اور گونج پیدا ہوئی جیسے بہت سی توپیں چھوٹ رہی ہوں یا سینکڑوں ہوائی جہاز اڑ رہے ہوں۔ بے شمار مقامات پر بڑے بڑے شگافوں اور دہانوں سے پانی ابل ابل کر دس بارہ فٹ اونچا جانے لگا۔ یہ حالت غالباً تین منٹ یا اس سے کچھ ہی زیادہ رہی لیکن یہ تین منٹ قیامت کے تھے۔ کوئی تعجب نہیں اس واقعے کے بہت سے دیکھنے والے یہ سمجھے کہ اب دنیا کا خاتمہ ہے۔ شہروں میں مکانات کے گرنے کا شور برپا تھا، پانی زوروں میں بہہ رہا تھا اور فضا گردوغبار سے مکدر تھی جس کی وجہ سے چند گز فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔ دیہاتی علاقوں میں گرد زیادہ نہیں تھی، اس لئے وہاں دور دور تک نظر پہنچ سکتی تھی مگر اس وقت کون تھا جو اطمینان سے یہ تماشا دیکھتا جو بچ گئے تھے وہ زمین پر پڑے تھے اور دہشت سے مرے جاتے تھے۔

شاید مظفر پور میں ایک بارہ سال کا کمسن لڑکا دس دن بعد کھود کر زندہ نکالا گیا وہ سخت متحیر تھا جس وقت گرتے ہوئے ملبے نے اس کو گرا کر قید کر دیا تو وہ سمجھا کہ دنیا کا خاتمہ ہو گیا ہے اور ایک وہی بچ رہا ہے۔

اسی مظفر پور میں عین زلزلے کے وقت جب مکانات گر گئے تھے اور ہر طرف سینکڑوں آدمی مر رہے تھے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ناتجربہ کار نوجوان سخت پریشان تھے اور ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ماں اور لڑکی دونوں صحیح سلامت ہیں۔ زلزلے کی یادگار میں لڑکی کا نام کمپو دیوی رکھا گیا۔

ہمارے دورے میں آخری مقام شہر مونگیر تھا۔ ہم لوگ بہت دور دور پھرے تھے اور قریب قریب نیپال کی سرحد تک پہنچ گئے تھے۔ ہم نے بہت سے ہیبت ناک سین دیکھے تھے اور ہماری آنکھیں تباہی اور بربادی کے نظارے کی عادی ہو چکی تھیں مگر جب مونگیر جیسے مرفہ الحال شہر کی کامل ویرانی پر نظر پڑی تو ہم لوگ دہشت سے

کانپ اٹھے مجھے وہ خوفناک منظر کبھی نہ بھولے گا۔

زلزلے کے علاقے میں ہر جگہ، خواہ شہر ہوں یا دیہات، باشندوں میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ بالکل مفقود تھا۔ غالباً شہر کے اوسط طبقے اس بارے میں سب سے زیادہ قصوروار تھے۔ وہ سب اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے کہ حکومت یا کوئی غیر سرکاری امدادی جماعت پہنچ کر ان کی مدد کے لئے کچھ کرے۔ بعض لوگ جنہوں نے امدادی کاموں کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں یہ سمجھتے تھے کہ کام سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کو حکم دیا جائے کہ ایسا کرو ایسا کرو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے بسی کچھ اس وجہ سے بھی پھیلی ہوئی تھی کہ زلزلے کی دہشت نے سب کو بدحواس کر دیا تھا اور یہ حالت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی ہوگی۔

اس کے مقابلے میں ان لوگوں کی ہمت اور مستعدی خاص طور پر نمایاں تھی جو امدادرسانی کا کام کرنے کے لیے بہار کے دوسرے حصوں اور غیر صوبوں سے بکثرت آرہے تھے۔ ان نوجوان مردوں اور عورتوں کے جذبہ خدمت اور کارکردگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور باوجود اس کے کہ متعدد امدادی جماعتیں جدا جدا کام کر رہی تھیں، ان میں بڑی حد تک اتحاد عمل تھا۔

میں نے مونگیر میں کوشش کی کہ ملبہ کھودنے میں لوگ اپنی مدد آپ کریں اور اس تحریک کو ابھارنے کے لئے ایک نمائشی حرکت کی۔ میں کسی قدر ہچکچاتے ہوئے یہ قدم اٹھایا مگر اس میں پوری کامیابی ہوئی۔ سب امدادی جماعتوں کے رہنما پھاوڑے اور ٹوکرے لے کر پہنچ گئے اور دن بھر کھدائی کا کام کرتے رہے۔ ہم لوگوں نے ایک کم سن لڑکی کی لاش کھود کر نکالی۔ میں تو اس دن مونگیر سے چلا آیا لیکن کھدائی ہوتی رہی اور بہت سے مقامی لوگوں نے اس کام کو اٹھالیا جس سے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

تمام امدادی جماعتوں میں سب سے زیادہ اہم مرکزی امدادی جماعت تھی جس

کے صدر راجندر پرشاد تھے۔ یہ خالص کانگریسی جماعت نہیں تھی۔ بڑھتے بڑھتے یہ آل انڈیا کی جماعت بن گئی۔ جس میں مختلف گروہوں اور معطیوں کے نمائندے شامل تھے۔ ایک خاص آسانی اس کو یہ تھی کہ وہ دیہاتی علاقوں میں کانگریس کمیٹیوں سے کام لے سکتی تھی۔ ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے میں سوا گجرات یا بعض اضلاع ممالک متحدہ کے، کانگریسی کارکنوں کا اتنا زیادہ گہرا تعلق اور ربط کسانوں سے نہیں ہے جتنا کہ میں نے صوبہ بہار میں دیکھا بلکہ اصل میں کانگریس کے زیادہ تر کارکن کسان ہی تھے۔ صوبہ بہار کسانوں کا صوبہ ہے اور اس صوبے کے متوسط طبقے کے لوگ بھی کسانوں میں شامل ہیں۔ کانگریس کے سیکرٹری کی حیثیت سے مجھے بارہا بہار کی صوبہ کانگریس کمیٹی کے دفتر کا معائنہ کرنے کا اتفاق ہوا اور میں نے بعض اوقات سخت الفاظ میں اس ابتری اور سستی پر اعتراض کیا جو مجھے دفتر کے کام میں نظر آئی۔ لوگ کھڑے رہنے سے زیادہ بیٹھنے اور بیٹھنے سے زیادہ لیٹنے کی طرف مائل نظر آتے تھے۔ میں نے اس سے زیادہ کوئی دفتر سازو سامان سے خالی نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ بہت سی چیزوں کے بغیر کام چلائیں جو دفتر کے معمولی لوازم میں داخل ہیں۔ مگر باوجود ان اعتراضات کے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کانگریس کے نقطہ نظر سے یہ صوبہ ملک بھر میں سب سے زیادہ مستعد اور وفادار تھا۔ وہاں کانگریس اپنے کام کی کوئی نمائش نہیں کرتی تھی لیکن اس کو کسانوں کی زبردست تائید حاصل تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں بھی بہار کے ممبر شاذو نادر ہی کسی معاملے میں پیش قدمی کرتے تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں تعجب ہو کہ ہم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ لیکن سول نافرمانی کی دونوں تحریکوں میں بہار نے نمایاں کارنامے دکھائے اور بعد کی انفرادی سول نافرمانی میں بھی اچھا کام کیا۔

کانگریس کی اس عمدہ تنظیم کی بدولت امدادی کمیٹی نے کسانوں تک پہنچنے کی صورت نکالی۔ دیہاتی علاقوں میں نہ کوئی دوسری جماعت اور نہ خود حکومت اتنی مفید

ہوسکتی تھی۔امدادی کمیٹی و نیز صوبہ بہار کی کانگریس دونوں کے صدر راجندر بابو تھے جو بہار کے مسلمہ لیڈر رہیں۔سر زمین بہار کے بسنے والوں کی تمام خصوصیات ان میں نمایاں ہیں۔ان کی صورت کسانوں کی سی ہے اور پہلی نظر میں دیکھنے والا کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔مگر ذرا غور کرنے کے بعد ان کی آنکھیں جن سے تیزی اور صاف دلی اور ان کا چہرہ جس سے جوش اور خلوص ٹپکتا ہے دل میں گھر کر لیتا ہے۔کوئی شخص جس نے ان آنکھوں کو اور اس چہرے کو ایک بار دیکھ لیا ہے انہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس لئے کہ ان میں صداقت کا جلوہ نظر آتا ہے، جس میں کھوٹ کا نام تک نہیں۔ کسانوں کی سی طبیعت ہونے کی وجہ سے شاید ان کا زاویہ نظر کسی قدر محدود ہے اور آج کل کے معیار سے وہ سیدھے سادھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔لیکن ان کی نمایاں قابلیت، ان کی کامل راست بازی، ان جوش عمل ان کا ہندوستان کی آزادی کے لئے جان لڑا دینا وہ اوصاف ہیں جنہوں نے ان کو نہ صرف اپنے صوبے میں بلکہ سارے ہندوستان میں محبوب بنا دیا ہے۔راہنمائی کا جو مسلمہ مرتبہ راجندر بابو کو بہار میں حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی شخص کو حاصل نہیں ہے۔بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جن کی بابت یہ کہا جا سکے کہ انہوں نے گاندھی جی کے پیام کی حقیقی روح کو ان سے زیادہ جذب کیا ہے۔

بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان جیسا آدمی بہار کے امدادی کام کی رہنمائی کے لئے مل گیا اور یہ اس اعتماد کا نتیجہ تھا جو لوگ ان پر رکھتے تھے کہ ہندوستان بھر سے اس قدر کثیر تعداد میں روپیہ ملا۔ان کی صحت کمزور تھی مگر وہ امدادی کام میں جٹ گئے۔ انہیں حد سے زیادہ کام کرنا پڑا۔اس لئے کہ ساری جدوجہد کا مرکز انہیں کی ذات تھی اور ہر شخص انہیں سے ہدایت اور مشورہ لیتا تھا۔

جب میں زلزلے کے علاقے میں دورہ کر رہا تھا یا شاید وہاں جانے سے ایک آدھ روز پہلے مجھے گاندھی جی کا یہ بیان پڑھ کر سخت صدمہ ہوا تھا کہ زلزلہ چھوت

چھات کی سزا ہے۔ انہوں نے یہ ایسی بات کہی کہ آدمی سر پکڑ کر بیٹھ جائے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کا جو جواب دیا وہ مجھے بہت پسند آیا اور میں اس سے لفظ بہ لفظ متفق ہوں۔ سائنس کے نقطہ نظر سے یہ بات اس قدر بعید تھی کہ اس سے بعید تر کوئی چیز تصور میں نہیں آسکتی۔ یہ مانا کہ جذباتی کیفیات یا نفسی واردات کا جو اثر مادے پر پڑتا ہے اس کے متعلق سائنس صحیح حکم لگانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی ممکن ہے کہ دماغی صدمے کے اثر سے انسان کو بدہضمی ہو جائے یا اس کے جسم پر اس سے بھی زیادہ اثر پڑے لیکن یہ کہنا کہ انسانی رسوم یا کوتاہیوں کے کوئی اثرات سطح ارضی کی حرکت پر پڑیں گے۔ سخت حیرت ناک ہے، گناہ، غضب الٰہی اور نظام کائنات میں انسان کی اہمیت کا تخیل ہم کو چند صدی پیچھے دھکیل کر اس زمانے میں لے جاتا ہے جب پورے یورپ میں کلیسا کے احتساب کا دور دورہ تھا کیورڈانو برونو عملی تحقیقات کے جرم میں ملحد قرار دے کر جلا دیا گیا تھا اور بہت سی عورتیں سحر کے الزام میں آگ میں جھونک دی جاتی تھیں۔ امریکا میں اٹھارویں صدی میں بوسٹن کے سربرآوردہ پادریوں نے میساچوسٹس کے زلزلے کا سبب اس بدعت کو ٹھہرایا تھا کہ عمارتوں پر برق رباسلاخیں نصب کی گئی تھیں۔

اگر زلزلے کو عذاب الٰہی تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ ہمارے کس گناہ کی سزا ہم کو دی جارہی ہے۔ کیونکہ افسوس! ہمارے گناہ لاتعداد ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی توجیہہ کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سزا ہم کو اس لئے دی گئی ہو کہ ہم ایک غیر ملکی حکومت کی غلامی پر راضی ہیں یا اس لئے کہ ہم ایک ظالمانہ سماجی نظام کو برداشت کر رہے ہیں۔ مہاراجہ دربھنگہ کو جو ایک بہت بڑے زمیندار ہیں، مالی حیثیت سے زلزلے کی وجہ سے بہت بڑا نقصان پہنچا اس لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظام زمینداری کے لئے تازیانہ عبرت ہے۔ یہ اس سے زیادہ قرین قیاس ہے کہ بہار کے کم و بیش بے گناہ لوگوں کو جنوبی ہندوالوں کی

چھوت چھات کے گناہ کی سزا ملے۔ یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ آخر وہ چھوت چھات کی زمین پر زلزلہ کیوں نہیں آیا؟ حکومت برطانیہ کہہ سکتی ہے کہ یہ عذاب سول نافرمانی کی وجہ سے نازل ہوا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ شمالی بہار نے جسے زلزلے سے بہت زیادہ نقصان پہنچا آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

غرضیکہ ہم اس طرح کی بے شمار قیاس آرائیاں کر سکتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ ہم قضاوقدر کے کاموں میں دخل ہی کیوں دیں اور اپنی انسانی جدوجہد سے عذاب الہی کے نتائج کو ہلکا کرنے کی کوشش کیوں کریں؟ پھر ہم اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ قدرت نے ستم ظریفی ہمارے ساتھ کیوں روا رکھی ہے ہمیں کمزور، اور خطا کار بنایا، ہماری راہ میں قدم قدم پر پھندے لگا دیئے، دنیا کو مصیبت اور ظلم سے معمور کر دیا، شیر اور بھیڑ کو پیدا کیا اور پھر ہمیں کو سزا بھی دیتی ہے۔

جب ستاروں نے اپنی شعاعوں کے نیزے پھینک دیئے

اور آسمان کو اپنے آنسوؤں سے تر کر دیا

تو کیا وہ اپنی مخلوق کو دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے؟

کیا تجھے بھی اسی نے پیدا کیا ہے جو میمنے کا پیدا کرنے والا ہے؟

میں اپنے پٹنے کے قیام کی آخری شب میں بہت رات گئے تک اپنے رفیقوں اور دوستوں سے گفتگو کرتا رہا۔ جو امدادی کام میں شریک ہونے کے لئے مختلف صوبوں سے آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ممالک متحدہ کی نمائندگی کافی تھی اور ہمارے بعض چیدہ کارکن وہاں موجود تھے۔ ہم لوگ ایک اہم مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ وہ یہ تھا کہ ہم کو زلزلہ کے امدادی کام میں کس حد تک حصہ لینا چاہئے کیونکہ اسی حد تک ہمیں سیاسی کام سے علیحدہ ہونا پڑتا۔ امدادی کام بہت محنت طلب تھا اور سرسری طور پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر ہم اسی کے ہو رہتے تو ایک بڑی مدت تک عملی سیاسی جدوجہد سے الگ رہنا ضروری تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ سیاسی حیثیت سے ہمارے

صوبہ پر اس کا برا اثر پڑتا۔ یوں تو کانگریس کے کارکنوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن ایسے لوگ جن کی شرکت اور عدم شرکت کا اثر پڑتا ہے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں اور ان کے بغیر کام چلانا مشکل تھا۔ تاہم زلزلے کے مصیبت زدوں کے تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خود میرا یہ ارادہ نہیں تھا کہ میں صرف امدادی کام میں منہمک ہو کر رہ جاؤں۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کام کے لئے تو بہت سے آدمی مل جائیں گے مگر دوسرا کام ذرا خطرناک ہے اس لئے بہت کم آدمی ہیں

ہم لوگ بڑی دیر تک یہی گفتگو کرتے رہے۔ پھر گزشتہ یوم آزادی کا ذکر چھڑ گیا کہ ہمارے فلاں فلاں ساتھی گرفتار ہو گئے اور ہم بچ گئے۔ میں نے ان لوگوں سے ہنسی میں کہا کہ میں نے ایسی ترکیب معلوم کر لی ہے کہ آدمی جارحانہ سیاست کے باوجود گرفتاری سے بچا رہے۔

۱۱ فروری کو میں الہ آباد واپس آیا۔ اس دورے کے بعد تھک کر چور ہو چکا تھا۔ دس دن کی سخت محنت سے میں پیلا پڑ گیا تھا اور میرے اعزاء کو میری صورت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ میں نے الہ آباد امدادی انجمن کے لئے رپورٹ لکھنے کی کوشش کی لیکن نیند غالب آ گئی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں سے کم از کم بارہ گھنٹے میں نے سونے میں گزار دیئے۔

دوسرے دن شام کے قریب میں اور کملا چائے پی چکے تھے اور پرشوتم داس ٹنڈن ہم سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ ہم لوگ برآمدے میں کھڑے تھے کہ ایک موٹر آ کر رکی اور اس میں سے ایک پولیس افسر اترا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ میرا وقت آ گیا ہے۔ میں نے پاس جا کر کہا کہ بہت دنوں سے آپ کا انتظار تھا۔ وہ کسی قدر عذر خواہی کے انداز میں بولا کہ میرا قصور نہیں ہے یہ وارنٹ کلکتے سے آیا ہے۔

پانچ مہینے تیرہ دن باہر رہنے کے بعد پھر اپنے گوشہ تنہائی میں واپس آ گیا۔ اصل میں میرے لئے کوئی مشکل نہ تھی۔ مصیبت بے چاری عورتوں یعنی میری بیمار

ماں، بیوی اور بہن کی تھی اور اب کیا ہمیشہ ہی ہوتی تھی ۔

علی پور جیل

میں اس حالت اور کیفیت سے اب کتنی دور ہوں، کیا میں اب بھی اس جھاڑی دار درخت کی لٹوں کی طرح بلا کسی رکاوٹ کے ان ہلکی ہلکی ہواؤں میں اڑتا ہوں جہاں راستہ دکھانے والا کوئی دم ساز ستارہ نہیں ہے۔ (رابرٹ براؤننگ)

اسی رات مجھے کلکتہ لے گئے اور ہوڑا اسٹیشن سے ایک بہت بڑی اور سیاہ رنگ کی کار یا گاڑی میں لال بازار پولیس کی چوکی پر پہنچا دیا۔ کلکتے کے اس مشہور صدر تھانہ کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اس لئے ذرا دلچسپی کے ساتھ میں نے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔

یورپین سارجنٹ اور تھانہ داروں کی بہت بڑی تعداد نظر آئی۔ جتنی شمالی ہند کے کسی صدر تھانہ میں نہیں ہوتی۔ سپاہی تقریباً تمام صوبہ بہار کے یا صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ جیل خانہ کی بڑی لاری میں متعدد بار مجھے جیل خانہ جانا ہوا تو ان سپاہیوں میں سے کچھ لوگ اندر بیٹھ کر میرے ہمراہ ہوتے تھے۔ یہ لوگ بے حد رنجیدہ نظر آتے تھے، اپنی نوکری سے بیزار تھے اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ میرے ساتھ انہیں بڑی ہمدردی تھی اور کبھی کبھی ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

ابتدا مجھے پریذیڈنسی جیل میں رکھا گیا۔ وہاں سے چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کے لئے مجھے لے جاتے تھے یہاں مجھے عجیب وغریب تجربہ ہوا۔ عدالت کا کمرہ اور پوری عمارت کی ظاہری شکل وصورت بجائے کھلی کچہری کے ایک محصور قلعہ کی سی معلوم ہوتی تھی۔ سوائے چند اخباری نمائندوں اور وکیلوں کے جو وہاں ہوتے ہی ہیں کسی اور آدمی کو کہیں آس پاس تک آنے کی اجازت نہیں تھی۔ پولیس کے سپاہی البتہ خاص تعداد میں موجود تھے، یہ وہاں روزانہ کا دستور تھا۔ جب

مجھے عدالت کے کمرے میں لے گئے تو کمرہ کے اندر ایک لمبے راستہ سے مجھے گزرنا پڑا جس کے اوپر اور ادھر اُدھر دونوں طرف تاروں کی جالی لگی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پنجرے میں چل رہے ہیں۔ ملزم کا کٹہرا مجسٹریٹ کی کرسی سے بہت دور تھا اور عدالت کا کمرہ پولیس کے سپاہیوں اور وکیلوں سے بھرا تھا جو سیاہ کوٹ اور چغے پہنے ہوئے تھے۔

عدالتی مقدموں کا میں خاصا عادی تھا۔ میرے بہت سے مقدمات جیل خانہ کے اندر ہی ہوتے تھے، لیکن ہمیشہ کچھ دوست عزیز اور جان پہچان کے لوگ موجود ہوتے تھے، جس سے یہ پوری فضا اتنی زیادہ مکدر معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہاں پولیس کے سپاہی بھی بالعموم ذرا علیحدہ رہتے تھے اور پنجرے کی شکل کی کوئی چیز آس پاس نہیں ہوتی تھی، لیکن یہاں حالت بالکل مختلف تھی اور میں گھور گھور کر اجنبی اور ناواقف لوگوں کی طرف دیکھتا تھا جن میں اور مجھ میں کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ تھا، یہ مجمع کچھ زیادہ دلکش بھی نہ تھا اور میرا خیال ہے کہ وکلاء جب چغے پہن کر اکٹھے ہو جاتے ہیں تو یہ اجتماع کچھ زیادہ حسین بھی نہیں معلوم ہوتا اور پولیس کی مخصوص عدالتوں کے وکلاء تو خصوصیت کے ساتھ ایک مہیب شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آخر کار میں نے کسی طرح ایک وکیل صورت پہچانی جو پیچھے قطار میں تھے، لیکن پھر وہ بھی اس مجمع میں گم ہو گئے۔

مقدمہ شروع ہونے سے قبل جب میں باہر کی طرف برآمدہ میں بیٹھا تو مجھے اپنی تنہائی اور سب لوگوں سے علیحدگی بہت محسوس ہوئی۔ اس وقت میری نبض کی حرکت بھی یقیناً تیز ہو گئی اور اندرونی طور پر طمانیت قلب بھی اتنی نہ تھی جتنی کہ اس سے پہلے مقدمات کے دوران میں رہا کرتی تھی۔ اس وقت مجھے یہ بات کھٹکی کہ اگر مجھ سا آدمی جو اتنے مقدمات اور سزاؤں کا تجربہ حاصل کر چکا ہے ایسے حالات میں غیر معمولی طور پر گھبرا سکتا ہے تو پھر نوجوان اور ناتجربہ کار لوگوں کا کیا حال ہوتا ہو گا۔

ملزم کے کٹہرے میں کے اندر جا کر پھر میری حالت ذرا ابتر ہو گئی حسب معمول نہ میں نے کوئی صفائی پیش کی اور نہ پیروی کی صرف ایک مختصر سا بیان پڑھ کر سنا دیا۔ دوسرے دن ۵ فروری کو مجھے دو برس کی سزا دے دی گئی اور ساتویں مرتبہ میری قید کی مدت شروع ہوئی۔

اب جو میں ساڑھے پانچ ماہ کے جیل سے باہر قیام پر نظر ڈالتا تھا تو مجھے اطمینان اور خوشی ہوتی تھی کہ میرا وقت اچھی طرح صرف ہوا اور میں نے اس عرصہ میں بعض مفید کام کیے۔

والدہ نے بیماری پر قابو پالیا تھا اور فوری طور پر کوئی خطرہ ان کے لئے نہ تھا، میری چھوٹی بہن کرشنا کی شادی ہو گئی تھی میری لڑکی کی آئندہ تعلیم کا بندوبست ہو گیا تھا، میں نے اپنی بعض خانگی اور مالی دشواریوں کو بھی درست کر لیا تھا اور بہت سے ذاتی معاملات جنہیں میں نے ایک عرصے سے نظر انداز کر رکھا تھا ان کا بھی کچھ انتظام ہو ہی گیا، سیاسی امور کا جہاں تک تعلق ہے میں جانتا تھا کہ کانگریس کے طرز عمل کو تھوڑا اور کس دیا اور ایک حد تک اس کو معاشرتی اور معاشی نقطہ نظر سے غور وفکر کرنے کی طرف مائل کیا۔ پہلے تو گاندھی جی کے ساتھ میری پونا والی خط و کتابت سے اور اس کے بعد میرے مضامین سے جو اخبارات میں شائع ہوئے، کچھ فرق پیدا ہوا۔ فرقہ وارانہ مسئلے پر میرے مضامین سے بھی کچھ فائدہ ضرور رہوا، اس کے علاوہ تقریباً دو برس کے بعد میں نے گاندھی جی سے اور دوسرے دوستوں اور ساتھیوں سے مل لیا اور اس ملاقات سے میں نے اپنی رگوں میں اور اپنے جذبات میں ایک نئی قوت ایک مدت کے لئے حاصل کر لی تھی۔

صرف ایک بات البتہ میرے لئے پریشان کن رہی اور وہ کملا کی علالت تھی، اس وقت مجھے اس کا اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ کتنی علیل ہے، اس لئے کہ اس کی عادت ہے کہ جب تک بالکل گر ہی نہ پڑے کام چلاتی رہتی ہے۔ بہر حال میں متفکر اور

پریشان تھا۔لیکن اس کے باوجود یہ توقع تھی کہ اب چونکہ میں جیل خانہ میں ہوں اس کو فرصت ملے گی کہ اپنے علاج کی طرف توجہ کرے۔ جب تک میں باہر رہا اس وقت تک اس کے لئے یہ ذرا دشوار تھا اس لئے کہ وہ مجھے زیادہ عرصہ تک چھوڑنے کے لئے کسی طرح راضی نہیں ہوتی تھی۔

ایک بات کا مجھے اور بھی افسوس تھا کہ میں نے ایک بار ضلع الہ آباد کے دیہاتی علاقہ کو جا کر نہیں دیکھا، میرے بہت سے نوجوان ساتھی جو وہاں ہم لوگوں کی ہدایت کے مطابق کام کرنے گئے تھے، گرفتار ہو گئے تھے اور ان کے پیچھے ضلع کے اندر دیہاتوں میں نہ جانا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ بے وفائی کرنا ہے۔

ایک بار پھر سیاہ رنگ کی قیدیوں کی گاڑی مجھے جیل خانہ واپس لے گئی۔ راستہ میں ہم لوگ ایک بہت بڑی فوج کے پاس سے گذرے جو مشین گن، فوجی موٹر کار وغیرہ وغیرہ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر جا رہی تھی۔ جیل خانہ کی گاڑی کے اندر چھوٹے چھوٹے روشندانوں سے جھانک کر میں نے ان کو دیکھا، اور اپنے دل میں سوچنے لگا کہ فوجی موٹر کار اور ٹینک بھی کتنے بد شکل ہوتے ہیں ان کو دیکھ کر مجھے قرون قبل تاریخ کے مہیب دیو ہیکل اور اسی طرح کے دوسرے جانور یاد آ گئے۔

مجھے پریذیڈنسی جیل سے علی پور مرکزی جیل میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں مجھے ایک کوٹھری ملی جس کی لمبائی چوڑائی تقریباً نوفٹ ہو گی۔ اس کے سامنے ایک برآمدہ اور ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن کے اردگرد کی دیوار ذرا نیچی تھی، تقریباً ۷ فٹ کی ہو گی۔ اس کے دوسری طرف ایک عجیب منظر مجھے نظر آیا۔ ہر قسم کی عجیب عجیب عمارتیں تھیں، کوئی ایک منزل کی کوئی دو منزلہ کوئی گول ہے تو کوئی مستطیل۔ چھتیں بھی عجیب و غریب، یہ عمارتیں ہر چہار طرف کھڑی تھیں، ان میں سے بعض عمارتیں دوسری عمارتوں سے اونچی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عمارتیں ایک ایک کر کے کھڑی ہوتی گئیں، اور کچھ اس طرح اپنی اپنی جگہ جما دی گئیں کہ جتنا بھی رقبہ تھا وہ سب پوری

طرح کام میں آ جائے۔ تقریبا یہ نقشہ تھا جیسے کوئی گورکھ دھندا ہو یا کسی استقبالی، مصور کی تخیلی کاوش۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہی سمجھایا گیا کہ یہ عمارتیں ترتیب سے بنائی گئی ہیں جس کے بیچ میں ایک مینارہ ہے جو عیسائی قیدیوں کے لئے گرجا کا کام دیتا ہے۔ اور وہیں سے قطاریں پھوٹ کر نکلتی ہیں۔ چونکہ جیل خانہ شہر میں تھا اس لئے اس کا رقبہ بہت محدود تھا اور اس کے چپہ چپہ زمین کو کام میں لانا ضروری تھا۔

میں اپنے اردگرد کی ان بظاہر عجیب و غریب عمارتوں کو پہلی بار دیکھ کر بمشکل اپنے حواس درست کر سکا تھا کہ ایک اور ہیبت ناک منظر دکھائی دیا، میری کوٹھڑی اور اس کے صحن کے ٹھیک سامنے دو چمنیاں تھیں جن میں سے سیاہ اور کثیف دھوئیں کے بگولے نکل رہے تھے اور کبھی کبھی ہوا اس دھوئیں کو میری طرف اڑالاتی تھی جس سے دم گھٹنے لگتا تھا۔ یہ چمنیاں جیل کے باورچی خانہ کی تھیں۔ میں نے بعد میں سپرنٹنڈنٹ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ اس حملہ کی مدافعت کے لئے گیس کے نقاب فراہم کرنا چاہیے۔

جیل کی زندگی کی یہ ابتداء کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھی اور مستقبل بھی زیادہ خوش آئند نہ تھا یعنی علی پور جیل کی سرخ اینٹوں والی عمارتوں کے غیر متغیر منظر سے لطف اندوز ہوتے رہنا اور اس کے باورچی خانہ کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو نگلنا اور سانس کے ساتھ اندر لینا۔ میرے صحن میں نہ کوئی درخت تھا نہ سبزہ، پورا کا پورا فرش پختہ اور پکا اور صاف ستھرا رہتا تھا، (سوائے اس کوڑے کے جو دھوئیں کی وجہ سے ہر روز ہو جایا کرتا تھا)۔ لیکن وہ بھی بالکل خالی اور ویران تھا۔ پاس کے صحن میں ایک یا دو درختوں کی پھنگیاں مجھے دکھائی دیں، لیکن میں جس زمانہ میں پہنچا ان میں نہ کوئی پتی تھی نہ کوئی پھول۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک پر اسرار تبدیلی ان میں ہوئی اور ان کی تمام شاخوں پر ہری ہری کونپلیں نکلنے لگیں، کونپلوں سے پتیاں نکلیں اور جلدی جلدی بڑھ کر انہوں نے سر سبز شاخوں کو اپنے خوش گوار سبزہ سے چھپالیا۔ یہ ایک ایسی خوش

گوارتبدیلی تھی جس سے علی پور جیل میں بھی رونق اور زندگی معلوم ہونے لگی۔

انہیں میں سے ایک درخت میں چیل کا ایک گھونسلا تھا جس سے مجھے دلچسپی ہوگی۔ میں اکثر اس کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ چیل کے بچے بڑے ہو رہے تھے اور اپنے کاروبار کے گر بھی سیکھ رہتے تھے، کبھی کبھی وہ نہایت تیز رفتاری اور نشانہ کی حیرت انگیز صحت سے نیچے جھپٹتے اور قیدی کے ہاتھ سے روٹی بلکہ منہ سے نوالہ تک جھپٹ کر لے جاتے تھے۔

غروب آفتاب کے وقت سے لے کر طلوع آفتاب تک کم و بیش ہم لوگ اپنی کوٹھڑیوں میں مقفل رہتے تھے اور جاڑوں کی طویل شام کا کاٹنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ساعت بہ ساعت جب میں لکھتے لکھتے یا پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو اپنی کوٹھڑی کے اندر ٹہلنا شروع کرتا تھا اور وہ بھی کیا! چار پانچ قدم آگے جانا اور پیچھے لوٹنا، اس وقت مجھے جانور گھر کے ریچھ یاد آتے تھے جو کٹہرے میں بند آگے پیچھے ٹہلتے ہیں۔ بعض اوقات جب میرا جی بہت زیادہ اکتا جاتا تھا تو میں اپنا مرغوب علاج (شرش آشن) سر کے بل کھڑے ہو کر کیا کرتا تھا!

رات کے ابتدائی حصہ میں کچھ خاموشی رہتی تھی اور شہر کی کچھ آوازیں اندر آجایا کرتی تھیں مثلاً ٹرام گاڑی کا شور، گراموفون کی آواز، یا کہیں دور سے کسی شخص کے گانے کی آواز۔ دور سے دھیمی دھیمی موسیقی کی آواز سن کر فرحت ہوتی تھی، لیکن کچھ رات گزرنے کے بعد پھر زیادہ آرام نہیں ملتا تھا اس لئے کہ پہرے کے سپاہی ادھر سے اُدھر ٹہلتے رہتے تھے۔ اور ہر گھنٹہ کوئی نہ کوئی معائنہ رہتا تھا، بعض لالٹین لے کر آتے تھے یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ ہم لوگ بچ کر بھاگ تو نہیں گئے، ہر روز یا یوں کہنا چاہئے کہ ہر رات کو تین بجے ایک بڑا شور اور مٹی سے برتن مانجھنے اور رگڑنے کا غل ہوا کرتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ باورچی خانہ میں کام شروع ہو گیا۔

محافظ، پہرہ دار، افسر اور منشی بہت بڑی تعداد میں پریذیڈنسی جیل میں بھی متعین

تھے۔اور علی پور جیل میں بھی۔ان دونوں جیل خانوں کی آبادی اور نینی جیل کی آبادی تقریباً برابر برابر تھی یعنی ۲۴۰۰ سے ۲۳۰۰ تک لیکن ان میں سے ہر جیل خانہ کا عملہ نینی جیل کے عملہ سے دگنا تھا۔ان میں بہت سے یورپین وارڈ اور ہندوستانی فون کے پنشن یافتہ افسر تھے۔یہ بات صاف ظاہر تھی کہ بہ نسبت صوبہ متحدہ کے کلکتہ میں حکومت برطانیہ کا انتظام زیادہ زوردار اور زیادہ مسرفانہ ہے۔سلطنت برطانیہ کی قوت اور جبروت کی ایک نشان اور مستقل طور پر یاددہانی کرنے والی ایک بات اور تھی کہ جب اعلیٰ افسر قیدیوں کے قریب آتے تھے تو قیدیوں کو ایک نعرہ زور سے لگانا پڑتا تھا۔یہ نعرہ سرکار سلام کا ہوتا تھا۔ جو ذرا لمبی آواز اور ایک خاص جسمانی حرکت کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا۔اس نعرہ کی آوازیں دن میں کئی بار میرے صحن کی دیوار کے اس طرف آیا کرتی تھیں اور بالخصوص اس وقت جب سپرنٹنڈنٹ صاحب روزانہ وہاں سے گزرتے تھے۔میں سات فٹ کی اونچی دیوار کی دوسری طرف ایک بہت بڑے شاہی چتر کا صرف اوپر کا حصہ دیکھ سکتا تھا۔جس کے سایہ میں یہ سپرنٹنڈنٹ صاحب چلا کرتے تھے۔

معلوم نہیں کہ سرکار سلام کا یہ غیر معمولی نعرہ اور جس انداز سے لگایا جاتا تھا زمانہ قدیم کی یادگار ہے یا کسی ذہین انگریز افسر کی ایجاد ہے۔لیکن میرا گمان ہے کہ کسی انگریز افسر ہی کی ایجاد ہوگی۔اس کی آواز میں ایک خاص اینگلو انڈین لہجہ پایا جاتا تھا۔خوش قسمتی سے ممالک متحدہ کی جیلوں میں اور غالباً علاوہ بنگال اور آسام کے اور کسی صوبہ میں یہ نعرہ رائج نہیں ہے۔جس طریقہ سے یہ زبردستی کا سلام سرکار کی عظمت و جبروت کے سامنے کیا جاتا ہے مجھے باعث تذلیل معلوم ہوتا تھا۔

البتہ علی پور جیل میں ایک اصلاح دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ معمولی قیدیوں کا کھانا ممالک متحدہ کے جیل کے کھانے سے بہت زیادہ بہتر تھا اور جہاں تک جیل کی خوراک کا تعلق ہے ممالک متحدہ بہت سے صوبوں سے گیا گزرا ہے۔

جاڑوں کا مختصر زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ بہار کے دن بھی یوں ہی گزر گئے اور گرمیاں شروع ہوئیں روز بروز گرمی بڑھتی گئی مجھے کلکتہ کی آب و ہوا کبھی پسند نہ تھی۔ تھوڑے دن بھی اس آب وہوا رہتا ہوتا تو طبیعت پژمردہ اور پست ہو جاتی تھی۔ جیل میں حالات قدرتا اور بھی ابتر تھے اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے میری صحت اچھی نہ رہی۔ غالباً اس وجہ سے کہ ورزش کے لئے جگہ نہ تھی اور دیر تک اس آب و ہوا میں مقفل رہنا پڑتا تھا۔ میری صحت پر کسی قدر اس کا برا اثر پڑا۔ اور میرا وزن تیزی سے کم ہونے لگا، مجھے تالوں اور چٹخنیوں سے، لوہے سینخوں اور دیواروں سے بڑی نفرت پیدا ہونے لگی۔

علی پور جیل میں ایک مہینے کے بعد مجھے اپنے صحن سے باہر کچھ ورزش کرنے کی اجازت ملی۔ یہ ایک خوشگوار تبدیلی تھی اور اب اصلی دیوار کے نیچے صبح شام ٹہل لیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ علی پور جیل اور کلکتہ کی آب وہوا کا عادی ہو گیا اور باورچی خانہ اور اس کا دھواں اور شور وغل بھی ایک قابل برداشت مصیبت بن گیا۔ اب دوسرے معاملات میرے دماغ میں سمانے لگے۔ دوسری پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ کیونکہ باہر کی خبریں کچھ خوش کن نہ تھیں۔

مشرقی اور مغربی جمہوریت کا مقابلہ

علی پور جیل میں مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ سزایابی کے بعد پھر مجھے کوئی روزانہ اخبار منگانے کی اجازت نہ ہوگی۔ جب تک میرا مقدمہ زیر سماعت رہا کلکتہ کا روزنامہ اسٹیٹس مجھے مل جاتا تھا۔ لیکن جس دن مقدمہ ختم ہوا اس کے دوسرے ہی دن سے یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔ ہمارے صوبہ متحدہ میں ۱۹۳۲ء سے برابر ایک روزانہ اخبار (جس کو حکومت پسند کرے) درجہ الف یا درجہ اول قسم کے قیدیوں کو دینے کی اجازت تھی۔ یہی حال اکثر دوسرے صوبوں میں تھا۔ اور اسی وجہ سے غالباً میرا یہ گمان تھا کہ یہی باقاعدہ بنگال میں بھی ہوگا۔ بہر کیف بجائے روزنامہ اسٹیٹس مین کے اب ہفتہ وار اسٹیٹس مین مجھے دیا جانے لگا۔ ظاہر ہے کہ یہ اخبار صرف ان انگریز افسروں کے لئے ہوتا ہے جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں یا ان تاجروں کی دلچسپی کے لئے ہوتا ہے جو انگلستان واپس چلے گئے ہوں۔ اس میں ایسی ہی خبروں کا خلاصہ دیا جاتا ہے جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ بیرونی خبریں اس میں بالکل نہیں دی جاتی تھیں۔ اور چونکہ میں ان خبروں کا بالالتزام پڑھنے کا عادی تھا اس لئے ان کا نہ ہونا اور بھی محسوس ہوتا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے پھر ہفتہ وار مانچسٹر گارجین منگانے کی مجھے اجازت مل گئی اور اس کے ذریعہ میں یورپ اور بین الاقوامی معاملات سے باخبر رہنے لگا۔

فروری میں جب میری گرفتاری اور مقدمہ ہوا اسی زمانہ میں یورپ میں بڑے تلخ جھگڑے، لڑائیاں اور ہنگامے ہوئے، فرانس میں ہنگاموں کا نتیجہ فاشٹ بلووں کی صورت میں ظاہر ہوا اور ایک قومی حکومت کی تشکیل ہوئی۔ اس سے کہیں زیادہ ابتر حالت آسٹریا میں تھی جہاں چانسلر ڈائفس نے مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر اشتراکی جمہورت کا قلع قمع کر دیا۔ آسٹریا میں خونریزی کی خبروں نے مجھے بہت افسردہ کیا۔ یہ دنیا بھی کیسی بری اور مصیبت کی جگہ ہے اور انسان بھی کتنی وحشی ہو جاتا

ہے۔ جب وہ اپنے مستقل اغراض کی حفاظت کرنے پر تل جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام یورپ اور امریکہ میں فاشزم پھیلتا جا رہا ہے۔ جرمنی میں جب ہٹلر کا اقتدار ہوا تو میرا خیال تھا کہ اس کی حکومت غالباً زیادہ عرصے تک نہیں رہے گی اس لئے کہ جرمنی کی مالی مشکلات کا اس نے کوئی حل پیش نہیں کیا تھا۔ اسی طرح جہاں کہیں فاشزم پھیلا میں نے اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید ترقی دشمن کا یہ آخری مورچہ ہے اور اس کے بعد یقیناً وہ وقت آئیگا کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن پھر سوچتا تھا کہ یہ میرے خیالات ہیں یا میری آرزوئیں۔ کیا یہ واقعی اتنی ہی بدیہی بات ہے کہ فاشزم کی روح اس قدر آسانی اور تیزی سے فرو ہو جائے گی۔ اور اگر فاشٹ مطلق العنانی (ڈکٹیٹر شپ) کیلئے حالات بالکل نا قابل برداشت بھی جائیں تو ایسی حالت میں کیا وہ لوگ اپنے ملکوں کو تباہ کن جنگوں میں نہ پھنسا دیں گے۔ بجائے اس کے کہ خود ہار مان لیں؟ اور پھر اس کشمکش کا آخر حشر کیا ہوگا؟

اسی اثناء میں قسم قسم کا فاشزم دنیا میں پھیلا۔ اسپین جہاں ایماندار لوگوں کی جمہوری حکومت کا جدید نظام قائم ہوا تھا جس کے متعلق کسی نے خوب کہا کہ بس گویا ہو بہو حکومتوں کا مانچسٹر گارجین ہے وہ بھی بری طرح رجعت پسندی کی طرف واپس لوٹ گیا تھا۔ وہاں کے ایماندار لبرل رہنماؤں کی اچھی اچھی باتوں کے باوجود اس کو نیچے کی طرف پھسلنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ ہر جگہ لبرل تحریک جدید حالات کا مقابلہ کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ وہ لوگ بس الفاظ اور جملوں کے پیچھے پڑے رہے اور نادانی سے یہ سمجھتے رہے کہ باتیں بنانا اور کام کرنا برابر ہے چنانچہ جب کوئی نازک موقع آیا تو وہ اسی طرح چپ چپاتے غائب ہوئے جیسے کسی فلم کے آخری حصے کا اختتام ہوتا ہے۔

آسٹریا کے المناک حالات پر مانچسٹر گارجین کا مقالہ افتتاحیہ میں نے بڑی

دلچسپی سے پڑھا اور اس کو پسند کیا۔ اس نے لکھا تھا کہ معلوم نہیں اس خونریز جھگڑے کے بعد اب آسٹریا کی صورت کیا ہوگی؟ کیا آسٹریا پر اب یورپ کے سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ بندوقوں اور مشین گنوں کے زور سے حکومت کریں گے؟ لیکن اگر انگلستان آزادی کا حامی ہے تو آخر اس کے وزیر اعظم کی زبان اتنی خاموش کیوں ہوگئی ہے؟ ہم نے ان کی زبان سے ڈکٹیٹر شپ کی تعریفیں سنی ہیں ہم نے انہیں یہ کہتے سنا ہے کہ اس کی بدولت قوموں کی روح کیسے زندہ ہوتی ہے اور ایک نیا نقطہ نظر اور نئی جان پیدا ہو جاتی ہے اس نئے انگلستان کے وزیر اعظم کو ان بے رحموں اور سفاکیوں کے متعلق بھی کچھ اظہار خیال کرنا چاہئے۔ خواہ وہ کسی ملک سے تعلق رکھتی ہوں، جو اکثر جسموں کو قتل کرتی ہیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ روح کو موت کا منہ دکھاتی ہیں اور اس سے کہیں بری موت کا۔

لیکن خود مانچسٹر گارجین اگر آزادی کا حامی ہے تو جب ہندوستان میں آزادی کا سر کچلا جاتا ہے اس وقت اس کی زبان سے کچھ کیوں نہیں نکلتا؟ ہم لوگوں نے بھی نہ صرف جسمانی تکالیف برداشت کی ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ مصیبت ہے جو ہماری روح نے جھیلی ہے۔

آسٹریا کی جمہوریت تباہ کر دی گئی گو اس نے آخر دم تک مقابلہ کیا جس سے اس کی عظمت اور شان ہمیشہ قائم رہے گی اور ایک ایسی داستان باقی رہے گی جس سے شاید آئندہ پھر کبھی یورپ کی آزادی کی چنگاری روشن ہو جائے۔

یورپ اب آزادی کی سانس نہیں لے سکتا۔ اس لئے کہ وہ آزاد نہیں رہا اب وہاں صحیح قسم کے جذبات اور خیالات کا اظہار اور تبادلہ مفقود ہے۔ رفتہ رفتہ دم گھٹنے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور اب سوائے اس کے کہ کوئی شدید لرزے کی کیفیت یا اندر ہی اندر سے کوئی تشنجی کیفیت ظاہر ہو اور خود بخود دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ مارنا شروع کر دیا جائے۔ تو شاید اس فالج سے بچ سکے جو دماغ پر گرنے والا ہے۔

دریائے دھائن سے لے کر کوہ یورال تک یورپ ایک بہت بڑا قید خانہ ہے۔

یہ وہ دل ہلانے والی عبارتیں تھیں جن کی صدائے بازگشت میرے دل سے بھی اٹھی لیکن اسی کے ساتھ میں حیرت سے سوچتا تھا کہ آخر ہندوستان کے متعلق کیا ہو گیا ہے؟ مانچسٹر گارجین یا آزادی کے دوسرے حامی جن کا وجود انگلستان میں یقیناً ہے ہماری حالت کی طرف سے ایسے باخبر کیوں ہیں؟ جس بات کو دوسری جگہ وہ اس قدر جوش سے برا کہتے ہیں اس کی طرف سے یہاں کیسے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ایک بہت بڑے انگریز لبرل لیڈر نے جن کی تعلیم و تربیت انیسویں صدی کے ماحول اور روایات میں ہوئی تھی جو طبعاً بہت محتاط اور بہت سنبھل کر گفتگو کرنے والے آدمی تھے۔بیس سال ہوئے جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل کہا تھا کہ بجائے اس کے کہ میں خاموشی کے ساتھ قانون کے مقابلہ میں تشدد کی اس افسوس ناک کامیابی کا نظارہ دیکھوں میں یہ پسند کروں گا کہ ہمارا یہ **ملک** صفحہ تاریخ سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ یہ ایک بہادرانہ خیال تھا جو نہایت فصاحت سے بیان کیا گیا اور انگلستان کے لاکھوں جاں باز نوجوان اس کے تحفظ کے لئے نکل کھڑے ہوئے لیکن آج اگر کوئی ہندوستانی مسٹر اسکوفتھ کی طرح کوئی بیان دینے کی جرات کرے تو معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہو۔

قوموں کی نفسی کیفیت بھی کس قدر پیچیدہ ہوتی ہے۔اپنے متعلق ہم میں سے اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ تو حق و انصاف پر ہیں باقی دوسرے لوگ اور دوسرے ممالک غلطیاں اور نا انصافیاں کرتے ہیں۔کسی نہ کسی طرح ہمیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کی طرح نہیں ہیں کچھ ضرور ہے لیکن آداب شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔اور اگر خوش قسمتی سے ہم لوگ ایک حکمران قوم ہونے کی حیثیت سے دوسرے ممالک کی قسمتوں کے مالک ہوں تو پھر تو یقین نہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس بہترین دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہی سب

سے بہتر ہے اور جو لوگ اس کے خلاف شور کرتے ہیں وہ یا تو خود غرض ہیں یا فریب خوردہ احمق جو ہماری بخشی ہوئی نعمتوں اور برکتوں پر ناشکری کرتے ہیں۔

برطانوی لوگ ایک جزیرے کی رہنے والی قوم ہیں اور مسلسل کامیابی اور مرفہ الحالی کی وجہ سے وہ تمام دوسرے لوگوں کو حقیر اور ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ کسی نے ان کے متعلق کہا ہے کہ ان کے خیال میں تو جیسوں کی بستی کیلے سے شروع ہو جاتی ہے لیکن یہ الفاظ بہت زیادہ عام ہیں غالباً برطانیہ کے اعلیٰ طبقوں کی نظر سے دنیا کو تقریباً حسب ذیل درجوں میں تقسیم کیا جائیگا۔ (۱) برطانیہ اس کے بعد بہت جگہ چھوڑ کر پھر (۲) برطانوی نو آبادیات (صرف گورے رنگ کی آبادی) اور امریکہ لیکن صرف اینگلوسیکسن باقی دوسرے یورپی ممالک کے مہاجر اس میں شامل نہیں (۳) مغربی یورپ (۴) یورپ کا باقی حصہ (۵ جنوبی امریکہ) لاطینی اقوام اس کے بعد پھر بہت جگہ چھوڑ کر (۶) ایشیا اور افریقہ کی سانولے زرد اور سیاہ رنگ کی اقوام سب کو کم و بیش ایک ہی طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔

ہم آخری درجے والے ان بلندیوں سے کتنی دور ہیں جہاں ہمارے حکمران رہتے ہیں! پھر یہ کیا کوئی تعجب کی بات ہے کہ جب کبھی وہ ہماری طرف نظر کرتے ہیں تو انہیں سب دھندلا دھندلا دکھائی دیتا ہے اور پھر جب ہم لوگ لگتے ہیں آزادی جمہوریت کی بات چیت کرنے تو انہیں اس سے چڑ ہوتی ہے۔ یہ الفاظ (آزادی و جمہوریت) شاید ہم لوگوں کیلیے نہیں بنے ہیں۔ ایک بہت بڑے لبرل مدبر جان مارلے نے کیا یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ مستقبل بعید میں وہ ہندوستان کے لئے جمہوری نظام حکومت کا تصور کبھی نہیں کرسکتے۔ کناڈا کے بالوں والے لبادے کی طرح ہندوستان کی آب و ہوا کیلئے جمہوری نظام حکومت موزوں اور مناسب ہی نہیں ہے اور بعد میں برطانیہ کے مزدوروں کی جماعت نے جو تحریک اشتراکیت کی علمبردار اور غریبوں کی حامی اور مددگار سمجھی جاتی ہے اپنی فتح و کامیابی کے جوش میں ہم لوگوں کو

۱۹۲۴ء میں جو تحفہ دیا وہ بنگال آرڈی نینس کی تجدید کی صورت میں تھا اور ان کے دوسرے دور حکومت میں ہماری قسمت پہلے سے بھی زیادہ کھوٹی نکلی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے بدخواہ نہیں ہیں اور جب وہ اپنے واعظانہ انداز میں ہمیں مخاطب کر کے کہتے ہیں پیارے اور محبوب بھائیو تو ان کا دل نیکی کے احساس سے یقیناً منور ہو جاتا ہے۔ لیکن بہرحال ہم ان کی نظروں میں وہ نہیں ہو سکتے جو وہ خود ہیں اور ہمیں دوسرے ہی معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے۔ جب ایک انگریز اور ایک فرانسیسی لسانی اور تمدنی اختلاف کی وجہ سے ہم خیال نہیں ہو سکتے تو پھر ایک انگریز اور ایک ایشیائی میں کتنا زبردست فرق ہوگا۔

حال ہی میں ہندوستان کے اصلاحات کے مسئلے پر دارالامرا میں بحث و مباحثے ہو رہے تھے اور معزز امراء نے کئی بصیرت افروز تقریریں کیں ان میں سے ایک تقریر لارڈ لٹن کی تھی جو ہندوستان کے ایک صوبے میں سابق گورنر رہ چکے ہیں اور جنہوں نے کچھ عرصے تک وائسرائے کی قائمقامی بھی کی تھی۔ ان کے متعلق اکثر سنا گیا ہے کہ وہ آزاد خیال اور بہت ہمدرد گورنر تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجموعی حیثیت سے حکومت ہندوستان کی اس سے کہیں زیادہ نمائندگی کرتی ہے جتنی کہ سیاسین حکومت نمائندگی کر سکتی ہے۔ حکام کی طرف سے فوج اور پولیس کی طرف سے والیان ریاست کی طرف سے اور ہندو مسلمان دونوں کی طرف سے۔ برخلاف اس کے کانگریس کے سیاسین جملہ فرقوں میں کسی ایک فرقے کی نیابت کا دعوے نہیں کر سکتے۔ آگے چل کر انھوں نے اپنے مطلب کو اور زیادہ واضح کر دیا کہ جب میں ہندوستان کی رائے عامہ کا ذکر کرتا ہوں تو میرے ذہن میں وہ لوگ ہیں جن کے تعاون عمل پر مجھے بھروسا کرنا پڑا تھا اور آئندہ بھی وائسرائے اور گورنروں کو جن کے تعاون پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔

اس تقریر سے دو بہت دلچسپ باتیں نکلتی ہیں ایک تو یہ کہ ہندوستان سے

مطلب صرف وہ ہندوستان ہے جو برطانیہ کی مدد کرتا ہے۔ اور دوسرے کہ کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں سب سے زیادہ نمائندہ جماعت ہے۔اس لئے اس ملک میں سب سے زیادہ جمہوری ادارہ یہی ہے۔چونکہ یہ دلیل سنجیدگی سے پیش کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہر سویز کے اس پار انگریزی الفاظ کے معنی کچھ تبدیل ہو جاتے ہیں چنانچہ اس دلیل کے بعد بہ ظاہر دوسرا دعوی یہ کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ بادشاہ ہر شخص کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے مطلق العنان حکومت سب سے زیادہ نمائندہ اور جمہوری ہوتی ہے اور اس صورت سے ہم لوگ ایک بار پھر اس نظریے پر پہنچ جاتے ہیں کہ بادشاہ مامور من اللہ ہوتا ہے اور ریاست کیا ہے میں ہی ریاست ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ حال ہی میں خالص مطلق العنانی کی حمایت بھی ایک بہت ہی ممتاز شخص نے کی ہے۔انڈین سول سروس کے مایہ ناز رکن سر مالکم سیلے نے بحیثیت گورنر صوبجات متحدہ نومبر ۴۴ء کو بنارس میں تقریر کرتے ہوئے دیسی ریاستوں میں مطلق العنانی کی حمایت کی تھی۔ حالانکہ اس قسم کے نصیحت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔اس لئے کہ کوئی دیسی ریاست خود اپنی مرضی سے مطلق العنانی کو ترک کرنے والی نہیں معلوم ہوتی اور ایک دلچسپ بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ مطلق العنانی کی حمایت کے لئے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ یورپ میں جمہوریت ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسمعیل نے تعجب ظاہر کیا ہے کہ ایک طرف پارلیمنٹری جمہوریت ہر جگہ زوال پذیر ہے اور دوسری طرف کایا پلٹ دینے والی اصلاحات کی تائید کی جا رہی ہے۔اور مجھے یقین ہے کہ اس ریاست کا ضمیر گواہی دیگا کہ ہمارا موجودہ دستور اساسی ہماری تمام ضروریات کیلئے عملا کافی طور پر جمہوری ہے ریاست میسور کا ضمیر غالبا مہاراجہ اور دیوان کے لئے ایک مابعد الطبیعی تصور ہے۔میسور میں جس قسم کی جمہوریت اس وقت رائج ہے اس میں اور مطلق العنانی

میں کوئی فرق نہیں۔

اگر ہندوستان کے لئے جمہوری نظام حکومت موزوں نہیں ہے تو یہ ظاہر مصر کے لئے بھی اسی طرح یہ نظام جمہوری ناموزوں ہوگا۔ میں نے بھی اسٹیٹس مین میں اس لئے کہ یہ اخبار موجودہ جیل میں مجھے دیا جاتا ہے قاہرہ کا ایک طویل مراسلہ پڑھا ہے۔ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ وزیر اعظم نسیم پاشا نے ذمہ دار حلقوں میں اپنے اس اعلان سے کچھ کم خطرہ نہیں پیدا کیا ہے کہ انہیں توقع ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں سے اور بالخصوص وفد جماعت سے اشتراک عمل حاصل ہوگا۔ اور یا تو ایک مقامی کانفرنس ہوگی یا Constituent Assembly کیلئے انتخابات ہوں گے لیکن بہر صورت ایک جدید دستور اساسی کی تشکیل کی جائے گی۔ اس کا مطلب بالآخر صرف یہ ہوگا کہ ایک جمہوری نظام حکومت کی طرف پھر عود کیا جائے حالانکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کیلئے یہ طرز عمل ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوا، اس لئے کہ ماضی میں اس نے ہمیشہ عوام الناس کے خراب سے خراب جذبات کا پاس اور لحاظ کیا جو شخص بھی مصری سیاست کی اندرونی حالت سے کچھ ہی واقف ہے اس کو ایک لمحے کیلئے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انتخابات میں ایک بار پھر وفد جماعت اکثریت کے ساتھ منتخب ہوگی۔ اسلئے اگر اس طریق کار کو روکنے کیلئے کوئی تدبیر اختیار کی گئی تو کچھ عرصے کے بعد ایک ہمارے سر ایک ایسی حکومت ڈالی جائے گی جو ضرورت سے زیادہ جمہوری پردیسیوں کی مخالف انقلابی حکومت ہوگی۔

یہ تجویز کی گئی ہے کہ انتخابات اس طرح کرائے جائیں کہ وفد جماعت کے توڑ کیلئے حکومت کے اثر و اقتدار سے کام لیا جائے لیکن بدقسمتی سے وزیر اعظم کا دماغ اتنا زیادہ قانونی واقع ہوا ہے کہ وہ اس قسم کی کوئی بات نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ دوسری صورت یہ باقی رہ گئی ہے کہ وہائٹ ہال مداخلت کرے۔ اور یہ جتلا دے کہ اس قسم کی حکومت کو وہ دوبارہ برداشت نہ کریگا۔

اب میں یہ نہیں جانتا کہ وہائٹ ہال اس معاملے میں کوئی کاروائی کریگا یا نہیں یا مصر میں کیا ہوگا۔ لیکن اس دلیل سے جو غالبا ایک حریت پسند انگریز نے پیش کی ہے ہمیں ہندوستان اور مصر کے حالات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں کسی قدر مدد ضرور ملے گی اسٹیٹس مین نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ خرابی جڑ ہمیشہ یہ رہی ہے کہ مصری رائے دہندہ کا طرز زندگی اور زاویہ نگاہ اس طرز زندگی اور زاویہ نگاہ سے مطابقت نہیں رکھتا جس سے جمہوریت کی نشوونما ہوتی ہے، اس عدم مطابقت کی مثال آگے چل کر دی گئی ہے۔ یورپ میں بالعموم جمہوریت کا خاتمہ اس لئے ہوا کہ وہاں بہت زیادہ جماعتیں تھیں۔ اور مصر میں یہ مشکل درپیش ہے کہ وہاں صرف ایک ہی جماعت ہے یعنی وفد۔

ہندوستان میں ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری فرقہ وارانہ تقسیم ہماری جمہوری ترقی میں حائل ہے اور اس لئے ناقابل تردید منطق کی وجہ سے ان تقسیموں کو مستقل طور پر قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم سے کہا جاتا ہے ہم لوگ پورے طور پر متحد نہیں ہیں۔ مصر میں کوئی فرقہ وارانہ اختلاف نہیں ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مکمل سیاسی اتحاد قائم ہے۔ اس کے باوجود یہی اتحاد آزدی اور جمہوریت کی راہ میں ایک روڑا بن جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ جمہوریت کا راستہ بالکل سیدھا اور تنگ ہے۔ ایک مشرقی ملک کے لئے جمہوریت کے معنی صرف یہ معلوم ہوتے ہیں کہ فرماں روا سلطنت کے احکام کی تعمیل کی جائے اور اس کے مفاد کو نہ چھوا جائے صرف اس ایک شرط کے بعد جمہوری آزادی بلا روک ٹوک یہاں پھل پھول سکتی ہے۔

۱۔ دارالامرا، ۱۷ دسمبر ۱۹۳۴ء

۲۔ میسور، ۲۱ جون ۱۹۳۴ء ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲۳ کا حاشیہ۔

۳۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۳۴ء

۴۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں برطانوی تسلط کے خلاف مصر بھر میں بلوے ہوئے تھے۔

اداسی

اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنا سر اس جگہ رکھ دوں جہاں گھاس
ٹھنڈی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا، اے ماں یہ تھکا ہوا بچہ تیرے قدموں میں
پڑا ہے۔اس کے سارے خواب اس کے دل سے محو ہو گئے ہیں

اپریل کا مہینہ آ گیا باہر کے واقعات کی کچھ اڑتی اڑتی خبریں علی پور جیل کی کوٹھڑی میں میرے کانوں تک پہنچیں۔اور یہ خبریں بہت ناخوشگوار اور پریشان کن تھیں۔ایک روز جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اور باتوں کے سلسلے میں مجھ سے یہ کہا کہ مسٹر گاندھی نے تحریک سول نافرمانی کو روک دیا ہے۔اس سے زیادہ مجھے بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔یہ خبر میرے لئے خوش آئند نہ تھی۔اور مجھے اس چیز کے ختم ہو جانے کا قلق ہوا۔جس میں میں نے اپنے آپ کو کئی سال سے محو کر دیا تھا پھر بھی اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ اس کا خاتمہ تو بہر حال ہونا ہی تھا۔میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی نہ کسی وقت سول نافرمانی کو کم از کم مدت کے لئے بند کرنا ہی پڑے گا۔افراد تو بے شک نتائج کی پروا کئے بغیر ایک غیر محدود مدت تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔لیکن قومی ادارے اس طریقے سے کام کبھی نہیں کرتے ہیں۔مجھے اس بارے میں مطلق شبہ نہ تھا کہ گاندھی جی نے عام ملک کی اور اکثر کانگرسی کارکنوں کی ذہنی کیفیت کا صحیح اندازہ کیا ہے اس لئے ہر چند کہ یہ جدید تبدیلی ناخوشگوار تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

میں نے یہ بھی افواہ سنی کہ کونسلوں میں جانے کی غرض سے سوراج پارٹی کو دوبارہ زندہ کرنے کی ایک نئی تحریک اٹھائی گئی ہے۔یہ چیز بھی ناگزیر سی معلوم ہوتی تھی اور ایک عرصے سے میری یہ رائے تھی کہ کانگریس آئندہ انتخابات سے کنارہ کشی نہیں اختیار کر سکتی۔جیل خانہ سے باہر پانچ مہینے کی آزادی کے زمانے میں میں نے

اس رجحان کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے کہ میں اسے قبل از وقت سمجھتا تھا اور مجھے یہ اندیشہ تھا کہ اس کی وجہ سے عملی جدوجہد ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اور پھر عام کانگریسیوں میں سماجی تبدیلیوں کے متعلق جن نئے نئے خیالات کا خمیر اٹھ رہا ان کی طرف سے توجہ ہٹ جائے گی میں سمجھتا تھا کہ جتنی دیر تک یہ کشمکش جاری رہے گی اتنے ہی زیادہ خیالات عوام میں اور تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی پھیلیں گے۔ اور ہماری سیاست اور معیشت کی تہ میں جو حقائق ہیں وہ صاف صاف ظاہر ہو جائیں گے۔ جیسا کہ لینن نے کسی جگہ کہا ہے ہر قسم کی سیاسی کشمکش مفید ہوتی ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے چھپی ہوئی باتیں کھل جاتی ہیں اور میدان سیاست میں جو اصل قوتیں کارفرما ہیں وہ ظاہر ہو جاتی ہیں۔ واقعات منظر عام پر آ جاتے ہیں اور لوگ حقیقت کے سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مجھے بھی یہ توقع تھی کہ اس طریقے سے کانگریس کے خیالات سلجھ جائیں گے۔ اس کی منزل مقصود واضح ہو جائے گی۔ اور اس کا شیرازہ زیادہ مضبوطی سے بند ہو جائے گا۔ غالبا کچھ کمزور عناصر اس میں سے نکل جائیں گے لیکن اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور جب وہ وقت آئے گا کہ اصولی حیثیت سے بھی عملی جدوجہد کے طریقے کو ترک کر کے آئینی اور قانونی طریقوں کی طرف رجوع کیا جائے گا تو کانگریس کا ترقی پسند اور کام کرنے والا عنصر ان طریقوں کو بھی اپنے اصل مقصد کے وسیع نقطہ نظر سے استعمال کر سکے گا۔

بہ ظاہر تو وہ وقت اب آ گیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ جو لوگ کانگریس کے موثر کام اور سول نافرمانی کی تحریک کے روح رواں سمجھے جاتے تھے وہ پیچھے ہٹ رہے تھے اور دوسرے حضرات جنھوں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا برسر اقتدار ہوتے جاتے تھے۔

کچھ روز بعد ہفتہ وار اسٹیٹس مین میرے پاس آیا اور اس میں گاندھی جی کا وہ بیان تھا جو انہوں نے تحریک سول نافرمانی واپس لیتے وقت شائع کیا تھا۔ میں نے

اس کو حیرت سے پڑھا اور مجھے اس قدر رنج ہوا کہ دل بیٹھنے لگا۔ میں نے اس کو بار بار پڑھا اور سول نافرمانی اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو دماغ میں تھا غائب ہو گیا اور اس کی جگہ شکوک و شبہات اور خیالات کی کشمکش نے لے لی۔ گاندھی جی نے لکھا تھا کہ سیہ گرہ آشرم کے رہنے والوں سے ایک نج کی بات چیت اس بیان کی محرک ہوئی۔ ایک گفتگو کے دوران میں مجھے یہ عبرت انگیز اطلاع ملی کہ میرے ایک قابل قدر قدیم رفیق نے جیل خانہ کا مقررہ کام پورا کرنے میں تامل کیا اور اپنے کتب بینی کے شغل کو اس پر ترجیح دی۔ بلاشبہ یہ بات سیہ گرہ کے اصول کے خلاف ہے لیکن اپنے ان عزیز دوست کی خامی سے بھی زیادہ مجھے خود اپنی خامیوں کا اتنا احساس ہوا جتنا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرے دوست نے کہا کہ وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کمزوریوں سے واقف ہوں۔ لیکن میں اندھا تھا اور ایک قائد کا اندھا ہونا ہرگز قابل معافی نہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فی الحال صرف مجھی کو سب کی طرف سے سول نافرمانی کرنی چاہیے۔

گاندھی جی کے ان دوست کی خامی یا قصور اگر اسے قصور کہا جا سکتا ہے۔ ایک بہت ہی معمولی سی بات تھی۔ میں خود اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے بارہا یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ اور مجھے اس کا مطلق افسوس اور پچھتاوا نہیں ہے لیکن اگر یہ معاملہ سنگین بھی تھا تو کیا ایک اتنی وسیع قومی تحریک کو جس میں بیسیوں ہزار آدمی بلاواسطہ اور لاکھوں آدمی بالواسطہ شریک تھے محض اس لئے بند کر دینا چاہیے تھا کہ ایک فرد سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی۔ مجھے تو یہ بات بالکل خلاف عقل اور منافی اخلاق معلوم ہوئی۔ میں یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ کونسی بات سیہ گرہ کے مطابق ہے اور کونسی نہیں ہے! لیکن اپنی بساط کے لائق میں نے بھی بعض اصولوں کی پیروی کی کوشش کی ہے اور گاندھی جی کے اس بیان سے یہ سارے اصول درہم برہم ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ عموماً گاندھی جی اپنے وجدان کے مطابق عمل کرتے ہیں میں اسے

صدائے وطن یا دعاؤں کے جواب کے بجائے وجدان ہی کہوں گا، اور اکثر ان کا وجدان صحیح ہوتا ہے۔انھوں نے بار بار یہ ثابت کردیا ہے کہ عوام کی ذہنیت کو سمجھنے اور تنت کے وقت کام کرنے کا انہیں ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔بعد میں وہ اپنے عمل کی جو توجیہیں کرتے ہیں وہ عموماً نکتہ بعد از وقوع کی حیثیت رکھتی ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی کو مطمئن کرسکیں۔ہر لیڈر یا عملی آدمی کو نازک موقعوں پر ہمیشہ تحت شعوری کام کرنا پڑتا ہے۔اور پھر وہ اپنے عمل کی توجیہیں تلاش کرتا ہے۔میں یہ سمجھتا تھا کہ سول نافرمانی کو ملتوی کرنے میں گاندھی جی نے وہی کیا جو قرین مصلحت تھا لیکن جو دلیل انھوں نے دی وہ میرے نزدیک عقل و فہم کیلئے باعث توہین تھی اور ایک قومی تحریک کے لیڈر سے بہت بعید تھی۔انہیں پورا حق حاصل تھا کہ اپنے آشرم والوں کے ساتھ جو چاہتے کرتے، ان حضرات نے طرح طرح کے عہد کئے تھے، ایک خاص ضابطے کی پابندی کا اقرار کیا تھا۔لیکن کانگریس نے ایسا نہیں کیا تھا اور نہ میں نے کیا تھا پھر کیا وجہ تھی کہ ہم اس طرح جھلائے جائیں۔ان وجوہ کی بنا پر جو میرے نزدیک تصوف یا مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں کیا یہ تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی سیاسی تحریک اس بنیاد پر چل سکتی ہے؟ میں نے اپنی خوشی سے سیہ گرہ کے اخلاقی پہلو کو جہاں تک میں اس کو سمجھ سکتا تھا (بعض شرائط کے ساتھ) تسلیم کیا تھا۔اس کا بنیادی اصول مجھے پسند تھا کہ وہ سیاست کو بلند تر اور برتر سطح پر پہنچادے گا۔میں یہ ماننے کے لئے تیار تھا کہ اچھے مقصد کیلئے برے ذرائع اختیار کرنا جائز نہیں لیکن اس نئی تاویل کے نتائج بہت دور تک پہنچے تھے اور اس میں ایسے پہلو نکل سکتے تھے جن سے مجھے طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو گئے۔

اس پورے بیان نے مجھے سخت تردد اور پریشانی میں ڈال دیا۔آخر میں کانگریس والوں کو یہ نصیحت دی گئی تھی۔انہیں لازم ہے کہ ایثار اور اختیاری افلاس کی خوبیوں کو سمجھیں اور اس کی عادت ڈالیں۔انہیں چاہئے کہ قومی تعمیر کے کاموں میں

لگ جائیں یعنی خود چرخہ کات کر اور کپڑا بن کر کھدر کو رواج دیں زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کر کے مختلف فرقوں میں قلبی اتحاد پیدا کریں۔ اپنی ذات سے چھوت چھات کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو دور کر دیں۔ ان لوگوں پر جو نشے کے عادی ہیں ذاتی اثر ڈال کر اور خود ہر لحاظ سے ایک صاف زندگی بسر کر کے ترک منشیات کی تلقین کریں۔ ان خدمات کے ذریعہ انسان اتنا کما سکتا ہے کہ غریبوں کیسی زندگی گزار لے۔ لیکن جو لوگ اس قدر عسرت سے بسر نہیں کر سکتے انھیں چاہئے کہ ان چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو جو قوم کیلئے مفید ہیں اور جن میں زیادہ آمدنی کی گنجائش ہے اختیار کر لیں۔

یہ وہ سیاسی پروگرام تھا جس پر ہم لوگوں کو عمل کرنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے اور گاندھی جی کے درمیان ایک بہت بڑا خلیج حائل ہو گیا۔ درد کی ایک ٹیس کے ساتھ میں نے یہ محسوس کیا کہ اطاعت اور وفاداری کے جن رشتوں نے سالہا سال سے مجھے ان کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گئے۔ ایک عرصہ سے میرے اندر ایک ذہنی کشمکش جاری تھی۔ گاندھی جی کی بہت سی باتیں یا تو میری سمجھ میں نہیں آئی تھیں یا مجھے پسند نہیں آئی تھیں۔ ان کے فاتحِ تحریک سول نافرمانی کے زمانے میں جب ان کے ساتھی لڑائی میں مصروف تھی ان کے دوسرے مسائل میں منہمک ہو جانا، ان کی ذاتی اور خود پیدا کی ہوئی پابندیاں جن کی بدولت انہیں عجیب و غریب روش اختیار کرنی پڑی کہ جیل کے چھوٹنے کے بعد بھی اپنے عہد کی رو سے سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، ان کا پرانے تعلقات اور عہد و پیان کو نظر انداز کر کے اور ان کاموں کو جو بہت سے رفیقوں کے ساتھ مل کر شروع کئے تھے نا تمام چھوڑ کر نئے تعلقات اور نئے عہد و پیاں میں الجھ جانا سب باتوں سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

مجھے اپنی رہائی کے مختصر زمانے میں یہ اور دوسرے اختلافات پہلے سے بھی

زیادہ محسوس ہوئے تھے۔ گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ میرے اور ان کے مزاج میں اختلاف ہے لیکن شاید یہ اختلافات، اختلاف مزاج سے کچھ بڑھ کر تھے۔ اور میں یہ دیکھتا تھا کہ اکثر معاملات کے متعلق میں ایک صاف اور صریح رائے رکھتا ہوں جو ان کی رائے کے مخالف ہے۔ اس کے باوجود اب تک میں نے یہ کوشش کی تھی کہ جہاں تک ہو سکے اپنے خیالات کو اس بڑے مقصد یعنی قومی آزادی کے تابع رکھوں جس کے لئے کانگرس کام کر رہی تھی۔ میں اپنے لیڈر اور اپنے رفیقوں کا وفادار رہا اس لئے کہ میرے اصول اخلاق میں وفاداری بہت بلند درجہ رکھتی ہے چنانچہ جب مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کہ میرے عقیدے کی کشتی کا لنگر ٹوٹا جاتا ہے تو مجھے سخت روحانی کشمکش کا سامنا ہوتا تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح مفاہمت کر لیا کرتا تھا۔ شاید میں نے غلطی کی، اس لئے کہ یہ کسی شخص کی لئے جائز نہیں کہ اپنے عقیدے کا لنگر ٹوٹ جانے دے۔ بہرحال مقاصد کی کشمکش میں اپنے رفیقوں کی وفاداری پر قائم رہا اور یہ یقین کرتا رہا کہ واقعات کی پرزور رفتار اور ہماری جدوجہد کی ترقی ان ساری مشکلات کو جو میری راہ میں حائل ہیں دور کر دے گی۔ اور میرے رفیقوں کو میرے نقطہ نظر سے قریب تر کر دے گی۔

مگر سوال یہ تھا کہ اب کیا کروں؟ یکایک مجھے علی پور جیل کی اس کوٹھڑی میں شدید تنہائی کا احساس ہونے لگا، زندگی ایک وحشت ناک صحرا کی طرح سنسان نظر آنے لگی۔ مجھ پر اس تلخ ترین حقیقت کا انکشاف ہوا کہ کسی اہم معاملہ میں دوسروں پر بھروسا کرنے سے دل ٹوٹ جاتا ہے۔

میرے دل میں جو غصہ بھرا ہوا تھا وہ میں مذہب اور جذبہ مذہب پر اتارنے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہ فصاحت خیال اور استقامت رائے کا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ اس کی بنیاد محض جذبہ اور جوش پر ہے۔ اسے روحانیت کا دعویٰ ہے مگر حقیقت میں یہ روحانیت سے کوسوں دور ہے۔ اسے تو بس دوسری دنیا کی فکر ہے۔

انسانی مقاصد، سماجی مقاصد اور سماجی انصاف سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اپنے من مانے عقائد میں مگن رہتا ہے اور زندگی کی حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ کہیں یہ ان عقائد سے ٹکرا نہ جائے۔ اس نے اپنی بنیاد حق پر رکھی ہے لیکن اس گھمنڈ میں کہ اس نے حق کی کام معرفت حاصل کر لی ہے وہ تلاش حق کی زحمت نہیں گوارا کرتا اور اب اس کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ دوسروں کو تلقین کرے۔ حق پرستی اور عقیدہ پرستی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دارومدار ظلم پر ہے۔ وہ تلوار کے جبر و تشدد کو برا کہتا ہے لیکن اس جبر و تشدد کو نہیں دیکھتا جو خاموشی کے ساتھ امن کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے اور کروڑوں غریبوں کو فاقوں مار ڈالتا ہے اور اس سے بدتر یہ کہ بظاہر کوئی جسمانی تکلیف پہنچائے بغیر ذہن کو شل کر دیتا ہے، روح کو کچل دیتا ہے اور دل کو توڑ دیتا ہے۔

اور اس کے بعد مجھے پھر اس شخص کا خیال آیا جو میرے اندر یہ ہیجان برپا کرنے کا باعث تھا۔ گاندھی جی بھی کس قدر عجیب و غریب آدمی ہیں۔ ان میں ایک حیرت انگیز کشش اور ایک پراسرار تاثیر ہے۔ ان کی تحریروں سے اور ان کے اقوال سے کوئی ان کی ذات کو نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ بلند ہے جتنا ان چیزوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کی انہوں نے کس قدر زبردست خدمت کی ہے۔ انہوں اس **ملک** کے باشندوں میں ہمت اور مردانگی، انضباط اور تحمل کی صفات پیدا کیں، انہیں مقصد کی خاطر قربانی کرنا سکھایا اور اپنے عجز و انکسار کے باوجود ان کے دلوں کو فخر و تمکنت سے معمور کر دیا۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ سیرت کی محکم بنیاد صرف ایک ہی ہے یعنی ہمت بغیر ہمت کے نہ اخلاق کوئی چیز ہے، نہ مذہب اور نہ محبت جب تک انسان ڈرتا ہے اس وقت تک نہ وہ حق کی پیروی کر سکتا ہے نہ محبت کی راہ پر چل سکتا ہے۔ تشدد سے اس قدر بیزار ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیں

بتایا تھا کہ بزدلی ایسی چیز ہے جو تشدد سے بھی زیادہ قابل نفرت ہے اور انضباط اس کی دلیل ہے کہ انسان جو کچھ کہتا ہے وہ کر دکھائے گا۔ ایثار، انضباط اور ضبط نفس کے بغیر نہ فلاح کی امید ہے اور نہ نجات کی صورت۔ جب تک انضباط نہ ہو صرف ایثار و قربانی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بظاہر یہ خالی خولی الفاظ پیش پا افتادہ معلوم ہوتے ہے۔ لیکن ان الفاظ کے پیچھے ایک قوت تھی اور سارا ہندوستان یہ جانتا تھا کہ یہ چھوٹا سا انسان جو کچھ کہتا ہے وہ کر دکھائے گا۔

ان کی ذات ہندوستان کی نمائندہ اور اس قدیم اور مظلوم ملک کی روح مظہر بن گئی گویا وہ مجسم ہندوستان تھے اور ان کی تمام کمزوریاں ہندوستان کی کمزوریاں تھیں۔ اگر ان کی کوئی توہین کرے تو یہ ایک محض ذاتی معاملہ نہیں بلکہ سارے ملک کی توہین تھی اور وائسرائے یا دوسرے حضرات جو ان کے ساتھ حقارت کا اظہار کرتے تھے، یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے نتائج کس قدر خطرناک ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ دسمبر ۳۱ء میں گول میز کانفرنس سے واپسی کے وقت جب پاپائے اعظم نے گاندھی جی سے ملاقات کرنے سے انکار کیا تو مجھے کتنا رنج ہوا تھا۔ میرے نزدیک ان کے انکار سے ہندوستان کی توہین ہوئی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ انکار قصداً کیا گیا تھا اگرچہ غالباً اس سے ان کی توہین مقصود نہ تھی۔ کیتھولک کلیسا اپنے حلقے کے باہر مہاتماؤں اور سنیاسیوں کی بزرگی تسلیم نہیں کرتا اور چونکہ پروٹسنٹ پادریوں نے گاندھی جی کو ایک بہت بڑا مذہبی آدمی اور سچا عیسائی کہا تھا اس لئے کلیسائے کے روم کے لئے یہ اور ضروری ہوگیا کہ اس الحاد سے اپنی بے تعلقی ظاہر کر دے۔

اسی زمانے میں یعنی اپریل ۳۴ء میں نے علی پور جیل کے اندر برنرڈ شا کے نئے ڈرامے پڑھے اور چٹانوں کے اوپر کا دیباچہ اور اس میں حضرت مسیح اور پائلٹ کا مباحثہ مجھے بہت پسند آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہمارے زمانہ پر صادق آتا ہے جب کہ ایک اور سلطنت کا ایک مذہبی آدمی سے مقابلہ ہے۔ اس دیباچہ میں حضرت

مسیح پائیلٹ سے کہتے ہیں کہ میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تو خون کو ترک کردے۔ روم کی عظمت کے متعلق بےکار باتیں نہ کر۔ جسے تو روم کی عظمت کہتا ہے وہ سوائے خوف کے اور کچھ نہیں۔ ماضی کا خوف، مستقبل کا خوف، غریبوں کا خوف، امیروں کا خوف، مہنتوں کا خوف، ذی علم یہودیوں اور یونانیوں کا خوف، وحشی گاتھوں اور ہنوں کا خوف، اس کارتھج کا خوف جسے تم نے اس لئے برباد کیا کہ تم اس سے ڈرتے تھے اور سب سے بڑھ کر خود اپنے تراشتے ہوئے بت قیصر روم کا خوف، اور مجھ جیسے غیرب بے کس آدمی کا خوف جو دربدر ذلتیں سہتا اور دھکے کھاتا پھرتا ہے، غرض خوف ہر چیز کا سوائے خوف خدا کے، اور کسی چیز پر ایمان نہیں سوائے خون اور لوہے اور سونے کے تم جو روم کی حمایت کے لئے کھڑے ہو دنیا بھر کے بزدل ہو اور میں جو سلطنتِ الٰہی کی حمایت کے لیے کھڑا ہوا ہوں ہر مصیبت کا مقابلہ کیا سب کچھ کھو دیا اور ایک ابدی تاج حاصل کرلیا۔

لیکن اس وقت گاندھی جی کی عظمت، یا ان کی ملکی خدمات، یا ان بے شمار احسانات کا جو انہوں نے مجھ پر کئے ہیں، کوئی سوال نہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ ممکن تھا کہ بعض معاملات میں وہ سراسر غلطی پر ہوں، میں اس الجھن میں تھا کہ آخر ان کا مقصد کیا ہے؟ سالہا سال سے میرے ان کے گہرے تعلقات ہیں لیکن آج تک ان کا مقصد صاف طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور مجھے شبہ ہے کہ شاید وہ خود بھی اسے صاف طور پر نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے لئے بس ایک قدم کافی ہے۔ نہ وہ مستقبل کے متعلق غور کرتے ہیں اور نہ کوئی واضح مقصد اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ باربار کہتے کہا کرتے ہیں کہ تم وسائل اور ذرائع کی فکر کرو مقصد اپنی فکر آپ کرلے گا۔ اپنی انفرادی زندگی کو نیک بناؤ پھر سب کچھ خودبخود ہو جائے گا۔ لیکن یہ طرز خیال نہ سیاسی ہے اور نہ علمی اور نا غالبا اخلاقی ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک تنگ نظرانہ ناصحانہ انداز ہے اور اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیکی کیا

ہے؟ یہ محض انفرادی چیز ہے یا اجتماعی؟ گاندھی جی سیرت پر سارا زور دیتے ہیں اور ذہنی تربیت اور نشوونما کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ ذہنی قابلیت بغیر اخلاقی سیرت کے خطرناک ہوتی ہے، لیکن سیرت بغیر ذہنی قابلیت کے کیا معنی رکھتی ہے؟ آخر سیرت کی نشوونما کیونکر ہوتی ہے؟ گاندھی جی کو قرونِ وسطےٰ کے عیسائی ولیوں سے تشبیہہ دی گئی ہے اور ان کے بہت سے اقوال ان لوگوں کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہیں۔ لیکن موجودہ نفسیاتی تجربات اور طریقوں کے ساتھ یہ باتیں کسی طرح نہیں کھپ سکتیں۔

لیکن اور جو کچھ بھی ہو مقصد کا مبہم ہونا میرے خیال میں بہت افسوس ناک ہے اگر عمل کو موثر بنانا ہے تو ایک معین اور واضح مقصد سامنے ہونا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی سراسر منطق کی پابند نہیں اور وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے مقصد میں تبدیلی کرنا پڑے گی لیکن کوئی نہ کوئی مقصد ہمیشہ صریحی طور پر پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

غالباً مقصد کے متعلق گاندھی جی کے خیالات اتنے زیادہ مبہم نہیں ہیں جتنے بظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک خاص مقصد ہے اور وہ دل وجان سے اسے حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں لیکن اس مقصد اور دور حاضرہ کے حالات اور خیالات میں بھی پورا اختلاف ہے اور وہ اب تک ان دونوں چیزوں میں مطابقت نہیں پیدا کر سکے اور نہ ان وسائل کو سوچ سکے جن سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات مبہم معلوم ہوتے ہیں اور وہ خود انہیں واضح کرنے سے بچتے ہیں۔ لیکن ان کا عام رجحان چوتھائی صدی سے بالکل صاف اور واضح رہا ہے جب سے کہ انہوں نے جنوبی افریقہ میں اپنے فلسفے کو ترتیب دینا شروع کیا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب بھی ان کے وہی خیالات ہیں جو ابتدائی تحریروں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ شاید اب ان میں کچھ تبدیلی ہوگئی ہے مگر پھر ان تحریروں سے ان کی

خیالات کی بنیاد کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹۰۹ء میں انہوں نے لکھا تھا کہ ہندوستان کی نجات اس پر موقوف ہے کہ گذشتہ پچاس سال کے اندر اس نے جو سیکھا ہے اس کو بھلا دے۔ ریلیں، تار، ہسپتال وکلاء، ڈاکٹر اور اس قسم کی تمام چیزیں ختم ہو جانی چاہیں اور جو اونچے طبقے کہلاتے ہیں انہیں شعوری اور ارادی طور پر جوش اور خلوص کے ساتھ کسان کی سادہ زندگی اختیار کرنی چاہئے یہ جان کر کہ حقیقی مسرت اس زندگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر مرتبہ جب میں ریل گاڑی یا موٹر میں سوار ہوتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے عقیدے پر ظلم کر رہا ہوں۔ انتہا درجے کی مصنوعی اور تیز رفتار سواریوں کے ذریعے دنیا کی اصلاح کی کوشش کرنی ہے طلب محال سے کم نہیں۔

میرے نزدیک یہ تمام اصول بالکل غلط، مضر اور نا قابل حصول ہیں۔ ان کہ تہ میں افلاس، مصیبت اور راہبانہ زندگی کی محبت اور قدر پوشیدہ ہے جو گاندھی جی کے دل میں ہے۔ ان کے نزدیک ترقی اور تہذیب بلند معیار زندگی پر احتیاجات کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اس پر موقوف ہے کہ انسان بالقصد اور خوشی سے اپنی احتیاجات کو محدود کرے، اسی سے حقیقی خوشی اور قناعت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے خدمت کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔ اگر یہ مقدمات ایک بار تسلیم کر لئے جائیں تو پھر گاندھی جی کے بقیہ خیالات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور ان کے عمل کی نوعیت بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگ ان کے ان اصولوں کو تو تسلیم نہیں کرتے اور توقع یہ رکھتے ہیں کہ ان کا عمل ہماری پسند کے مطابق ہو اور جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر شکایت کرتے ہیں۔

ذاتی طور پر میں افلاس اور مصیبت کی تعریفوں کو برا سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک دونوں چیزیں ہرگز پسندیدہ نہیں ہیں اور ان کا خاتمہ کر دینا چاہے۔ اس طرح میں راہبانہ زندگی کو اجتماعی مقصد کی حیثیت سے پسند نہیں کرتا اگر چہ ممکن ہے

کہ وہ بعض افراد کے لئے موزوں ہو۔ سادگی، مساوات اور ضبط نفس کا میں بھی قائل ہوں مگر نفس کشی کا نہیں۔ میرے خیال میں جس طرح ورزش کرنے والے کو جسم کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح نفس اور عادتوں کی تربیت کرنا اور انہیں قابو میں لانا بھی ضروری ہے۔ یہ توقع کرنا حماقت ہوگی کہ ایک شخص جو بہت آرام طلب ہے موقع پر سخت تکلیفیں اٹھا سکے گا، غیر معمولی ضبط نفس سے کام لے سکے گا یا کوئی بہادری کا کام کر سکے گا۔ اخلاقی صحت کے لئے کم از کم اتنی ہی تربیت اور محنت کی ضرورت ہے جتنی جسمانی صحت کے لئے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ رہبانیت اور نفس کشی اختیار کی جائے۔

اور نہ مجھے یہ پسند ہے کہ کسان کی سادہ زندگی کو اس قدر بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے۔ مجھے تو اس زندگی سے وحشت ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ میں خود اس کو اختیار کروں میں چاہتا ہوں کہ کسانوں کو اس سے نجات دلاؤں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دیہات کو شہر بنا دیا جائے بلکہ یہ ہیں کہ دیہاتی علاقوں میں شہر کی تمدنی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ یہ زندگی بجائے اس کے کہ اس زندگی سے مجھے مسرت حاصل ہو میرے لئے قید سے کم نہ ہوگی۔ پھاوڑا چلانے والے آدمی میں کون سی ایسی خوبی ہے کہ اس کی اس قدر تعریف کی جائے؟ وہ پشت ہا پشت سے اس قدر لوٹا اور کچلا گیا ہے کہ جن جانوروں کے ساتھ وہ رہتا ہے۔ ان میں اور اس میں بہت تھوڑا سا فرق رہ گیا ہے۔

"کس نے اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ نہ اسے رنج کا احساس
ہے نہ مسرت کا، نہ اس کے دل میں امید کی لگن ہے نہ یاس کی خلش"
وہ بیل کی طرح ٹھس اور مٹھا ہو کر رہ گیا ہے۔"

یہ خواہش کہ عقل کو خیرباد کہہ کر اس ابتدائی عہد کی طرف رجوع کیا جائے جس میں عقل کسی شمار میں نہ تھی، میرے لئے بالکل ناقابل فہم ہے۔ اس چیز کو جو انسان کی

عظمت وشان کی بنیاد ہے برا کہا جاتا ہے اور ایک خالص جسمانی اور مادی زندگی، جس میں ذہنی اور روحانی نشوونما کی گنجائش نہ ہو، پسندیدہ قرار دی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ تہذیب میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ لیکن اس میں خوبیاں بھی بہت ہیں اور وہ اپنی خرابیوں کو دور کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ لیکن اسے جڑ سے کھود کر پھینک دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی یہ صلاحیت مٹا دی جائے اور ایک بے کیف، تاریک اور مصیبت کی زندگی کی طرف رجوع کیا جائے۔ نہ ہم انقلابات اور تغیر کے اس سیلاب کو روک سکتے ہیں اور نہ اس سے کنارہ کش ہو سکتے ہیں۔ اور نفسیاتی حیثیت سے ہم لوگ جو جنت عدن کے سیب کا مزہ چکھ چکے ہیں، اس مزے کو کبھی نہیں بھول سکتے اور ابتدائی زندگی کی طرف ہرگز نہیں لوٹ سکتے۔

لیکن یہاں بحث اور دلیل سے کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ یہ دونوں نقطہ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ گاندھی ہمیشہ شخصی نجات کے اور گناہ کے نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں اور ہم میں سے اکثر لوگوں کا نصب العین سماج کی فلاح و بہبود ہے۔ گناہ کے تخیل کو سمجھنا میرے لئے دشوار ہے اور شاید اسی لئے میں گاندھی جی کے طرز خیال کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ انہیں سماجی زندگی کے نظام کا بدلنا مقصود نہیں بلکہ وہ افراد کے نفس کو گناہ سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ سودیشی کا ماننے والا یہ لاحاصل کوشش نہیں کرتا کہ دنیا کی اصلاح کرے، اس لئے کہ اس کا ایمان ہے کہ دنیا خدا کے بنائے ہوئے قاعدوں کے مطابق چلتی ہے اور ہمیشہ چلتی رہے گی۔ اس کے باوجود دنیا کی اصلاح کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے پیش نظر انفرادی اصلاح ہے یعنی حسیات اور خواہشات پر، جن کا پورا کرنا گناہ ہے، قابو حاصل کرنا۔ غالباً وہ آزادی کی اس تعریف سے اتفاق کریں گے جو ایک رومن کیتھولک مصنف نے فاشزم کے متعلق اپنی کتاب میں کی ہے۔ آزادی اس کے سوا کچھ نہیں کہ گناہ کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے۔ لندن کے لاٹ پادری نے جو

الفاظ اب سے دو سال پہلے لکھے تھے وہ اس سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ عیسائیت جو آزادی بخشتی ہے وہ آزادی ہے گناہ کی زنجیروں سے شیطان سے اور انسان کے جذبات، شہوات اور ناجائز خواہشات کی حکومت سے۔

اگر یہ نقطہ نظر ایک بار اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو پھر جنسی تعلقات کے متعلق گاندھی جی کا طرز خیال کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اگرچہ وہ آج کل کے عام آدمیوں کو عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اگر اولاد کی خواہش مفقود ہو تو پھر ہر قسم کا جماع جرم ہے اور (منع حمل کے) مصنوعی طریقے اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ نامردی اور اعصاب کی کمزوری ہوگا۔ اپنے عمل کے نتائج سے بچنے کی کوشش کرنا ناجائز اور منافی اخلاق ہے اس کے لئے یہ برا ہے کہ شہوانی خواہشات کو دل کھول کر پورا کرے اور ان کے نتائج سے بچنے کے لئے مقویات اور دوسری دواؤں کا استعمال کرے اور یہ اس سے بھی بدتر ہے کہ اپنی خواہشوں کو نہ روکے مگر اپنے فعل کے فطری نتیجے (یعنی حمل) کو روکنے کی کوشش کرے۔

میں ذاتی طور پر اس طرز خیال کو خلاف فطرت اور خوفناک سمجھتا ہوں اگر وہ ٹھیک کہتے ہیں تو میں ایک مجرم ہوں اور عنقریب نامردی اور اعصابی کمزوری میں مبتلا ہونے والا ہوں۔ رومن کیتھولک مذہب والوں نے بھی شدت ضبط سے تولید کی مخالفت کی ہے۔ لیکن وہ منطقی استدلال کی اس انتہا تک پہنچے جہاں گاندھی جی پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے مصلحت سے کام لیا ہے اور انسانی فطرت کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ لیکن گاندھی جی نے اپنے دلائل کو دھر تک پہنچا دیا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی جماع کے جواز اور ضرورت کو تسلیم ہی نہیں کرتے سوائے اس کے کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی غرض سے کیا جائے۔ بلکہ وہ تو اس سے بھی انکار کرتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان کوئی فطری جنسی کشش ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اصول ناقابل عمل ہے اور میں نے اس

فطری کشش کا لحاظ نہیں رکھا جو مرد اور عورت میں ہوتی ہے میں اسے ہرگز نہیں مانتا کہ جس شہوانی کشش کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ کسی صورت میں بھی فطری کہی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو وہ ہے جو بھائی بہن، ماں بیٹے، باپ بیٹی کے درمیان ہوتی ہے، اور یہی فطری کشش ہے جس سے دنیا قائم ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ پر زور الفاظ میں نہیں، میں اپنی پوری قوت کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ شوہر اور بیوی کے درمیان شہوانی کشش خلاف فطرت ہے۔

اس زمانے میں جب اڈ پیس گرہ اور فرائڈ اور تحلیل نفسی کا دور دورہ ہے یہ عقیدہ، جو اس زور شور سے ظاہر کیا گیا ہے، عجیب اور دور از کار معلوم ہوتا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو انسان اس عقیدے پر ایمان لائے یا اس سے انکار کردے۔ کوئی درمیانی راہ اختیار کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ یہ عقل کا نہیں بلکہ عقیدے کا سوال ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ سمجھتا ہو کہ گاندھی جی اس معاملہ میں سراسر غلطی پر ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض خاص صورتوں کے لئے ان کا مشورہ موزوں ہو لیکن اگر یہ عام اصول قرار دیا جائے تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر مایوسی، نفسی رکاوٹ، خلل اعصاب اور طرح طرح کی جسمانی اور اعصابی بیماریاں ہوں گی۔ ضبط نفس یقیناً پسندیدہ چیز ہے لیکن مجھے شبہ ہے گاندھی جی کے اصول کی پابندی سے ضبط نفس کا فروغ پانا دشوار ہے۔ یہ اصول بے حد سخت ہے اور اکثر لوگ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے اس لئے یا تو وہ اپنے پرانے طریقے پر قائم رہتے ہیں یا پھر میاں بیوی میں ان بن ہو جاتی ہے۔ بظاہر گاندھی جی کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ ضبط تولید کا منشا لازمی طور پر نفس پرستی اور بے اعتدالی ہے۔ اور اگر عورت و مرد کے درمیان جنسی کشش کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر ہر مرد اور ہر عورت کے پیچھے اور ہر عورت ہر مرد کے پیچھے دوڑتی پھرے گی۔ لیکن یہ دونوں نتیجے بے انصافی پر مبنی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی کے ذہن پر

جنسی مسئلہ وہ کتنا ہی اہم سہی، کیوں اس قدر مسلط ہو گیا ہے۔ ان کے نزدیک تو سیاہ و سفید کا سوال ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں کوئی اور رنگ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ ضبط نفس اور نفس پرستی دونوں کو انتہائی صورت میں پیش کرتے ہیں جو میرے نزدیک غیر طبعی اور خلاف فطرت ہے۔ شاید یہ ان جنسیات کی کتابوں کا ردعمل ہو جو آجکل سیلاب کی طرح اُمڈ رہی ہیں۔ میرا اپنے متعلق یہ خیال ہے کہ میں ایک طبعی انسان ہوں اور میری زندگی میں جنسی جذبات کو بھی دخل رہا ہے، لیکن نہ یہ کبھی میرے نفس پر مسلط ہوئے اور نہ ان کی وجہ سے میرے دوسرے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ یہ محض ایک ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔

اصل میں ان کی روش ایک تارک الدنیا راہب کی سی ہے جو زندگی کی نفی کرتا ہے۔ اور اس کو شر محض سمجھتا ہے۔ ایک راہب کے لئے تو یہ ایک قدرتی بات ہے، لیکن اس اصول کو دنیا دار مردوں اور عورتوں میں جو زندگی کا اثبات کرتے ہیں اور اس سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، نافذ کرنا دور از کار معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح ایک برائی سے بچنے کے لئے بہت سی دوسری برائیوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ شدید ہیں۔

بات میں بات نکل آئی اور میں اپنے موضوع سے دور ہو گیا۔ لیکن علی پور جیل میں ان مصیبت کے دنوں میں میرے دل پر ان خیالات کا ہجوم تھا اور وہ بھی ربط اور سلسلے کے ساتھ نہیں بلکہ بے حد بے ترتیبی اور پریشانی کی حالت میں جس سے مجھے سخت الجھن اور کوفت تھی۔ اور پھر تنہائی اور اداسی کا احساس تھا جس میں جیل اور کال کوٹھڑی کی دم گھوٹنے والی فضا نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو اس صدمے کا اثر زیادہ دیر تک نہ رہتا بلکہ میں بہت جلد نئے حالات سے نبٹ لیتا اور اظہار خیال اور عمل سے تسکین حاصل کرتا۔ مگر جیل میں اس قسم کی تسکین کی کوئی صورت نہ تھی اور میں نے کچھ دن بڑی مصیبت اور تکلیف میں گذارے۔ خوش قسمتی

سے میری طبیعت میں اتنی لچک ہے کہ مجھے مایوسی کے دورے سے بہت جلد افاقہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میری یہ افسردگی رفتہ رفتہ دور ہونے لگی اوراس کے بعد جیل میں کملا سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور تنہائی کا احساس جاتا رہا۔ میں نے سوچا کہ جو کچھ بھی ہو کم سے کم ہم دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو موجود ہیں۔

۱۔ یہ خط پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔

۲۔ پاپائے اعظم پائس یازدہم نے اپنے فرمان میں، جو عیسائیوں کے نکاح کے متعلق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جاری کیا تھا، فرماتے ہیں ''یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شادی شدہ لوگ قانون فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے وقوف کا استعمال فطری اور معقول وجوہ کی بناء پر کریں، چاہے اس صورت میں صورت کے حالات یا کسی نقص کی وجہ سے بچہ پیدا ہونے کا امکان نہ بھی ہو۔'' ''وقت کے حالات'' کا اشارہ صریحی طور پر اس ''بے خطر'' زمانے کی طرف ہے جب استقرار حمل کا احتمال نہ ہو۔

۳۔ تحلیل نفسی کا یہ نظریہ کہ ماں بیٹے اور باپ بیٹی کے درمیان جنسی کشش ہوتی ہے

۔

متضاد باتیں

جو لوگ گاندھی جی سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں اور صرف ان کی تحریروں کو پڑھتے ہیں وہ غالباً یہ خیال کرتے ہوں گے کہ گاندھی جی اسی قسم کے آدمی ہیں جیسے مذہبی پیشوا ہوا کرتے ہیں۔ یعنی رونی صورت، بسورتی شکل کے زاہد خشک، کالوینی فرقے کے پیرووں کی طرح خوشی اور زندہ دلی کے دشمن، ان پادریوں سے کچھ کچھ مشابہ جو سیاہ چغے پہنے ہوئے پیدل پھرا کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تحریریں ان کی غلط تصویر پیش کرتی ہیں، اور ان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ ہم صرف ان کی تحریروں کو سامنے رکھ کر ان پر تنقید کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کالوینی پادریوں کے بالکل برعکس ہیں ان کی مسکراہٹ دل کو لبھاتی ہے، ان کی ہنسی روتوں کو ہنساتی ہے، ان کی ذات فرحت و انبساط کا سرچشمہ ہے۔ ان میں بچوں کا سا بھولا پن ہے جس میں ایک عجیب دلکشی ہے۔ جب وہ کسی کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے تازہ ہوا کا جھونکا آ گیا جس نے فضا کی کثافت کو دور کر دیا۔

وہ ایک عجیب مجموعہ اضداد ہیں اور میرا خیال ہے کہ سب بڑی شخصیتیں کسی حد تک ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سالہا سال میں سے اس الجھن میں ہوں کہ آخر اس تمام محبت اور تعلق کے باوجود جو انہیں غریبوں کے ساتھ ہے، وہ کیوں ایک نظام کی حمایت کرتے ہیں جو خود ہی لوگوں کو مفلس بناتا ہے اور پھر انہیں کچلتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عدم تشدد کی اس قدر جوش و خروش سے تلقین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسے سیاسی اور معاشرتی کے حامی ہیں۔ اصل میں وہ ایک قسم کے نراجی فلسفے کے قائل ہیں۔ لیکن چونکہ نراجی ریاست کا قیام ابھی بہت دور ہے اور اس کا آسانی سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے دو چار و ناچار موجودہ نظام کو قبول کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سماجی نظام کو تشدد کے ذریعے سے بدلنے پر انہیں جو

عتراض ہے وہ محض وسائل تک محدود نہیں ہے اس لئے کہ وسائل سے قطع نظر کر کے اس نظام کو بدلنے کا ایک ایسا نصب العین مقرر کیا جا سکتا ہے جو مستقل قریب میں حاصل ہو سکے۔

کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں، لیکن وہ اس لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں جو انہیں کے ذہن میں ہیں اور ان کی اشتراکیت کو سوسائٹی کے اس معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں جو بالعموم اشتراکیت کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تقلید میں بہت سی ممتاز کانگریسیوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ اور اس سے ان کی مراد ایک قسم کی انسانی ہمدردی ہے۔ سیاسی اصطلاحوں کا یہ مبہم استعمال انہیں حضرات کے لئے مخصوص نہیں بلکہ بڑے بڑے آدمی ان کے ساتھ شریک ہیں چنانچہ ان کے سامنے برطانیہ کی نیشنل گورنمنٹ کے وزیر اعظم کی مثال موجود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ گاندھی جی اس موضوع سے ناواقف نہیں ہیں انہوں نے معاشیات، اشتراکیت، بلکہ مارکس کے فلسفے پر بھی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور اس پر دوسروں سے بحث اور تبادلہ خیال کر چکے ہیں، لیکن میرا روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ اہم معاملات میں عقل و دماغ بجائے خود ہماری کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے۔ ولیم جیمس نے لکھا ہے اگر تمہارا دل نہ چاہے تو یقیناً تمہارا دماغ تمہیں کچھ قائل نہیں کر سکتا جذبات ہمارے تصور زندگی پر حاوی ہیں اور دماغ پر حکومت کرتے ہیں، ہماری گفتگو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا معاشی اصل میں جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے جیسا کہ شوپنہار نے کہا ہے انسان جو ارادہ کر لے وہ کر سکتا ہے مگر ارادہ اس کے اختیار میں نہیں۔

جنوبی افریقہ کے ابتدائی دور میں گاندھی جی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوئی جس نے انہیں بے حد متاثر کیا اور ان کا سارا تصور زندگی بدل دیا۔ اس وقت سے ان کے خیالات ایک خاص بنیاد پر قائم ہو گئے ہیں اور ان کا دماغ نئ

باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جو لوگ نئی تجویزیں پیش کرتے ہیں ان کی باتوں کو وہ بہت صبر و سکون اور توجہ سے سنتے ہیں لیکن اس دلچسپی کے باوجود جو وہ اخلاقاً ظاہر کرتے ہیں کہنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کے دل کا دروازہ بند ہے۔ وہ اس مضبوطی سے بعض خیالات پر قائم ہیں کہ ان کے علاوہ اور تمام باتیں ان کو غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے ضمنی معاملات پر زور دینے سے اس بڑے کام میں خلل پڑتا ہے جو ان کے پیش نظر ہے، جب انسان ایک بنیادی خیال پر رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے مسائل خود بخود ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ اگر مقدمات صحیح ہیں تو نتیجہ یقیناً صحیح ہوگا۔

یہ میرے نزدیک ان کے خیالات کی اصل بنیاد ہے۔ وہ اشتراکیت خصوصاً مارکسیت کو شبہے کی نظر میں دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تحریکیں تشدد سے وابستہ ہیں طبقوں کی جنگ کے الفاظ ہی سے ان کو تشدد اور لڑائی کی بو آتی ہے۔ اور اس لئے انہیں اس سے نفرت ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ عام لوگوں کا معیار زندگی ایک مقررہ حد سے بڑھنے پائے۔ اس لئے کہ بلند معیار زندگی اور فرصت سے اندیشہ ہے کہ لوگ عیش پرستی اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہی کیا کم برا ہے کہ تھوڑے سے خوش حال لوگ عیش پرست ان گئے ہیں، یہ اور بھی برا ہوگا کہ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ایک خط لکھا تھا۔ جس سے اس قسم کے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک خط کا جواب تھا جو کوئلے کی بڑی ہڑتال کے زمانے میں ان کے پاس انگلستان سے آیا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ اس معاملہ میں مزدوروں کو شکست ہوگی کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور انہیں چاہئے کہ ضبط تولید کا طریقہ استعمال کر کے اپنی تعداد کو کم کریں۔ گاندھی جی نے اپنے جواب کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر کانوں کے مالک حق پر نہ ہونے کے باوجود جیت جائیں تو اس کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ مزدوروں کے حد سے زیادہ

اولاد ہوتی ہے بلکہ یہ کہ مزدور کسی چیز میں ضبط نفس سے کام نہیں لیتے، اگر مزدوروں کے اولاد نہ ہوتی تو ان کے لئے ترقی کا کوئی محرک نہ رہتا اور وہ مزدوری بڑھانے کے لئے کوئی ایسی دلیل پیش نہ کر سکتے جس کا ثبوت آسان ہو، کیا ان کے لئے شراب نوشی، جوا کھیلنا، تمبا کو پینا ضروری ہے! یہ کوئی جواب نہیں کہ کانوں کے مالک بھی یہی سب حرکتیں کرتے ہیں۔ اور پھر بھی غالب رہتے ہیں، اگر مزدور سرمایہ داروں سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے تو انہیں دنیا کی ہمدردی چاہئے کا کیا حق ہے؟ یہی کہ سرمایہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہو اور سرمایہ داری کو اور قوت حاصل ہو جائے؟ ہم سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی حمایت کرو اس لئے کہ جب اس کا دور دورہ ہوگا تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی یہ نہ ہو کہ ہم انہیں برائیوں کو جو سرمایہ دار اور سرمایہ داری کی طرف منسوب کی جاتی ہیں بہت بڑے پیانے پر پیدا کر دیں۔

جب میں اس کو پڑھ رہا تھا تو فاقہ کش مزدور کان کنوں ان کی بیویوں اور بچوں کے اترے ہوئے چہرے میری آنکھوں میں پھر گئے جن کو میں نے ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں بے بسی کی حالت میں ایک ایسے خوفناک نظام کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا جو انہیں کچلے ڈالتا تھا۔ گاندھی جی کے بیان کردہ واقعات بھی صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ کان کن مزدوری میں اضافے کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے بلکہ اس لئے لڑ رہے تھے کہ ان کی مزدوری کم کر دی گئی تھی، اور وہ کام سے ہٹا دیے گئے تھے بہر حال اس وقت ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں اور نہ اس سے غرض ہے کہ کان کن مزدور ضبط تولید کے طریقے استعمال کریں یا نہ کریں اگر چہ اس میں شک نہیں کہ صنعتی جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے یہ ایک غیر معمولی تجویز ہے۔

میں نے گاندھی جی کے جواب سے یہ ٹکڑا اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مزدوروں کے مسائل اور ان کے معیار زندگی کو بڑھانے کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ نقطہ نظر اشتراکیت بلکہ سرمایہ داری کے نقطہ نظر سے بھی

کوسوں دور ہے۔ یہ اگر کہا جائے کہ سائنس اور صنعتی تنظیم آج ہر شخص کے کھانے پہننے، رہنے سہنے کا معقول بندوبست کرسکتی ہے اور ان کے معیار زندگی کو بہت بلند کرسکتی ہے بشرطیکہ مستقل حقوق رکھنے والے اس میں مداخلت نہ کریں تو اس سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ وہ لوگوں کے معیار زندگی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کے قائل ہی نہیں۔ چنانچہ اشتراکیت سے جو امیدیں ہیں وہ ان کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں بلکہ ان کے نزدیک سرمایہ داری پھر بھی ایک حد تک قابل برداشت ہے اس لئے کہ وہ عیش پرستی کے گناہ کو ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود رکھتی ہے۔ انہیں ان دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں۔ لیکن فی الحال وہ سرمایہ داری سے نباہ رہے ہیں اس لئے کہ یہ اتنی بری نہیں اور پھر یہ ایک امر واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ممکن ہے کہ میں یہ خیالات ان کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کرتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ذہن کا عام رجحان یہی ہے اور ان کی تحریر وتقریر میں ہمیں جو الجھن اور پیچیدگی نظر آتی اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ ان خیال کی بنیاد ہی دوسری ہے وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ روز افزوں آرام و آسائش اور فرصت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، بلکہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی زندگی کو سدھارنے کی فکر کریں، بری عادتوں کو ترک کریں، خواہشات کو کم کرتے رہیں اور اس طریقے سے اپنی انفرادی اور روحانی اصلاح کریں، اور جو لوگ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کا کام یہ نہیں ہے کہ ان کی مادی زندگی کی سطح کو بلند کریں بلکہ خود ان کی سطح پر اتر آئیں اور مساوی حیثیت سے ان کے ساتھ میل جول پیدا کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو لازمی طور پر عام لوگوں کی سطح زندگی کسی قدر بلند ہوجائے گی یہی گاندھی جی کے نزدیک حقیقی جمہوریت ہے۔ اس بیان میں جو انہوں نے ۷ ستمبر ۳۴ء کو شائع کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری مخالفت کرنا بیکار ہے اس لئے

کہ میرے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میرے جیسے پیدائشی جمہوریت پسند کے لئے یہ انکشاف باعث شرم ہے۔ اگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو غریب سے غریب لوگوں میں کھپا دیا ہے، جس کی یہ آرزو ہے کہ انہیں کی سی زندگی بسر کرے اور اسی کے ساتھ پوری کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس سطح پر پہنچ جائے، جمہوریت پسندی کا دعوی کر سکتا ہے تو میں یہ دعوی کر سکتا ہوں۔

اس استدلال سے غالبا موجودہ زمانے کا کوئی جمہوریت پسند یا سرمایہ دار، یا اشتراکی اتفاق نہیں کرے گا بجز اس کے کہ یہ بات معیوب اور نامناسب ہے کہ ہم عام لوگوں سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کر لیں اور اپنے تعیّشات اور بلند تر معیار زندگی کی نمائش ان بے شمار آدمیوں کے سامنے کریں۔ جو ادنی سے ادنی ضرورت کی چیزوں کے بھی محتاج ہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو قدیم مذہبی نقطہ نظر رکھتا ہے شاید کسی حد تک اس سے متفق ہو اس لئے کہ یہ دونوں اپنے جذبات کے اعتبار سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ہر چیز کو ماضی کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہیں اس کی زیادہ فکر ہے کہ کیا ہو چکا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ان لوگوں میں جو نفسیاتی حیثیت سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ان میں جو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم زمانے میں عام لوگوں کی معاشی سطح کو بلند کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غریبوں کا وجود لازمی تھا۔ مٹھی بھر دولتمند آدمی اس زمانے میں سماج کے روح رواں تھے اور ان کا ہونا نظام دولت آفرینی کے لئے ضروری تھا اس لئے اخلاقی مصلحوں، اور اہل دل نے ان کے وجود کو جائز رکھا لیکن اسی کے ساتھ انہیں یہ تلقین کرتے رہے کہ ان کے حاجتمند بھائیوں کا بھی ان پر کچھ حق ہے۔ وہ غریبوں کے امانت دار ہیں۔ انہیں خیرات کرنا چاہئے۔ چنانچہ خیرات کا شمار ان بڑی نیکیوں میں ہونے لگا جن کی مذہب نے تاکید کی ہے۔ گاندھی جی بھی ہمیشہ اس نظریہ پر زور دیتے ہیں کہ راجہ مہاراجہ، بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار

غریبوں کے امانت دار ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے مذہبی آدمی بھی کہتے آئے ہیں۔ پاپائے اعظم نے یہ اعلان کیا ہے امیروں کا یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ خدا کی طرف سے خدمت خلق پر مامور ہیں اور اس کی دولت کے خازن اور قاسم ہیں اور خود حضرت مسیح نے غریبوں کی قسمت ان کے سپرد کی ہے۔ ہندو دھرم اور اسلام کا عام عقیدہ بھی یہی ہے۔ یہ دونوں امیروں کو خیرات کی تاکید کرتے ہیں، جس کی تعمیل میں یہ حضرات مندر، مسجد، دھرم شالے بنواتے ہیں۔ اپنی وافر دولت میں سے تانبے کے پیسے اور چاندی کے روپے غریبوں کو خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک اور دین دار ہیں۔

دنیائے قدیم کے مذہبی نقطہ نظر کی ایک نمایاں مثال پاپائے اعظم لیویز وہم کا مشہور فرمان ریرم نوارم ہے جو مئی ۱۸۱۹ء میں جاری کیا گیا تھا۔ وہ جدید صنعتی حالات کا استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں غرض مصیبت سہنا اور تکلیف اٹھانا نوع انسانی کی قسمت میں لکھا ہے۔ انسان چاہے جتنی کوشش کرے کوئی طاقت اور کوئی تدبیر انسانی زندگی کو اس دردوالم سے نجات دلانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف دعوی کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کو یہ امید دلاتے ہیں کہ انہیں رنج والم سے نجات مل جائے گی اور دائمی راحت وعشرت نصیب ہوگی، دھوکا دے رہے ہیں اور سبز باغ دکھا رہے ہیں اور ان کے یہ جھوٹے وعدے اور زیادہ ابتری پیدا کر رہے ہیں اور سبز باغ دکھا رہے ہیں اور ان کے یہ جھوٹے وعدے اور زیادہ ابتری پیدا کردیں گے۔ انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ دنیا کو اس کی اصلی حالت میں دیکھے اور ان مصیبتوں کا علاج کہیں اور تلاش کرے۔

آگے چل کر بتایا جاتا ہے کہ یہ کہیں اور کا اشارہ کدھر ہے۔ اس دنیا کو نہ تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کی صحیح قدر کر سکتے ہیں، جب تک اس زندگی کا لحاظ

نہ رکھیں جو آنے والی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی جس حقیقت عظمیٰ کا سبق خود فطرت ہمیں دیتی ہے وہی عیسائی مذہب کا عظیم الشان عقیدہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد قائم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری اصلی زندگی اس وقت شروع ہوگی جب موجودہ زندگی ختم ہوجائے گی۔ خدا نے ہمیں اس دنیا کی آنی جانی چیزوں کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ ان آسمانی چیزوں کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی ہیں، اس نے اس دنیا کو ہمارے لئے عارضی جلاوطنی کی جگہ بنایا ہے نہ کہ ہمارا حقیقی وطن، روپیہ پیسہ اور دوسری چیزیں جنہیں لوگ اچھا اور پسندیدہ سمجھتے ہیں، خواہ ہمارے پاس افراط سے ہوں یا بالکل نہ ہوں، جہاں تک ہماری ابدی راحت ومسرت کا تعلق ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

یہ مذہبی طرز خیال اس قدیم زمانے سے وابستہ ہے جب موجودہ مصیبتوں سے نجات پانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آنے والی زندگی کا سہارا ڈھونڈا جائے لیکن باوجود اس کے کہ حالات بدل گئے اور انسانی کی مادی خوش حالی کی سطح اتنی بلند ہوگئی جو زمانہ قدیم میں انسان کے خواب وخیال میں بھی نہ آسکتی تھی، لیکن ماضی کے خیالات اب بھی ہم پر مسلط ہیں، البتہ اب زیادہ زور چند مبہم روحانی قدروں پر دیا جاتا ہے جن کے جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ کیتھولک عیسائی ہمیشہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے خیال میں مگن رہتے ہیں (یہ زمانہ ہے جسے دوسرے لوگ عہد مظلمہ کہتے ہیں) اور اسے عیسائیت کا عہد زریں سمجھتے ہیں، جب اولیاء کا دور دورہ تھا۔ عیسائی فرماں روا صلیبی لڑائیاں لڑنے کو جایا کرتے تھے، اور گوتھک طرز کے بڑے بڑے گرجے تعمیر ہورہے تھے، ان کے خیال میں یہ زمانہ سچی عیسائی جمہوریت کا تھا جو پیشہ وروں کی انجمنوں کے ماتحت ترقی کے اس درجہ پر پہنچ گئی تھی جس پر نہ اس سے پہلے کوئی پہنچ سکی اور نہ اس کے بعد۔ مسلمان بڑی حسرت سے ابتدائی عہد خلافت کی اسلامی جمہوریت اور اس دور کی حیرت انگیز فتوحات کو یاد کیا

کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ویدوں کے عہد اور رامائن اور مہا بھارت کے زمانے کی دھن میں رہتے ہیں اور رام راج کا خواب دیکھتے ہیں۔ مگر تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ اسی عہد ماضی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد انتہائی مصیبت کی حالت میں زندگی بسر کرتی تھی اور اسے پیٹ بھر کھانا اور زندگی ادنیٰ ترین ضرورت بھی میسر نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ چھوٹے سے حکمران طبقہ کو فرصت اور فراغت حاصل ہو لیکن جہاں تک زندگی کا لطف اٹھانے سے اور لوگوں کا تعلق ہے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ وہ سوائے قوت لایموت کی جدوجہد میں لگے رہنے کے اور بھی کچھ کر سکتے تھے۔ اس شخص کے لئے جو بھوکوں مر رہا ہو کسی قسم کی تمدنی اور روحانی ترقی ممکن نہیں، اسے تو بس ایک ہی فکر ہوگی کہ کسی طرح کھانے کو روٹی مل جائے۔

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے، جن پر فوراً ہماری نظر پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں خصوصاً ان حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ہے، اس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیاد ی قائم کر دی ہے۔ جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس لئے کہ ہمیں صنعتی ترقی سے فائدے کی جگہ نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے۔ اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی اور اس سے زیادہ تمدنی اور روحانی اعتبار سے ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی ہے لیکن قصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے۔ یہ واقعہ ہندوستان میں نام نہاد مغربیت نے اس وقت تو نظام جاگیرداری کو اور مستحکم کر دیا ہے اور ہماری دشواریوں کو حل کرنے کے بجائے انہیں اور زیادہ شدید بنا دیا۔ لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہمیں آج کل کی دنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہئے۔

موجودہ حالات میں امیروں کا وجود سماج کے نظام دولت آفرینی کے لئے ضروری

اور مناسب نہیں رہا۔ امراء کا طبقہ بالکل بے کار ہے اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں کا یہ پرانا مشغلہ بھی اب بالکل بے معنی ہو گیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تلقین کی جائے۔ اور غریبوں کو قناعت کی، صبر و شکر کی، کفایت شعاری اور نیک چلنی کی۔ انسان کے وسائل اور ذرائع اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ وہ دنیا کے مسائل اچھی طرح نبٹ سکتا ہے۔ امیروں میں سے بہت سے لوگ صریحی طور پر طفیلی بن گئے ہیں۔ اور ایک طفیلی طبقے کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے مسائل دولت ضائع ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ اور وہ نظام جو اسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، کام کو اور دولت آفرینی کو روکتا ہے اور دو طرح سے بیکاری کو بڑھاتا ہے۔ یعنی ایک تو ان لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں دوسرے بہت سے مزدوروں کو کام سے محروم رکھتا ہے اور فاقہ کرنے پر مجبور کرتا ہے خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ گذرا لکھا تھا ان لوگوں کے سامنے جو بھوکوں مرتے ہیں اور بے کار ہیں، خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ یعنی کام کی اور روٹی کی شکل میں۔ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ محنت کر کے روٹی کمائے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ بغیر محنت کے کھاتے ہیں وہ چور ہیں۔

دنیائے جدید کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اس وقت کے قدیم طریقوں اور اصولوں سے کام لینا جب ان مسائل ہی کا وجود نہ تھا اور ان کا ذکر دقیانوسی الفاظ میں کرنا محض الجھن پیدا کرتا ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا خود ذاتی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے۔ ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا اس کے علاوہ جاگیردار ہر دلہن کی شب عروسی کا، سڑکوں، مندروں کشتیوں، پلوں، مفاد عامہ کی چیزوں کا زمین اور ہوا کا مالک تھا، جانور آج

بھی پالنے والوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ بعض ملکوں میں ملکیت کے حقوق قانوناً محدود کردیئے گئے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں برابر حقوق ملکیت میں دست اندازی کی جاتی ہے۔ املاک روز بروز غیر مرئی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ مثلاً کمپنی کے حصے، اعتبار وغیرہ۔ جیسے جیسے ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ حکومت کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے۔ رائے عامہ برابر جائداد والوں کے لامحدود حقوق کو محدود کرنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے اور قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے بڑے بڑے محصول لگائے جاتے ہیں، جنہیں ایک طرح کی ضبطی سمجھنا چاہئے۔ اور اس طرح مفاد عامہ کی خاطر حقوق ملکیت کم ہوتے جاتے ہیں۔ مفاد عامہ کا خیال پبلک پالیسی کی بنیاد بنتا جاتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ مفاد عامہ کے خلاف کوئی کام کرے، خواہ اس کی غرض اپنے حقوق ملکیت کا تحفظ ہو اور پرانے زمانے میں تو اکثر لوگ حقوق ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسروں کی ملکیت تھے۔ آج بھی یہ حقوق صرف تھوڑے لوگوں کو حاصل ہیں۔ ہم مستقل حقوق کا ذکر بہت سنتے آئے ہیں، لیکن آج کل ایک نیا مستقل حق اور تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق ہے کہ زندہ رہے، محنت کرے، اور اپنی محنت کا پھل پائے۔ ان نئے نظریوں کی رو سے املاک اور سرمایہ معدوم نہیں ہوجاتے بلکہ بہت سے لوگوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں اور ان کے چند اشخاص کے ہاتھ میں جمع ہوجانے سے ان اشخاص کو دوسروں پر جو اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ اسے سماج ان سے واپس لے لیتی ہے۔

گاندھی جی کے پیش نظر افراد کی باطنی، اخلاقی، اور روحانی اصلاح ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بری عادتوں کو اور لذتوں کو ترک کریں اور پاکباز بن جائیں۔ وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ مجامعت اور شراب اور تمباکو کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ ممکن ہے اس

بارے میں اختلاف رائے ہو کہ ان میں کون سی چیز زیادہ بری ہے اور کون سی کم، کیا اس میں کوئی شبہ ہوسکتا ہے کہ انفرادی نقطۂ نظر سے بھی، اور اس سے زیادہ سماجی نقطہ نظر سے ان ذاتی کمزوریوں سے بدرجہا بدتر لالچ، خودغرضی، زرپرستی، افراد کا ذاتی نفع کے لئے جھگڑنا، طبقوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کش مکش، ایک طبقے کا دوسرے کو بے دردی سے لوٹنا اور کچلنا، قوموں کی ہولناک لڑائیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام ذلت آفریں جھگڑوں سے اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت کرتے ہیں لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی زبردست سماج کی فطرت میں داخل نہیں ہیں جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو ستائے اور جس کا عمل اس پرانے مقولے پر ہیں جس میں طاقت ہو وہ چھین لے اور جو رکھ سکے وہ رکھے۔ نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر لڑائی جھگڑا پیدا کرتی ہے، اور سارا نظام انسان کی غارت گرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے اور اسے ان سے کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ جذبات کو بھی ابھارتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ انسان کے کمینے جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے۔ کامیابی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ دوسروں کو نیچے گرا کر ان کی جگہ لے لی جائے۔ جب ہماری سماج ایسے ارادوں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ ہمارے بہترین آدمی ان کی طرف کھنچ جاتے ہیں تو کیا گاندھی جی یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ اس ماحول میں انسان کی اخلاقی تکمیل کا مقصد حاصل کرلیں گے! وہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چند افراد کو متاثر کرنے میں انہیں کامیابی ضرور ہوگی، لیکن جب تک سماج ان لوگوں کو جو دوسروں کو لوٹ کر ترقی کرتے ہیں، کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرے گی اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گے اس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ محض اخلاق اور فلسفہ اخلاق کا نہیں ہے بلکہ آج کل کے عملی اور

ضروری مسائل میں سے ہے، دنیا سخت مشکل میں گرفتار ہے اور اس مشکل کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈکنس کا مکاپر کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا اور نہ منفی طرز اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہے کہ سرمایہ داری، اشتراکیت، اور اشتمالیت وغیرہ کے خراب پہلوؤں کی نکتہ چینی کرتے رہیں اور اس دھندلی سی امید کا سہارا لیں کہ کوئی بہترین درمیانی طریقہ خود بخود نکل آئے گا جس میں ماضی اور حال کے سب طریقوں کی خوبیاں جمع ہوں، ضرورت اس کی ہے کہ مرض کی تشخیص کی جائے، علاج تجویز کیا جائے اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ بالکل یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالات پر قائم نہیں رہ سکتے یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو پیچھے ہٹنے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

مگر گاندھی جی کی اکثر کاروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس محدود قومی معیشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف قوم اور قوموں سے بلکہ ہر گاؤں اور گاؤنوں سے معاشی حیثیت سے بے نیاز ہو۔ بس قدیم زمانے کی سماج میں ہر گاؤں ایک مستقل معاشی حیثیت رکھتا تھا، اپنا کھانا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیار زندگی بہت ہی پست ہو جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے ہیں کیونکہ مستقل طور پر تو یہ چل ہی نہیں سکتی۔ بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گے کہ حسرت اور فاقے کی زندگی کی طرف لوٹیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیار زندگی بے حد پست ہے۔ دیہی صنعتوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے لیکن اوروں کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں ان سے قطع تعلق کرنا ناممکن

ہے اس لئے ہمیں ان مسائل پر ساری دنیا کے نقطہ نظر سے غور کرنا چاہئے اور اس نقطہ نظر سے محدود قومی حیثیت کا کوئی سوال ہی نہیں اور میں ذاتی طور پر ایسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں، یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقے سے ہونا چاہئے۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تبدیلی کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی سماجی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کا مٹادینا چاہئے۔ ان چیزوں کی خاطر ایسے مفید اور پسندیدہ مقصد کو قربان کرنا بہت بڑی غداری ہوگی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں یا اس کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیں۔ لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت راضی نہ ہوجائے یہ انقلاب مشکل ہی سے ہوسکے گا۔ اس لئے ان لوگوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیں جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یہ بہت بعید از قیاس ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ لوگوں کو قائل کرسکیں گے۔

کھادی کی تحریک یعنی ہاتھ سے کاتنا اور بننا جس سے گاندھی جی کو خاص شوق ہے ایک ایسی چیز ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت پہنچاتی ہے اور ہمیں قبل صنعتی عہد کے طرف واپس لے جاتی ہے۔ آج کل کے کسی اہم مسئلے کو ان

طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ ان سے ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو ترقی کی صحیح راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وقتی اور عارضی تدبیر کی حیثیت سے اس تحریک سے بہت فائدہ پہنچا ہے آئندہ بھی اس وقت تک پہنچتا رہے گا جب تک خود حکومت زرعی اور صنعتی مسائل کا کوئی معقول حل نہ تلاش کر لے گی جو وسیع پیمانے پر سارے ملک میں جاری کیا جا سکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں کروڑوں بے روزگار ہیں جن کا کوئی ریکارڈ نہیں اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں میں سال کے ایک حصہ میں بیکار رہتے ہیں۔ حکومت نے بے روزگاری کو دور کرنے یا بے روزگاروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش اب تک شروع نہیں کی ہے اس لئے معاشی حیثیت سے کھادی کی تحریک نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کی جو بالکل بے روزگار ہیں یا جو کچھ عرصے بیکار رہا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ ترقی خود اپنی کوشش سے ہوئی ہے اس لئے ان لوگوں کی خودداری بڑھ گئی اور ان میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے مگر اصل میں جو نمایاں تبدیلی ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے وہ نفسیاتی تبدیلی ہے۔ کھادی نے کسی حد تک اس فاصلے کو دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسانوں سے قریب تر کر دیا۔ اس لباس کا پہننے والوں اور دیکھنے والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ اوسط طبقے میں کھادی کے رواج سے سادگی آ گئی ہے۔ نمود و نمائش اور بدمذاقی کم ہو گئی ہے اور عام لوگوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس کے معاملہ میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں۔ اور نہ سستی پوشاک پہننے میں ذلت و شرم محسوس کرتے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو یہ لوگ کھادی کے لباس کو خاصا باوقار سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو اب بھی ریشم اور ساٹھن پہن کر اتراتے ہیں، اپنی قومیت کا احساس رکھتے ہیں۔ غریب سے غریب لوگوں میں بھی یہ خودداری اور وقار

کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔کھادی پہننے والوں کے بڑے مجمعوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کون غریب ہے اور کون امیر اور اس سے برادری کے جذبے کو ترقی ہوئی۔اس میں بھی شبہ نہیں کہ عام لوگوں تک پہنچنے میں کانگریس کو کھادی سے بڑی مدد ملی۔اس کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے۔

ملوں کے مالکوں کے اس رجحان کو بھی کہ اپنے مال کی قیمت بڑھاتے چلے جائیں کھادی ہی نے روکا ورنہ پہلے ان کی روک تھام صرف بدیسی اور خصوصاً لنکا شائر کے مقابلے کی وجہ سے ہوا کرتی تھی اور جب کبھی یہ مقابلہ بند ہوا مثلاً جنگ عظیم کے زمانے میں، تو کپڑے کی قیمتیں ہندوستان بھر میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں، اور ہندوستانی ملوں نے کروڑوں روپیہ کمایا۔سودیشی کی تحریک اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر ان ملوں کو بڑی مدد ملی، لیکن کھادی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اب اتنی زیادہ بڑھ سکتیں۔ان ملوں نے (اور جاپان نے بھی) کھادی کی ہر دل عزیزی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس قسم کو موٹا کپڑا تیار کیا کہ اس میں اور ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔اگر اب کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے مثلاً جنگ چھڑ جائے جس سے بدیسی کپڑے کی درآمد بند ہو جائے۔تو غالباً ہندوستان کے ملوں کے مالک خریداروں کو اتنا نہیں لوٹ سکیں گے جتنا کہ ۱۹۱۴ء سے کئی سال تک لوٹتے رہے۔کھادی کی تحریک اس کو روکے گی اور کھادی کی تنظیم میں اتنی گنجائش ہے کہ تھوڑی سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے۔

ان تمام فوائد کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ محض عارضی چیز ہے۔ممکن ہے کہ بعد میں بھی ایک ضمنی تحریک کی حیثیت سے باقی رہے تاکہ اس مدت میں جو ایک اعلیٰ معاشی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی اس سے کام چلتا رہے لیکن آئندہ ہماری اصل کوشش یہ

ہوگی کہ زراعتی نظام کی از سرِ نو تنظیم کی جائے اور صنعت کو ترقی دی جائے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ اراضی کے نظام میں دفع الوقتی کے لئے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں اور طرح طرح کے کمیشن مقرر رہوں جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہو اور وہ کچھ اوپری چیزوں کی اصلاح کر دیں۔ ہمارا نظام اراضی دیکھتے ہی دیکھتے بیٹھ رہا ہے اور موجودہ صورت حال میں دولت کی پیدائش اور تقسیم اور بڑے پیانے پر معقول طریقے سے کام کرنے میں حائل ہے۔ جدید عہد کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا کہ چھوٹی چھوٹی زمینیں اسامیوں کو بانٹنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ منظم طور پر امداد باہمی کے اصول کے مطابق اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ کم محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت ہماری ساری آبادی کبھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیانے پر کاشت کرنے سے (جیسا کہ گاندھی جی کا اندیشہ ہے) زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ باقی لوگوں میں سے بعض شاید چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کھپ جائیں مگر ان کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیانے کی اشتراکی صنعتوں اور سماجی خدمت کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہے لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوئی ہے خطرے کا بھی عنصر موجود ہے یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظام آراضی کو سہارا دے رہی ہے اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہو لیکن یہ رجحان اس میں بہر حال موجود ہے۔ کسانوں یا کاشتکاروں زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا جو حصہ ملتا ہے وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں کہ جس پست ترین سطح پر وہ پہنچ گئے ہیں اسی پر قائم رہ سکیں۔ اس لئے ان کو اپنی قلیل آمدنی میں اضافے کی اور صورتیں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ ورنہ لگان یا مالگزاری کے لئے اور قرض لینا پڑتا ہے۔ اگر انفرادی طور پر بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو اس

سے زمیندار یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے جو شاید معمولی حالت میں نہ وصول ہوسکتا ہے۔ اگر یہ اوپر کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان اتنا ہی اور بڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ نظام کے ماتحت کاشتکاروں کی زائد محنت اور کفایت شعاری کی کوشش سے اصل فائدہ زمین کے مالک ہی کو پہنچتا ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہنری جارج نے اپنی کتاب ترقی اور غربت میں اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے اور بہت سی مثالیں دی ہیں جو زیادہ تر آئرستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام ہی کی توسیع ہے اس سے فوری طور پر ضرور فائدہ ہوگا، جس میں سے کچھ کم و بیش مستقل ہوگا مگر زیادہ تر محض وقتی۔ اس سے دیہاتیوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی۔ اور ہماری تہذیب کے بعض خوشنما نمونے جو مٹ رہے تھے۔ محفوظ ہو جائیں گے، لیکن جہاں تک کہ اس کا مقصد مشینوں کی صنعتی نظام کی مخالفت ہے اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ گاندھی جی نے حال میں ہریجن میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں مشینوں کو رواج دینا اس وقت مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو اور کرنے والے تھوڑے ہوں لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہے تو یہ چیز مضر ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں کہ لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں فرصت کا وقت نکالا جائے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے خالی وقت کو جو سال میں چھ مہینے سے کم نہیں کس طرح کام میں لگایا جائے۔ یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ ان تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو بے روزگاری میں مبتلا ہیں۔ لیکن اصل میں وقت کام کی کمی کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے ماتحت آجروں کو کام میں خاطر خواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں

کرو۔ مثلاً سڑکوں اور مکانوں کی تعمیر، آب پاشی کی اسکیم، حفظان صحت، طبی وسائل، صنعت وحرفت اور برقی قوت کی ترقی، سماج اور تمدنی خدمات، تعلیم اور ان بیسیوں ضروری اشیاء کی فراہمی جس کی لوگوں کو ضرورت ہے، ہمارے یہ کروڑوں آدمی آئندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں تب بھی کام ختم نہ ہوگا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک نفع کی خواہش نہیں بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو اور سماج کی تنظیم مفاد عامہ کو پیش نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کی سوویت یونین میں اور چاہے جو نقائص ہوں لیکن وہاں بے روزگاری بالکل نہیں ہے۔ ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بیکار نہیں ہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے لئے کام کرنے کی اور تمدنی اصلاح وترقی کی کوئی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کردیا جائے۔ ایک معقول عمر تک لازمی تعلیم کا بندوبست ہوجائے تو لڑکے، مزدوروں اور بے روزگاری کے زمرے سے خارج ہوجائیں گے۔ اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے بوجھ سے ہلکی ہوجائے گی۔

گاندھی نی نے اس بات کی کوشش کسی قدر کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ چرخے اور تکلے میں اصلاو ترمیم کی جائے اور ان کی قوت پیداوار بڑھائی جائے۔ یہ بھی تو اوزار اور مشین کو ترقی دینے کی کوشش ہے اور اگر یہ ترقی اسی طرح جاری رہی (بہت ممکن ہے گھریلو صنعتوں میں بجلی کی قوت سے کام لیا جانے لگے) تو منافع کی خواہش پھر نمودار ہوجائے۔ اور اس کی وجہ سے وہی چیز پیدا ہوگی جس کو ضرورت سے زیادہ پیداوار اور بے روزگاری کہتے ہیں۔ اگر دیہی صنعتوں میں جدید صنعتی طریقوں سے کام نہ لیا گیا تو وہ ان ضروری مادی اور تمدنی اشیاء کو بھی تیار نہیں کرسکتیں جو ہمیں اس وقت درکار ہیں۔ اور پھر وہ مشینوں کے ساتھ مقابلہ کیونکر کریں گی؟ کیا ہندوستان میں بڑی بڑی مشینوں کے رواج کو روکنا مفید ہے اور فرض کیجئے کہ مفید ہو تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟ گاندھی جی نے بار بار یہ کہا ہے کہ وہ سرے سے مشینوں کے مخالف

نہیں ہیں بلکہ ان کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لئے ان کا استعمال موزوں نہیں۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا بنیادی صنعتیں مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت یا اس سے کم درجے کی صنعتیں جو پہلے سے موجود ہیں مٹائی جا سکتی ہیں؟

یہ بات صریحی طور پر ناممکن ہے۔ جب ہمارے یہاں ریلیں، پل، نقل وحمل کے وسائل وغیرہ موجود ہیں تو یا تو ہم یہ چیزیں خود پیدا کریں یا دوسروں کے محتاج رہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی حفاظت اور مدافعت کے وسائل ہمارے پاس ہوں تو ہمیں نہ صرف بنیادی صنعتوں کی بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ صنعتی نظام کی ضرورت ہے۔ آج کوئی ملک جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ نہیں ہے نہ حقیقی معنوں میں آزاد ہے اور نہ بیرونی حملے کی مدافعت کر سکتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ ایک بنیادی صنعت کی مدد اور تکمیل کے لیے دوسری بنیادیں صنعتیں درکار ہیں اور پھر مشینری بنانے کی صنعت ضروری ہو جاتی ہے۔ جب یہ بنیادیں صنعتیں قائم ہو جائیں تو پھر لازمی طور پر دوسری صنعتیں بھی پھیل جاتی ہیں۔ غرض یہ سلسلہ کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ نہ صرف ہماری مادی اور تمدنی ترقی بلکہ ہماری آزادی کا بھی اسی پر انحصار ہے۔ جوں جوں بڑے پیمانے کی صنعت پھیلتی جائے گی چھوٹی چھوٹی دیہاتی صنعتوں کو اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہوتا جائے گا۔ اشتراکی نظام میں تو ان کے لیے پھر بھی موقع ہے، مگر نظام سرمایہ داری میں ان کی مطلق گنجائش نہیں۔ اشتراکی ریاست میں بھی وہ گھریلو صنعتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہیں جن میں وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں جو بڑے پیمانے پر تیار نہ کی جا سکیں۔

کانگریس کے بعض لیڈر صنعت کی ترقی سے خوفزدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صنعتی ممالک کی تمام موجودہ مشکلات اور پریشانیاں بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی (۳) ہے، اگر عام لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو، تو اس میں کیا برائی ہے کہ وہ کافی مقدار میں تیار

کی جائے؟ کیا لوگ اس کو ترجیح دیں گے کہ خواہ ان کی ضرورت پوری نہ ہو لیکن بڑے پیمانے پر چیزیں نہ تیار کی جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کے طریقے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ تقسیم دولت کا موجودہ نظام بہت ناقص اور مہمل ہے۔

ایک اور مشکل جس کا دیہی صنعت کے حامیوں کو سامنا کرنا ہے یہ ہے کہ ہماری زراعت دنیا کی منڈی کی پابند ہے۔ کسان اس پر مجبور ہے کہ انہی چیزوں کی کاشت کرے جن کی بازار میں مانگ ہے اور وہی قیمتیں رکھے جو اور ملکوں میں ہیں۔ قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور اس کو اپنا مقررہ لگان یا مالگزاری نقد کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح اس کو یہ روپیہ فراہم کرنا پڑتا ہے یا کم سے کم وہ اس کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ اس لیے وہ ایسی چیز بوتا ہے جو اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوگی۔ وہ ان چیزوں کی کاشت نہیں کرسکتا جن کی اس کو خود ضرورت ہے تاکہ وہ اور اس کے بال بچے کم سے کم کھانے کے معاملے میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

حال میں اجناس خوردنی اور دوسری چیزوں کی زرعی قیمتیں یکبارگی گر جانے کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں مجبوراً گنے کی کاشت کرنی پڑی۔ باہر کی شکر پر محصول لگ جانے کی وجہ سے شکر کے کارخانے برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہو گئے اور گنے کی مانگ بہت بڑھ گئی، لیکن بہت جلد رسد طلب سے کہیں زیادہ ہوگئی، کارخانوں کے مالکوں نے بڑی بے رحمی سے کسانوں کو لوٹنا شروع کردیا، اور گنے کی قیمت گر گئی۔

ان تمام امور اور ان کے علاوہ بہت سی باتوں کی وجہ سے نہ یہ مناسب ہے کہ اور نہ ممکن ہے کہ ہمارے زرعی اور صنعتی مسائل محدود ملکی مصلحتوں کے مطابق حل کئے جاسکیں اور یہ یہی صورت ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو کی ہے۔ ہم مبہم اور جذبات انگیز فقروں میں پناہ نہیں لے سکتے بلکہ ہمیں زندگی کے واقعات کا سامنا کرنا ہے اور

ان سے مطابقت پیدا کرنا ہے تاکہ ہم تاریخ کی بساط کے شاطر بنیں اس کے مہرے بن کر نہ رہ جائیں۔ پھر مجھے اس مجموعہ اضداد یعنی گاندی جی کا خیال آجاتا ہے (۴)۔ باوجود اپنی تیز فہمی اور مظلوموں کے جوش حمایت کے وہ کیوں اس زوال پذیر نظام کی حمایت کرتے ہیں جو موجودہ مصیبت اور اسراف کا ذمہ دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن کیا ماضی کی راہ قطعاً مسدود نہیں ہو چکی ہے؟ ایک طرف تو وہ راہ کی تلاش میں مصروف ہیں اور دوسری طرف پرانے نظام کے بچے کھچے آثار جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں، مثلاً دیسی ریاستیں، بڑی بڑی زمینداریاں اور تعلقہ داریاں اور موجودہ سرمایہ داری نظام، ان سب پر اپنا دست شفقت رکھے ہوئے ہیں۔ کیا ''امانت داری'' کے اس نظریے کو عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک فرد کو غیر محدود دولت اور اختیارات دے دیئے جائیں اور پھر اسی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کی مفاد عامہ کے لیے استعمال کرے گا؟ کیا ہم میں سے بہتر لوگ بھی اخلاقی تکمیل کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ ان پر اس طریقے سے اعتماد کیا جا سکے؟ افلاطون کے فلسفی بادشاہ بھی مشکل ہی سے اس بوجھ کے اٹھانے کے اہل ثابت ہوتے۔ اس کے علاوہ کیا دوسروں کے لیے یہ اچھا ہوگا کہ یہ شفیق مافوق الانسان ان پر مسلط کر دیئے جائیں۔ لیکن دنیا میں نہ تو کوئی مافوق الانسان ہے نہ کوئی فلسفی بادشاہ، یہاں تو ناقص انسان بستے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذاتی مفاد میں اور ان کے خیالات کے پھیلنے میں ساری قوم کا بھلا ہے، اس خیال کی بدولت خاندانی شرافت اور دولت کا اقتدار ہمیشہ کے لیے قائم ہو جاتا ہے۔ جس کے نتائج ہر طرح مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ اس وقت میں اس مسئلے پر غور نہیں کر رہا ہوں کہ سماجی نظام کی تبدیلی کس طرح عمل میں آئے اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ کیونکر دور کی جائیں۔ جبر سے یا خیالات پر اثر ڈالنے کے ذریعے سے، تشدد سے یا عدم تشدد سے،

اس پہلو سے میں بعد میں بحث کروں گا۔ بہر حال تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کر لینا چاہیے اور اس کو صاف الفاظ میں بیان کر دینا چاہیے۔ جب تک سیاسی اور ذہنی رہنما اس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھتے اور صاف صاف بیان نہیں کرتے اس وقت تک وہ یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے یا لوگوں میں وہ ذہنیت پیدا کر سکیں گے جس کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات خود سب سے بہتر معلم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان واقعات کی صحیح اہمیت کو ظاہر کرنا ہے اور ان سے مناسب کام لینا ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم خود انہیں اچھی طرح سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔

کبھی کبھی میرے احباب اور رفقا میری باتوں سے چڑ کر پوچھتے ہیں کہ کیا آپ نے کبھی کوئی کریم النفس رئیس، مخیّر زمیندار، نیک نیت اور بامروت سرمایہ دار اب تک نہیں دیکھا؟ بے شک میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں بلکہ میں خود اس طبقے سے ہوں جو زمینداروں اور دولت مندوں سے میل جول رکھتا ہے، میں خود ایک نمونہ کا ''بورژوا'' (۵) ہوں۔ اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی اور اسی کے خیالات نے ابتداء میں مجھے متاثر کیا۔ بعض اشتمالیوں نے مجھے ''پیٹی بورژوا'' (۶) کہا تھا اور بالکل ٹھیک کہا تھا۔ غالباً اب وہ مجھے ''اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا بورژوا'' کہیں گے۔ لیکن یہاں اس سے کچھ بحث نہیں کہ میں کیا ہوں۔ یہ بالکل مہمل بات ہے کہ قومی، بین الاقوامی، معاشی اور سماجی مسائل پر غور کرتے وقت افراد کی ذاتی حیثیت کو اہمیت دی جائے۔ وہی احباب جو مجھ پر اعتراض کرتے ہیں برابر یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا جھگڑا گناہ سے ہے نہ کہ گنہگار سے۔ میں اتنا بڑا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا جھگڑا نظم سے ہے نہ کہ افراد سے۔ مگر ہر نظام بڑی حد تک افراد اور جماعتوں سے لڑتا ہے یا انہیں اپنا ہم خیال بناتا ہے۔ اگر کوئی نظام اب ہمارے لیے مفید نہیں رہا اور ترقی کی راہ میں حائل ہے تو وہ مٹ کر رہے گا اور جو

طبقے اور جماعتیں اس سے وابستہ ہیں ان کو بھی اپنی کایا پلٹ کرنی پڑے گی۔ اس عمل تغیر میں جہاں تک ہو سکے تکلیف کے عنصر کو کم کرنا چاہیے، لیکن بدقسمتی سے صورت ہی ایسی ہے کہ لوگوں کو تکلیف پہنچنا اور معاملات کا درہم برہم ہونا ناگریز ہے بہر حال یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اتنی بڑی برائی کو اس ڈر سے برداشت کرتے رہیں کہ کہیں چھوٹی چھوٹی برائیاں نہ اٹھ کھڑی ہوں۔ یہ برائیاں تو پیدا ہوتی ہی ہیں اور ان کا روکنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

ہر قسم کی انسانی جماعتیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا معاشرتی کسی نہ کسی فلسفے پر مبنی ہوتی ہیں، اور جب ان جماعتوں میں کوئی تبدیلی پیدا ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس بنیادی فلسفے میں بھی تبدیلی کی جائے تاکہ وہ نئے خیالات کے ساتھ کھپ سکے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے مگر عموماً فلسفہ واقعات کی رفتار سے پیچھے رہ جاتا ہے اور اسی سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی میں جمہوریت اور سرمایہ داری کی نشوونما ساتھ ساتھ ہوئی۔ لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں ایک بنیادی تضاد تھا۔ کیونکہ جمہوریت اس بات پر زور دیتی تھی کہ زیادہ لوگوں کو سیاسی قوت حاصل ہو اور سرمایہ داری اصل قوت کو صرف چند افراد تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ان دونوں کا بے تکا ساتھ اس لیے نبھ گیا کہ سیاسی پارلیمانی جمہوریت اب بہت بدنام ہوگئی۔ یہ اسی کا ردعمل ہے کہ دنیا میں طرح طرح کی نئی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہندوستان میں بھی برطانوی حکومت اور زیادہ رجعت پسند بن گئی ہے اور اسے ایک بہانہ ہاتھ آگیا ہے کہ سیاسی آزادی کو ظاہری شکلوں سے بھی محروم رکھے۔ لطف تو یہ ہے کہ ریاستیں بھی پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کو اپنی غیر محدود مطلق العنانی کے جائز ہونے کی دلیل قرار دیتی ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے یہ ارادہ ظاہر کرتی ہیں کہ اپنے یہاں وہی قرون وسطیٰ کا طرز قائم رکھیں گی جس کا دنیا میں کہیں او روجود نہیں۔ (۷)

لیکن پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت آگے بڑھ گئی ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ زمانے کی رفتار سے پیچھے رہ گئی ہے۔ یہ جمہوریت ناقص تھی اس لیے کہ اس نے معاشی جمہوریت کو نظر انداز کر دیا۔ اس کا طریق کار بہت سست اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے لیے بالکل موزوں تھا۔

دیسی ریاستیں غالباً آج دنیا میں انتہائی مطلق العنانی کا نمونہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ برطانیہ کی محکوم ہیں، لیکن برطانوی حکومت ان کے معاملات میں صرف اسی حد تک دخل دیتی ہے جہاں تک برطانوی مفاد کا تقاضا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ قدیم جاگیرداری نظام کے نمونے جو چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح غیر ملکی حکومت کے سمندر میں گھرے ہوئے ہیں۔ کیونکر بغیر کسی تغیر اور تبدیلی کے بیسویں صدی تک باقی رہے، وہاں اب تک ہوا بند اور بھاری ہے، پانی دھیرے دھیرے بہتا ہے اور ایک نو وارد جو تبدیلی اور حرکت کا عادی ہے بلکہ شاید اسی سے کسی قدر گھبرا بھی گیا ہے، وہاں پہنچ کر اونگھنے لگتا ہے اور اس پر ایک جادو کی سی کیفیت چھا جاتی ہے۔ ایک بے جان تصویر سی نظر آتی ہے۔ جو وقت کی حرکت سے محفوظ ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتی ہے۔ تقریباً بالکل غیر محسوس طریقے پر دیکھنے والا ماضی کے تصور میں ڈوب جاتا ہے اور بچپن کے خواب اس کی نظروں میں پھرنے لگتے ہیں۔ طرح دار جوان زرہ بکتر سے آراستہ، حسین لڑکیاں، منارہ دار قلعے، سورماؤں کا زمانہ، سپاہیانہ آن بان، بے نظیر شجاعت اور جاں بازی۔ خصوصاً اگر وہ راجپوتانہ کے علاقے میں ہے جو رومان اور من چلے پن کے کارناموں کا گھر ہے۔

لیکن بہت جلد یہ تصور دھندلا پڑ جاتا ہے اور ہوا کی کثافت سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے دھیرے دھیرے بہنے والے تالاب کی تہہ میں بند پانی کی سڑاند محسوس ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر طرف سے گھرا ہوا ہے

اوراس کا جسم اور دماغ زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ ایک طرف پرجا کی انتہائی پستی اور مصیبت اور دوسری طرف راجا کے محل کے ٹھاٹ کو دیکھ پر دل پر عجیب اثر پڑتا ہے۔ ریاست کی دولت کا کتنا بڑا حصہ محل میں رئیس کے تعیّشات اور ذاتی ضروریات کی نذر ہوتا ہے اور کتنا تھوڑا حصہ عام لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ یہ رئیس ریاست کو بڑے مہنگے پڑتے ہیں ان پر اتنا خرچ کر کے اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟

ان ریاستوں پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اخبار وہاں پہنچنے نہیں دیئے جاتے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ادبی یا نیم سرکاری ہفتہ وار اخبار چل سکتا ہے، بیرونی اخبارات کا داخلہ اکثر بند کر دیا جاتا ہے۔ سوائے جنوبی ریاستوں کے مثلاً ٹراونکور اور کوچن وغیرہ (جہاں پڑھے لکھوں کی تعداد برطانوی علاقے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے) اور ریاستوں میں عام تعلیم بہت کم ہے۔ سب سے اہم خبریں جو ریاستوں سے آتی ہیں وہ یہ ہوتی ہیں:

وائسرائے کی تشریف آوری کا تزک و احتشام، دربار، ایک دوسرے کی تعریف میں تقریریں، رئیس کی شادی یا سال گرہ کا پر تکلف جشن، یا پھر کسانوں کی شورش۔ خود برطانوی ہند میں رئیسوں کو لوگوں کی نکتہ چینی سے محفوظ رکھنے کے لیے خاص قوانین بنا دیئے گئے ہیں اور ریاست کے اندر تو معمولی سے معمولی تنقید بھی نہایت سختی کے ساتھ دبا دی جاتی ہے۔ عام جلسے قریب قریب مفقود ہیں، یہاں تک کہ وہ جلسے بھی جو کسی معاشرتی مقصد سے کئے جائیں اکثر روک دیئے جاتے ہیں۔ (۸) اکثر باہر کے سربر آوردہ قومی کارکنوں کا داخلہ ریاستوں میں روک دیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے وسط میں مسٹر سی۔ آر۔ داس بہت بیمار تھے اور انہوں نے صحت حاصل کرنے کی غرض سے کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں کوئی سیاسی غرض نہیں تھی مگر کشمیر کی سرحد پر پہنچنے کے بعد وہ آگے بڑھنے سے روک دیئے گئے۔

مسٹر جناح کو بھی حیدرآباد میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی، اور مسز نائڈ روجن کا گھر خاص حیدرآباد شہر میں ہے ایک مدت تک وہاں نہیں جانے پائیں۔

جب ریاستوں کی یہ حالت تھی تو ظاہر ہے کہ کانگریس کو ریاست کے باشندوں کے بنیادی حقوق کی حمایت اور اور ان کی پامالی پر نکتہ چینی کرنی چاہیے تھی لیکن گاندھی جی نے ریاستوں کے متعلق ایک انوکھی ایجاد کی۔ یعنی ''ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت'' اس چپ چپ کی پالیسی پر وہ ان تمام غیر معمولی اور افسوس ناک واقعات کے باوجود قائم رہے جو ریاستوں میں پیش آئے۔ حالانکہ ریاستوں کی حکومتیں بے وجہ کانگریس پر حملے کرتی رہیں۔ بظاہر شاید یہ خطرہ ہے کہ کانگرس کی نکتہ چینی رئیسوں کو ناراض کر دے گی اور پھر ان کو ہم خیال بنانا اور زیادہ دشوار ہو جائے گا۔ گاندھی جی نے اپنے جولائی ۱۹۳۴ء کے خط میں جو انہوں ریاستوں کی رعایا کی کانفرنس کے صدر مسٹر این۔ سی کالکار کے نام لکھا تھا۔ اپنے اس خیال کو دہرایا کہ عدم مداخلت کی پالیسی بالکل صحیح اور دانشمندانہ ہے۔ ان ریاستوں کی آئینی اور قانونی حیثیت کے متعلق جو خیال انہوں نے ظاہر کیا وہ عجیب وغریب تھا، انھوں نے لکھا تھا کہ ''یہ دیسی ریاستیں برطانوی ہند کہلاتا ہے ان ریاستوں کی پالیسی کی تشکیل کا اس سے زیادہ اختیار نہیں جتنا کہ مثلاً افغانستان اور سیلون کی پالیسی میں دخل دینے کا''۔ چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دیسی ریاستوں کی رعایا کی نرم اور اعتدال پسند کانفرنس اور لبرل پارٹی نے بھی ان کی رائے اور مشورے پر اعتراض کیا۔

لیکن یہ خیالات رئیسوں کو بہت پسند آئے۔ انہوں نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ایک ہی مہینے کے اندر حکومت ٹرانکور نے اپنے حدود میں نیشنل کانگریس کو ممنوع قرار دے دیا، اس کے تمام جلسوں کو اور ممبر بنانے کی تحریک کو روک دیا۔ اس کارروائی کے ساتھ اس نے یہ اعلان کیا کہ ذمہ دار لیڈروں نے خود ہی یہ مشورہ دیا

ہے (صریحاً یہ اشارہ گاندھی جی کے بیان کی طرف تھا)۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ ممانعت اس وقت کی گئی جب برطانوی میں سول نافرمانی موقوف ہو چکی تھی (ریاستوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا) اور حکومت ہند نے کانگریس کو دوبارہ مطابق قانون قرار دے دیا تھا، یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حکومت ٹراونکور کے مشیر قانونی اس وقت سر سی۔ پی۔ راما سوامی آئر تھے (اور اب تک ہیں) جو ایک زمانے میں کانگریس اور ہوم رول لیگ دونوں کے جنرل سیکرٹری تھے، آگے چل کر لبرل بن گئے اور حکومت ہند اور حکومت مدراس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔

کانگریس کی پالیسی اور گاندھی جی کے مشورہ کے مطابق حکومت ٹراونکور کے اس بے وجہ حملے کے جواب میں جو امن کے زمانے میں کانگریس پر کیا گیا اس کی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا،(۹) حالانکہ بعض لبرل حضرات نے بڑے زور شور سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ حقیقت میں ریاستوں کے معاملے میں گاندھی جی نے لبرل پارٹی سے کہیں زیادہ اعتدال اور احتیاط کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ سر برآوردہ قومی لیڈروں میں شاید صرف پنڈت مدن موہن مالوی ایک ایسے شخص ہیں جو بہت سے رئیسوں سے گہرے تعلقات رکھنے کی وجہ سے اس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں، اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ والیان ریاست کے جذبات کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔

گاندھی جی پہلے رئیسوں کے معاملے میں اتنے زیادہ محتاط نہ تھے۔ ۱۹۱۶ء میں ایک مشہور موقع پر جب بنارس میں ہندو یونیورسٹی کی افتتاحی رسمیں ادا ہو رہی تھیں، انہوں نے ایک جلسے میں تقریر کی تھی، جس کے صدر ایک مہاراجہ تھے اور جس میں بہت سے اور رئیس شریک تھے۔ وہ نئے نئے افریقہ سے واپس آئے تھے اور ہندوستان کی ریاست کا بوجھ ہنوز ان کے کاندھوں پر نہ تھا۔ سچے مصلحانہ جوش سے انہوں نے ان حضرات کو ہدایت کی کہ اپنے اطوار کو درست کریں اور خود پسندانہ عیش وعشرت وشان وشوکت کو چھوڑ دیں۔ انہوں نے کہا ''رئیسو جاؤ اور اپنے زیور اور

جواہرات کو بیچ ڈالو" زیورات اور جواہرات تو وہ کیا بیچتے مگر چلے ضرور گئے۔ سراسیمگی کی حالت میں ایک ایک دو دو کر کے سب رئیس وہاں سے اٹھ گئے یہاں تک کہ جناب صدر بھی مقرر کو تنہا چھوڑ کر چل دیئے ،مسز ؟؟؟ بھی جو اس وقت وہاں موجود تھیں گاندھی جی کی باتوں سے خفا ہو گئیں اور جلسے کو چھوڑ کر چلی گئیں۔

ایک خط میں جو گاندھی جی نے مسٹر کالکار کے نام لکھا تھا وہ فرماتے ہیں "میں چاہتا ہوں کہ ریاستیں اپنی رعایا کو خود اختیاری حکومت عطا کر دیں اور رئیس اپنے آپ کو جمہور کا امانت دار سمجھیں"۔ اگر واقعی اس "امانت داری" کے نظریئے میں کوئی بات ہے تو ہم پھر برطانوی حکومت کے اس دعوے پر کیوں اعتراض کرتے ہیں کہ "وہ ہندوستان کی حکومت کی امانت دار ہے"۔ بجز اس کے کہ وہ بدیسی ہے اس میں اور ہندوستانی رئیسوں میں کیا فرق ہے؟ اور رنگ، نسل اور تہذیب کا اختلاف تو خود ہندوستان کے لوگوں میں بھی موجود ہے۔

گزشتہ چند سال سے ریاستوں میں تیزی کے ساتھ برطانوی حکام ٹھونسے جا رہے ہیں۔ رئیس عموماً اس کے مخالف ہیں مگر وہ بالکل بے بس ہیں۔ یوں تو حکومت ہند ہمیشہ سے ریاستوں پر تسلط رکھتی ہے مگر اب ریاستیں اندر سے بھی جکڑ دی گئیں۔ چنانچہ جب کبھی ریاستوں کی زبان سے کچھ نکلتا ہے تو، اصل میں یہ حکومت ہند کی بدلی ہوئی آواز ہوتی ہے جو جاگیرداری نظام کے پردے سے بولتی ہے۔

یہ میں سمجھ سکتا ہوں کہ ریاستوں میں ہمیشہ اس قسم کی جدوجہد جیسی برطانوی ہند میں ہوتی ہے ممکن نہیں خود برطانوی ہند کے مختلف صوبوں کی زراعتی صنعتی، فرقہ وارانہ اور انتظامی حالت میں بھی بہت فرق ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی پالیسی سب کہیں قابل عمل ہو۔ لیکن جدوجہد کے طریقے میں حالات کے لحاظ سے اختلاف ہونا اور بات ہے۔ ہماری عام پالیسی مختلف علاقوں میں مختلف نہیں ہونی چاہیے اور جو چیز ایک جگہ بری سمجھی جاتی ہے وہ دوسری جگہ بری سمجھی جانی چاہیے۔

ورنہ ہم پر یہ الزام لگایا جائے گا اور لگایا جا چکا ہے کہ ہم کوئی مستقل پالیسی اور اصول نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف قوت اور اقتدار حاصل کرنا ہے۔

مختلف ملتوں اور دوسری اقلیتوں کو جداگانہ حق انتخاب دینے کے خلاف بجا طور پر بہت کچھ نکتہ چینی کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ جمہوریت کے ساتھ کسی طرح نہیں کھپ سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب حلقہ ہائے انتخاب مذہبی جماعتوں میں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوں، تقسیم کر دیئے جائیں تو جمہوریت یا ذمہ دار حکومت کے قائم ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن جو لوگ اس پر بڑے زورشور سے نکتہ چینی کرتے ہیں مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی یا ہندو سبھا کے لیڈر، تعجب ہے کہ وہ ریاستوں کے حالات سے مطمئن ہیں اور بظاہر اس پر آمادہ ہو گئے کہ استبدادی ریاستوں اور جمہوری برطانوی ہند (یہ حضرات اسے جمہوری کہتے ہیں) کے درمیان وفاقی اتحاد ہو جائے۔ اس سے زیادہ بے تکا اور نامعقول اتحاد مشکل سے تصور میں آ سکتا ہے۔ لیکن ہندو سبھا کے حامیان جمہوریت وقومیت بے تکلف اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم زبان سے تو منطقی صحت اور استقامت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ہمارے عمل کا بنیادی محرک اب تک جذبات کے سوا کچھ نہیں۔

غرض ریاستوں کے متعلق کانگریس کا رویہ ایک عجیب معما ہے مجھے ٹامس پین کا ایک جملہ یاد آ گیا جو اس نے تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوئے برک کے متعلق کہا تھا کہ ''انہیں پروں پر ترس آتا ہے مرگ یہ نہیں دیکھتے کہ چڑیا مری جاتی ہے'' گاندھی جی مرتی ہوئی چڑیا کو تو دیکھتے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پروں کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہیں۔

کم وبیش یہی صورت تعلقہ داریوں اور بڑی زمینداریوں کے نظام کی ہے۔ اس معاملہ میں تو اب کسی دلیل و بحث کی ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی ہے کہ یہ نیم جاگیرداری نظام فرسودہ ہو گیا ہے اور دولت آفرینی اور عام ترقی کی راہ میں حائل

ہے۔ خود سرمایہ داری کے ترقی پذیر نظام کے ساتھ اس کا نبھنا ممکن نہیں چنانچہ قریب قریب دنیا کے سب ملکوں میں بڑی بڑی زمینداریاں غائب ہوتی جاتی ہیں اور کاشتکاران زمیندار کی جگہ لے رہے ہیں۔ میرا اب تک یہی خیال تھا کہ ہندوستان میں اگر کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ جن زمینداروں سے زمین چھینی جائے انہیں اس کا کوئی معاوضہ دیا جائے۔ لیکن سال گزشتہ مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ گاندھی جی موجودہ تعلقہ داری نظام کو فی نفسہ پسند کرتے ہیں اور اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ جولائی ۱۹۳۴ء میں انہوں نے کانپور میں کہا تھا ''زمیندار اور کسان کے دل میں ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو ان کے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔ پھر دونوں امن اور سلوک سے رہ سکتے ہیں۔ میں ہرگز تعلقہ داری اور زمینداری نظام کو مٹا دینے کا حامی نہیں ہوں اور جو لوگ اس کو مٹانا چاہتے ہیں وہ خود اپنے خیالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے'' (یہ انہوں نے بڑی بے انصافی کی بات کہی)۔

آگے چل کر انہوں نے فرمایا ''میں ہرگز اس کوشش میں شریک نہیں ہوں گا کہ املاک رکھنے والے طبقے سے اس کی املاک چھین لی جائے، میرا مقصد آپ کے دلوں پر اثر ڈالنا اور آپ کو اپنا ہم خیال بنانا ہے (وہ بڑے بڑے زمینداروں کے ایک وفد سے مخاطب تھے) تا کہ آپ اپنی ذاتی املاک کو رعایا کی امانت کے طور پر رکھیں اور اس کا اصل مصرف ان کی فلاح و بہبود کو سمجھیں۔ اگر بے انصافی سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ آپ کی جائداد آپ سے چھین لی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ میں آپ کی طرف سے لڑوں گا۔ مغرب کی اشتراکیت اور اشتمالیت کی بنیاد ایسے تصورات پر ہے جو بنیادی طور پر ہمارے تصورات سے مختلف ہیں۔ ان میں سے ایک ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے اس لیے ہماری اشتراکیت اور اشتمالیت کی بنیاد عدم تشدد پر اور مزدور اور سرمایہ دار، زمیندار اور

کاشتکار کے ہم آہنگ تعاون پر ہونی چاہیے‘‘ میں نہیں کہہ سکتا کہ مشرق اور مغرب کے بنیادی تصورات میں اس قسم کا اختلاف ہے یا نہیں ممکن ہے کہ ہو مگر اس زمانے میں تو صریحی اختلاف یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستانی سرمایہ دار اور زمیندار، مزدروں اور کسانوں کے مفاد سے مغربی سرمایہ داروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ غفلت اور بے پروائی برتتے ہیں۔ ہندوستان کے زمیندار نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ کسانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لیں۔ایک یورپی مسٹر ایچ ای بریلس فورڈ نے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کر کے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ’’ہندوستانی ساہوکار اور زمیندار ایسی خون چوسنے والی جونکیں ہیں جن کی مثال کسی موجودہ سماجی نظام نہیں مل سکتی‘‘ (۱۰) لیکن غالباً ہندوستانی زمیندار کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ وہ خود زمانے کے حالات سے مجبور ہے۔ اس کی حالت گرتی چلی جاتی ہے۔اور اب ایسی مشکل میں پڑ گیا ہے جس سے نجات پانا اس کے بس کی بات نہیں۔ مہاجنوں نے اکثر زمینداروں کی جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور چھوٹے زمیندار اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اسی زمین پر جس کے وہ کسی زمانے میں مالک تھے، کاشتکار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔شہر کے مہاجنوں نے جائدادیں رہن رکھیں اور روپیہ وقت پر ادا نہ ہونے سے فائدہ اٹھا کر ان پر قبضہ کر لیا۔اس طرح وہ زمیندار بن بیٹھے۔گاندھی جی کے قول کے مطابق یہ لوگ امانت دار ہیں ان غریبوں کے جن سے انہوں نے خود زمینیں چھینی ہیں اور ان سے یہ توقع ہے کہ اپنی آمدنی کا اصل مصرف اسامیوں کی فلاح و بہبود کو سمجھیں گے۔

اگر واقعی تعلقہ داری نظا اچھا ہے تو اسے سارے ہندوستان میں کیوں نہ رائج کیا جائے؟ ہندوستان میں بڑے بڑے علاقے ہیں جہاں کسان حق ملکیت رکھتا ہے۔کیا گاندھی جی اسے پسند کریں گے کہ گجرات میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار بنا دئے جائیں؟ میرے خیال میں تو ہرگز پسند نہیں کریں گے۔پھر کیا وجہ

ہے کہ صوبہ متحدہ یا بہار یا بنگال کے لیے تو کوئی اور نظام اچھا ہو اور گجرات یا پنجاب کے لیے کوئی اور۔ غالباً شمالی اور جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان کے لوگوں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ اور ان کے بنیادی تصورات ایک ہی ہیں۔ مطلب اصل میں یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہے ویسی ہی رہے ''حالت موجودہ'' میں کوئی تغیر نہ کیا جائے نہ تو کسی معاشی تحقیقات کی ضرورت ہے کہ کون سی چیز لوگوں کے لیے سب سے زیادہ مناسب اور مفید اور نہ کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ لوگوں کے دل میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی جائے۔ یہ زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنے کا خالص مذہبی نقطہ نظر ہے اور اسے سیاسیات، معاشیات اور اجتماعیات سے بھی ذرا لگاؤ نہیں۔ مگر گاندھی جی مذہب کے دائرے سے آگے بڑھ کر سیاسی اور قومی معاملات میں بھی اس سے کام لینا چاہتے ہیں۔

اس قسم کے متضاد حالات اور خیالات آج کل ہندوستان کے سامنے ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں بہت سی گتھیاں ڈالی ہیں جن کو سلجھائے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ مگر یہ جذبات کی مدد سے نہیں سلجھ سکتیں۔ اب سے بہت پہلے اسپنوزا نے یہ سوال کیا تھا کہ کون سی چیز بہتر ہے'' علم اور عقل کے ذریعے آزادی حاصل کرنا یا جذبات کی زنجیروں میں جکڑے رہنا؟'' اس نے پہلی صورت کو ترجیح دی تھی۔

---

(۱) اپنے ایک پیام میں، جو قدامت پسند اور اتحادی پارٹی کی متحدہ انجمن کو جس کا جلسہ جنوری ۱۹۳۵ء میں اڈنبرگ میں ہوا بھیجا گیا تھا مسٹر ریمزے میکڈ ولڈ فرماتے ہیں ''زمانے کی مشکلات ہر قوم کو متحد ہونے اور ایک مرکز پر جمع ہونے پر مجبور کر رہی ہیں۔ یہی حقیقی اشتراکیت ہے، یہی حقیقی قومیت بھی ہے بلکہ یہی حقیقی انفرادیت بھی ہے۔''

(۲) ضبط نفس اور نفس پرستی مصنفہ ایم کے گاندھی سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔

(۳) ۳ جنوری کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''حقیقی اشتراکیت دیہاتی صنعتوں کی ترقی پر موقوف ہے۔ ہم اپنے ملک میں وہ ابتری پیدا نہیں کرنا چاہتے جو مغربی ملکوں میں بڑے پیمانے کی پیداوار کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔''

(۳) ۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس کے جلسے میں گاندھی جی نے فرمایا تھا ''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگرس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان نیم فاقہ کش غریبوں کی نمائندہ ہے جو ملک کے طول وعرض میں سات لاکھ گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں، چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں یا ''ہندی ہند'' کے۔ جن جن گروہوں کی اغراض کانگریس کے نزدیک قابل حمایت ہیں ان میں سب پر مقدم ان بے زبانوں کی فلاح ہے۔ اکثر یہ اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہو کہ مختلف گروہوں کی اغراض ٹکرا جائیں تو میں بے دھڑک کہتا ہوں کہ کانگرس ہر گروہ کی اغراض کو ان کروڑوں بے زبانوں کی فلاح پر قربان کر دے گی۔''

(۴) اوسط طبقے کا شہری۔

(۵) نیچے اوسط طبقے کا شہری۔

(۶) ۲۲ جنوری ۱۹۳۵ء کو مہاراجہ پٹیالہ چانسلر مجلس رؤسا نے چیمبر کے اجلاس دہلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے بعض سیاستدان وفاقی نظام کی تائید اس امید پر کرتے ہیں کہ حالات خود بخود دیسی ریاستوں کو اس پر مجبور کر دیں گے کہ وہ بھی اپنے یہاں جمہوری طرز حکومت قائم کریں۔ اس کے متعلق انہوں نے یہ فرمایا ''اگر چہ دیسی ریاستیں ہمیشہ اس بات کی خواہاں رہی ہیں کہ اپنی رعایا کے لیے وہ سب کچھ کریں جو ان کے لیے بہتر ہے اور آئندہ بھی وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلیں اور اپنی ریاستوں کے دستور اساسی میں مقتضائے وقت کے لحاظ سے ترمیم کریں۔ ہم صاف صاف یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ اگر برطانوی ہند اس دھوکے میں ہے کہ وہ ہمارے تندرست سیاسی جسم کو ایک بدنام سیاسی نظریے کی اترن پہننے پر مجبور کر دے گا تو وہ ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔'' اسی روز مجلس رؤسا میں تقریر کرتے ہوئے مہاراجہ بیکانیر نے فرمایا ''ہم دیسی ریاست کے فرمانروا قسمت آزمائی کرنے والے سپاہی نہیں ہیں، میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ کہ کئی صدی کی خاندانی روایات کی بناء پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حکومت ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ اور حکمت عملی اور تدبر میں ہمیں تھوڑا بہت حصہ ملا ہے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ کہیں دوسروں کے دباؤ میں آ کر ہم عجلت میں بے سوچے سمجھے کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔ اگر اجازت ہو تو میں نہایت انکسار کے ساتھ عرض کروں گا۔ کہ ہندوستانی رئیس ہرگز اس کے لیے تیار نہیں کہ کسی سے دب کر حکومت سے دست بردار ہو جائیں۔ اور اگر بدقسمتی سے کبھی ایسا وقت آ گیا کہ تاج برطانیہ اپنے عہدناموں کی شرائط کے مطابق دیسی ریاستوں کی حفاظت نہ کر سکا تو رئیس اور ریاستیں مرتے دم تک میدان سے ٹلنے والی نہیں۔''

(۷) حیدر آباد دکن کی ایک اخباری اطلاع مورخہ ۳ اکتوبر ۳۴ء مظہر ہے ''گاندھی جی کی سالگرہ منانے کے لیے جو عام جلسہ دو یک درونی تھیٹر میں ہونے والا تھا وہ نہیں ہو سکا۔ جلسے کا انتظام حیدر آباد ہریجن سیوک سنگھ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس انجمن کے سیکرٹری نے اخبارات کے نام ایک خط میں بیان کیا ہے کہ جلسے کے وقت سے ۲۴ گھنٹے پہلے حکام نے یہ اطلاع دی کہ جلسہ کرنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی جائے گی کہ دو ہزار روپے کی نقد ضمانت داخل جائے اور یہ وعدہ کیا جائے کہ سیاسی نوعت کی تقریر نہ کی جائے گی اور حکام ریاست کے کسی سرکاری فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی جائے گی چونکہ اتنا وقت نہ تھا کہ داعی حکام سے مل کر معاملات طے کر سکتے اس لیے جلسہ کا خیال مجبوراً ترک کر دیا گیا''۔

(۸) سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ۹ جنوری ۳۵ء کو بڑودے میں تقریر کرتے ہوئے اسی عدم مداخلت کی پالیسی پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ ریاستوں کے کارکنوں کو چاہیے کہ ریاست کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے دائرے میں رہ کر اپنا کام کریں، اور ریاست کے کام پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے یہ کوشش کریں کہ رعایا اور راعی کے درمیان عمدہ تعلقات قائم رہیں۔

(۹) ''ملکیت یا امن؟'' مصنفہ ایچ این بریلس فورڈ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خیالات پر اثر ڈالنا بہتر ہے یا جبر سے کام لینا

سولہ برس گزرے گاندھی جی نے ہندوستان پر اپنا اہنسا کے اصول کا سکہ بٹھا دیا تھا۔اس وقت سے اب تک ہندوستانی سیاست پر اس کا تسلط رہا ہے۔ بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہوں نے بغیر سمجھے بوجھے اس کی تائید کی بعض نے اسے بڑی کش مکش کے بعد مشروط یا غیر مشروط طور پر قبول کیا اور بعض نے کھلم کھلا اس کا مذاق اڑایا۔ ہماری سیاسی اور سماجی زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور ہندوستان کے باہر بھی دوسرے ممالک میں اس کا بہت چرچا ہوا۔یوں تو یہ اصول اس وقت سے چلا آتا ہے جب سے انسان میں قوت فکر پیدا ہوئی۔لیکن غالباً گاندھی جی پہلے آدمی ہیں۔ جنہوں نے اس سے بڑے پیانے پر سیاسی اور سماجی تحریکوں میں کام لیا۔ابتدا میں یہ ایک انفرادی چیز تھی اور اس وجہ سے اس کی حیثیت دراصل مذہبی تھی۔اس کا مقصد انفرادی ضبط نفس ہوتا تھا اور اس کے ذریعہ انسان ذاتی اغراض سے بری اور دنیاوی کش مکش سے بلند ہو کر ایک قسم کی شخصی آزادی اور نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔اس میں یہ مقصد پیش نظر نہیں رکھا گیا تھا کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے سماجی مسائل کو حل کیا جائے اور سماجی حالات میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ہاں بالواسطہ اسی کا اثر کسی قدر سماجی زندگی پر پڑتا تھا۔اصل میں موجودہ سماجی نظام اور اسی بے انصافیوں اور عدم مساوات کو لوگ اٹل سمجھ کر بے چون و چرا تسلیم کرتے تھے۔گاندھی جی نے یہ کوشش کی کہ اس شخصی نصب العین کو بدل کر ایک اجتماعی نصب العین بنا دیں۔وہ سیاسی اور سماجی حالات دونوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے بالارادہ اس اہنسا کے طریقے کو اس وسیع اور نئے مقصد کے لیے استعمال کیا۔انہوں نے لکھا ہے کہ ”جو لوگ انسانوں کے ماحول اور ان کے حالات زندگی میں کوئی اہم تبدیلی کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ سوسائٹی میں ایک ذہنی ہیجان پیدا کریں۔اس کے دو ہی

طریقے ہو سکتے ہیں یا

تشدد اور جبر سے کام لیا جائے یا اہنسا پر عمل کیا جائے۔ جبر کا دباؤ انسان کے جسم پر پڑتا ہے اور اس سے کام لینے والا خود ذلیل ہوتا ہے۔ اور دوسرے کو پست کرتا ہے لیکن اہنسا کا دباؤ جو خود تکلیف اٹھا کر مثلاً فاقہ کشی کے ذریعے ڈالا جائے اس سے بالکل مختلف اثر پیدا کرتا ہے۔ یہ جن لوگوں کے خلاف استعمال کیا جائے، ان کے جسم پر نہیں بلکہ ان کی اخلاقی قوتوں پر اثر ڈالتا ہے اور انہیں تقویت پہنچاتا ہے۔''

(۱)

یہ خیال ایک حد تک ہندوستانی فلسفہ سے ہم آہنگ ہے۔ اس لیے لوگوں نے اس کو کم سے کم سطحی طور پر نہایت جوش کے ساتھ قبول کرلیا۔ بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ اس کے نتائج کتنی دور تک پہنچتے ہیں اور جنہیں تھا انہوں نے بھی اس کے نظری پہلو کو سمجھے بغیر محض عقیدے اور عمل کے دامن میں پناہ لی۔ مگر جب عمل کا جوش کم ہوا تو لوگوں کے ذہن میں بے شمار سوالات پیدا ہوئے جن کا جواب دینا مشکل ہوگیا۔ ان سوالوں کا کوئی خاص اثر اس موجودہ سیاسی طرز عمل پر نہیں پڑا بلکہ یہ دراصل اس تمام فلسفہ حیات سے متعلق تھے جس پر اس قسم کے بے تشدد مقابلے کی بنیاد ہے۔ سیاسی نقطہ نظر سے اس تحریک کو ابھی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندوستان اب تک شہنشاہیت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ سماجی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس سے ابھی کسی زبردست سماجی انقلاب کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا۔ مگر باوجود اس کے اگر کسی شخص میں تھوڑی سی نظر بھی ہے تو دیکھ سکتا ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان کے کروڑوں باشندوں میں کس قدر زبردست تغیر پیدا ہوگیا ہے۔ اس نے ان میں سیرت کی پختگی، قوت اور خود اعتمادی پیدا کردی ہے اور یہ ایسی صفات ہیں جن کے بغیر سیاسی اور سماجی ترقی حاصل کرنا یا اس کا قائم رکھنا بہت دشوار ہے۔ اس کا فیصلہ آسانی سے نہیں ہوسکتا کہ یہ فوائد کہاں تک اہنسا کے اصول کی وجہ سے حاصل ہوتے

ہیں اور کہاں تک ہماری سیاسی کش مکش کا لازمی نتیجہ ہیں۔ بہت سی قوموں کو اکثر موقعوں پر یہ تمام فوائد ایسی کش مکش سے بھی حاصل ہوئے ہیں جس میں تشدد کو دخل تھا۔لیکن میرے خیال میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس اعتبار سے عدم تشدد (اہنسا) کا طریقہ ہمارے ملک کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں سوسائٹی میں وہ ''ذہنی ہیجان'' پیدا کرنے میں مدد ملی ہے۔جس کی طرف گاندھی جی نے اشارہ کیا تھا، گو یہ واقعہ ہے کہ وہ ہیجان بعض بنیادی حالات اور اسباب کا نتیجہ ہے۔اس نے عام لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جو ہر انقلاب کی تمہید ہوا کرتی ہے۔

اہنسا کی یہ خوبی تو کھلی ہوئی ہے مگر یہ بجائے خود کافی نہیں۔اصل شبہات اس سے دور نہیں ہوتے۔بد قسمتی سے خود گاندھی جی سے اس مسئلے کے حل میں کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی۔ انہوں نے اس موضوع پر بے شمار موقعوں پر تقریریں کی ہیں اور مضامین لکھے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے کبھی پبلک میں اس کے تمام فلسفیانہ اور عملی نتائج پر روشنی نہیں ڈالی (۲)۔وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ذرائع مقصد سے زیادہ اہم ہیں، روحانی اثر، جبر سے بہتر ہے اور ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہنسا کو حق اور خیر سے تعبیر کریں بلکہ وہ اکثر انہیں ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ایک رجحان یہ بھی ہے کہ ان سب لوگوں کو جو اس اصول سے اتفاق نہ کریں حلقہ خاص میں شامل نہ کیا جائے اور وہ قانون اخلاق کی خلاف ورزی کے مجرم قرار دیئے جائیں۔گاندھی جی کے بعض چیلوں پر اس لازمی طور پر یہ اثر ہوا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کو بہت مقدس سمجھنے لگے ہیں۔لیکن ہم میں جو لوگ اس قدر عقیدت نہیں رکھتے انہیں بہت سے شکوک اور شبہات ہیں۔ان شکوک کا تعلق جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں فوری ضروریات سے نہیں، بلکہ ذہنی ضرورت سے ہے کہ عمل کے لیے کوئی ایسا یک رنگ فلسفہ اختیار کیا جائے جو انفرادی نقطہ نظر سے اخلاقی قدر

بھی رکھتا ہو اور سماجی لحاظ سے بھی مفید اور موثر ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے دل میں ابھی یہ شکوک باقی ہیں اور اس مسئلے کا کوئی تشفی بخش حل سمجھ میں نہیں آتا۔ میں جبر اور تشدد کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ لیکن خود مجھ میں تشدد موجود ہے اور میں جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اکثر دوسروں پر جبر کرنا چاہتا ہوں اور پھر یہ سوال ہے کہ اس ذہنی جبر سے بڑھ کر اور کون سا جبر ہو سکتا ہے۔ جس سے گاندھی جی اپنے خاص پیرووں اور رفیقوں کے دماغ کو معطل کر دیتے ہیں۔

مگر اصل سوال یہ ہے کہ آیا قومیں اور جماعتیں اہنسا کے اس انفرادی اصول کو پوری طرح اختیار بھی کر سکتی ہیں کیونکہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب نوع انسانی بحیثیت مجموعی محبت اور نیکی کی بلند تر سطح پر پہنچ جائے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارا انتہائی نصب العین یہی ہونا چاہیے کہ انسانوں کو اس بلندی پر پہنچائیں۔ اور نفرت، شر اور خود غرضی کو مٹائیں۔ یہ امر بجائے خود بحث طلب ہے کہ کبھی ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں لیکن اس امید کے بغیر زندگی ایک بے معنی چیز بن جائے گی "کسی دیوانے کی کہانی جس میں شور ہی شور ہے مطلب کچھ نہیں۔" کیا اس مقصد کے حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم براہ راست ان اخلاقی خوبیوں کی تلقین کریں اور ان رکاوٹوں کا مطلق خیال نہ کریں جو اس کے راستے میں حائل ہیں اور اس کے مخالف رجحانات کو تقویت پہنچاتی ہیں؟ یا یہ بہتر ہوگا کہ پہلے ان رکاوٹوں کو دور کر کے ہم ایک زیادہ موزوں اور سازگار ماحول تیار کریں جس میں محبت، حسن اور خیر نشوونما پا سکیں؟ یا ان دونوں طریقوں کو ملانے کی ضرورت ہے؟

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا تشدد اور عدم تشدد، روحانی اثر اور جبر کی حد فاصل اس قدر صاف اور واضح ہے جیسا عام طور پر کہا جاتا ہے۔ بعض دفعہ اخلاقی قوت کا جبر جسمانی تشدد سے کہیں زیادہ سخت ہوتا ہے۔ کیا اہنسا اور حق ایک ہی چیز ہیں؟ حق کیا ہے؟ اس قدیم سوال کے ہزاروں جواب دیئے گئے ہیں اور پھر بھی یہ سوال آج

تک حل نہیں ہوا۔ لیکن خواہ اس کی ماہیت کچھ بھی ہو اس کو ہنسا کا ہم معنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تشدد بجائے خود بری چیز ہے لیکن لازمی طور پر خلاف اخلاق نہیں۔ اس کی بہت سی شکلیں اور بہت سے مدارج ہیں اور ممکن ہے کہ بعض حالات میں یہ اور طریقوں پر قابل ترجیح ہو۔ گاندھی جی نے خود کہا کہ تشدد بزدلی، خوف اور غلامی سے بہتر ہے اور اس فہرست میں اور بھی بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عام طور پر تشدد کا تعلق نفرت اور بدخواہی سے ہوتا ہے۔ لیکن کم سے کم نظری طور پر یہ کوئی لازمی تعلق نہیں۔ یہ بات قیاس میں آسکتی ہے کہ تشدد کی بنیاد خیر خواہی پر ہو (مثلاً ایک سرجن کا تشدد) اور جو چیز خیر خواہی پر مبنی ہو وہ اصولاً خلاف اخلاق نہیں ہوسکتی۔ اخلاق کا اصل معیار نیت کا اچھا یا برا ہونا ہے۔ لہذا اگر چہ تشدد اکثر اوقات اخلاقاً جائز ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کو خطرناک سمجھنا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔

زندگی میں جنگ اور تشدد کا دور دورہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً تشدد کا نتیجہ تشدد ہی ہوتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کو بالکل ترک کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ ایک بالکل ہی فلسفیانہ رویہ اختیار کیا جائے جو زندگی سے سراسر بے تعلق ہے۔ موجودہ حکومت اور نظام معاشرت کی بنیاد تمام تر تشدد پر ہے۔ ریاست کے تشدد کے بغیر نہ ٹیکس وصول ہو سکتے ہیں نہ زمینداروں کو اپنی زمینوں کا لگان مل سکتا ہے، نہ ذاتی ملکیت قائم رہ سکتی ہے۔ قانون فوجی قوت کی امداد سے ایک شخص کو دوسرے کو ذاتی ملکیت میں دخل دینے سے روکتا ہے۔ خود قومی ریاست کی بنیاد جارحانہ دفاعی تشدد اور مدافعانہ تشدد پر قائم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی کا اہنسا کا اصول محض ایک منفیانہ نظریہ نہیں ہے۔ یہ عدم مقاومت نہیں بلکہ بے تشدد معاومت ہے جو اس سے مختلف اور ایک مثبت اور موثر طریق کار ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے نہیں جو موجودہ حالات کو بے

چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ تو جاری ہی اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ سوسائٹی میں ایک ہیجان برپا کیا جائے اور اس طرح موجودہ حالات میں تبدیلی کی جائے۔ خواہ یہ روحانی اثر ڈالنے کی نیت سے جاری کی گیا ہو مگر عملاً یہ جبر کا ایک پر زور آلہ ثابت ہوا ہے اگرچہ یہ جبر بہت ہی مہذب اور معقول قسم کا تھا یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود گاندھی جی نے اپنی ابتدائی تحریروں میں ''جبر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کی اس تقریر پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جو انہوں نے پنجاب میں مارشل لا کے مظالم کے متعلق کی تھی وہ لکھتے ہیں۔

ہز اکسی لینسی نے کونسل کے افتتاح کے موقع پر جو تقریر کی، اس سے ایک ایسا ذہنی رجحان ظاہر ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی خود دار شخص کے لیے ان کے یا ان کی حکومت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنا ممکن نہیں۔ پنجاب کے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی تلافی کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم ''مستقبل'' قریب کے مسائل پر اپنی پوری توجہ صرف کریں! ہمارے لیے مستقبل کا فوری مسئلہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کو مجبور کریں کہ اس نے جو کچھ پنجاب میں کیا ہے اس پر پچھتائے اور اس کی تلافی کرے مگر اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ برخلاف اس کے ہز اکسی لینسی معترضوں کا جواب دینے سے بچنا چاہتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان تمام اہم مسائل میں جن کا تعلق ہندوستان کی قومی خودداری سے ہے۔ ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ تمام معاملات کو تاریخ کے فیصلے پر چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔ میری رائے میں اس قسم کے الفاظ سے ہندوستانیوں کو اور زیادہ اشتعال ہوگا۔ تاریخ کا فیصلہ ان غریبوں کے کس کام آئے گا جن پر ظلم کیا گیا ہے اور جو اب تک ایسے حکام کا پنجہ غضب میں گرفتار ہیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو اعتماد اور ذمہ داری کے عہدوں کا سراسر نا اہل ثابت کیا ہے؟ پنجاب کے ساتھ انصاف کرنے سے صریحاً انکار کرنا اور اس کے

ساتھ ساتھ تعاون عمل کی دعوت دینا سراسر ریا کاری ہے۔‘‘

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ حکومتوں کا قیام تشدد پر منحصر ہے اور یہ تشدد محض فوجی قوت کا کھلا ہوا تشدد ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک اور چھپا ہوا تشدد ہوتا ہے جس میں جاسوسوں، مخبروں، حکومت کے گرگوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مدرسوں اور اخباروں وغیرہ کے ذریعے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ مذہب اور دوسری قوتوں کا دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ افلاس اور فاقہ کشی سے کمر توڑ دی جاتی ہے۔ جہاں تک حکومتوں کے باہمی معاملات کا تعلق ہے، یہ بات مسلمہ ہے کہ نہ صرف جنگ کے زمانے میں بلکہ صلح کے زمانے میں بھی ہر قسم کا جھوٹ اور دغا بازی جائز ہے بشرطیکہ وہ پوشیدہ رہے۔ تین سو برس گزرے سر ہنری ووٹن نے جو شاعر تھے اور برطانوی سفیر بھی تھے۔ سفیر کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی کہ ’’وہ دیانت دار آدمی جو اپنے ملک کی خاطر جھوٹ بولنے کے لیے دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے‘‘ آج کل سفیروں کے ساتھ بہت سے فوجی، بحری اور تجارتی مددگار ہوتے ہیں جن کا کام ہی ہے کہ وہ ان ملکوں میں جاسوسی کریں جہاں وہ تعینات ہیں۔ ان کی مدد کے لیے خفیہ پولیس کا وسیع نظام ہوتا ہے جس کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کا جال دور دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ جس کے اپنے جاسوس الگ ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے جاسوسوں کا کاٹ کرنے والے الگ، جس میں جرائم پیشہ لوگوں سے کام لیا جاتا ہے، رشوت کے ذریعہ انسانی فطرت ذلیل کی جاتی ہے اور لوگ پوشیدہ طور پر قتل کرائے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں امن کے زمانے میں بھی کچھ کم نہیں ہوتیں لیکن جنگ میں ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور ان کا تباہ اثر ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے جو جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا، مخالف ملکوں کے متعلق جو غلط خبریں پھیلائی گئیں اور اس کام پر اور محکمہ جاسوسی پر جو بے اندازہ رقمیں صرف ہوئیں ان کا حال پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن آج کل امن بھی محض دو جنگوں کے درمیان کے وقفے اور

جنگ کی تیاری کا نام ہے اور اس زمانے میں بھی اقتصادی میدان اور دوسرے میدانوں میں لڑائی جاری رہتی ہے۔ فاتحوں اور مفتوحوں، شہنشاہی حکومتوں اور ان کی نوآبادیوں، لوٹنے والوں اور لٹنے والوں میں برابر ایک کش مکش رہتی ہے، غرض اس نام نہاد صلح میں بھی ایک حد تک جنگ کی فضا مع اپنے لوازم یعنی فریب وتشدد کے قائم رہتی ہے اور فوجی اور ملکی ملازموں کو اسی کی تربیت دی جاتی ہے۔ لارڈ ولزلی نے اپنی کتاب ''فیلڈ سروس کی پاکٹ بک'' میں لکھا ہے ''ہم اس عقیدے کو ہمیشہ دہراتے رہیں گے کہ دیانتداری سب سے بہتر پالیسی ہے اور جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ یہ جملے ایک بچے کی کاپی پر بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن جو شخص جنگ میں ان اصولوں پر عمل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنی تلوار میان میں رکھ لے۔''

آج کل قوموں اور جماعتوں میں جو اختلاف اور کشمکش ہیں ان کی وجہ سے سیاسی زندگی کا تشدد اور جھوٹ کی بنیاد پر قائم ہونا تقریباً ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے۔ جو قومیں اور جماعتیں دوسروں سے زیادہ حقوق رکھتی ہیں وہ اپنے حقوق کو قائم رکھنا اور دوسروں کی نشوونما کے مواقع کو روکنا چاہتی ہیں۔ لہٰذا وہ اس پر مجبور ہیں کہ تشدد جبر اور جھوٹ سے کام لیں۔ اس کا امکان ضرور ہے کہ جب رائے عامہ کا اثر زیادہ بڑھ جائے اور لوگ ان مخالفتوں اور رکاوٹوں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں تو اس تشدد میں کمی ہو جائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حال میں جو کچھ تجربہ اس بارے میں ہوا ہے اس سے برعکس نتیجہ نکلتا ہے اور جوں جوں موجودہ اداروں پر زیادہ زور کے ساتھ حملہ کیا گیا ان کا تشدد اور بڑھتا گیا۔ اگر کھلے ہوئے تشدد میں کچھ کمی بھی ہوئی تو اس نے زیادہ خطرناک اور پوشیدہ شکلیں اختیار کر لیں۔ تشدد کا یہ رجحان نہ تو اقلیت کی نشوونما سے رک سکا اور نہ مذہب واخلاق سے۔ بیشک بعض افراد نے انسانیت کی مدارج میں ترقی کی ہے اور اعلیٰ درجے کے نہ سہی مگر اوسط درجے کے لوگ پہلے

سے زیادہ ہیں ۔اس لحاظ سے سماج نے ترقی کی ہے اور ایک حد تک قدیم وحشیانہ جبلتوں پر قابو پانے کی کوشش بھی شروع ہوگئی ہے۔لیکن یہ افراد تک محدود ہے۔ جماعتوں اور گروہوں کے طرزِ عمل میں کوئی خوشگوار تغیر نہیں ہوا۔افراد کے مہذب ہو جانے سے ان کے بتہ سے ابتدائی جذبات اور برائیاں جماعت کی طرف منتقل ہوگئی ہیں اور چونکہ تشدد کو ہمیشہ وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو اخلاقاً کمتر درجے کے ہوں، اس لیے ان جماعتوں کے لیڈران کے بہترین اشخاص نہیں بن سکتے ۔لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ تشدد کی بدترین صورتیں رفتہ رفتہ دور ہو جائیں گی تو اس وقت بھی ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ حکومت اور سماجی زندگی دونوں کے قیام کے لیے جبر کی ضرورت ہے۔سماجی زندگی کے لیے کسی قسم کی حکومت ضروری ہے اور جو لوگ برسرِ حکومت ہوں وہ اس پر مجبور ہیں کہ وہ ان تمام انفرادی اور اجتماعی رجحانات کی روک تھام کریں جو سربسر خود غرضی پر مبنی ہیں اور جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔عموماً وہ اس معاملے میں ضرورت کی حد سے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ حکومت اور قوت کا خاصہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس کے اخلاق کو خراب اور پست کر دیتی ہے۔اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خواہ ان لوگوں کو آزادی سے کتنی ہی محبت ہو اور وہ جبر کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں ان کے لیے لازم ہے کہ وہ سرکشوں پر جبر کریں اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک ملک کے تمام افراد اخلاقی حیثیت سے کامل، بے غرض، بے نفس اور دل و جان سے فلاح عامہ کے طالب نہ بن جائیں۔حکومت کے اراکین کو ان بیرونی جماعتوں کے خلاف بھی جبر و تشدد سے کام لینا پڑے گا جو ملک پر حملہ کریں۔یعنی انہیں قوت کے مقابلے میں قوت استعمال کر کے اپنی مدافعت کرنا پڑے گی۔اس کی ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک ایک عالمگیر سلطنت قائم نہ ہوجائے۔

اگر قوت اور جبر بیرونی مدافعت اور اندرونی نظم و استحکام دونوں کے لیے

ضروری ہے تو اس کی حدود کس طرح قائم کی جائیں؟ جب کہ رائن ہولڈ نائی بور (۳) نے کہا ہے ''جب ایک دفعہ اخلاق کی طرف سے سیاست کو جبر کی اجازت دے دی جائے اور اسے سماجی استحکام کا ایک لازمی ذریعہ تسلیم کرلیا جائے تو تشدد آمیز اور بے تشدد جبر کے درمیان کوئی معین حد فاصل قائم نہیں جاسکتی اور حکومت کے جبر اور انقلاب پسندوں کے جبر میں بھی تمیز نہیں ہوسکتی''۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے کہ گاندھی جی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اس ناقص دنیا میں قومی ریاست کو بھی بیرونی طاقتوں کے حملوں کی مدافعت کے لیے تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ یقیناً ریاست کو اپنے ہمسایوں اور دوسری ریاستوں سے دوستانہ اور پرامن تعلقات کی توقع کرنی چاہیے۔ لیکن حملے کے امکان سے انکار کرنا سراسر مہمل بات ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کو کچھ جبری اور تشدد آمیز قوانین بھی پاس کرنے پڑیں گے یعنی ایسے قوانین جن سے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے کچھ حقوق اور مراعات ان سے چھین لیے جائیں گے اور ان کی آزادی عمل محدود ہو جائے گی۔ پھر کچھ نہ کچھ جبر و تشدد تو سبھی قوانین میں پایا جاتا ہے۔ کانگریس کے کراچی والے پروگرام کے مطابق ''عوام کی محنت سے جو ناجائز فائدہ اٹھایا جارہا ہے اسے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کی سیاسی آزادی کے مفہوم میں اس ملک کے کروڑوں فاقہ کش باشندوں کی حقیقی معاشی آزادی کو بھی شامل کیا جائے'' اس مناسب خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان لوگوں کو جنہیں آج ضرورت سے زیادہ مراعات حاصل ہیں اپنے حصے میں بہت کچھ انہیں دینا پڑے گا جو ان مراعات سے محروم ہیں۔ مزید برآں اس پروگرام میں یہ بھی ہے کہ مزدوروں کو کم سے کم اتنا ضرور ملنا چاہیے کہ ان کی زندگی بسر ہو سکے اور انہیں دوسری ضروری سہولتیں میسر آسکیں۔ نیز یہ کہ جائداد پر خاصے محاصل عائد کیے جائیں گے۔ ''ریاست بنیادی صنعتوں اور محکموں، معنی ذرائع دولت، ریلوے،

نہروں، جہازوں اور دوسرے ذرائع نقل وحمل کی یا خود مالک ہوگی یا ان پر نگرانی رکھے گی''۔ آبادی کی ایک کثیر تعداد اس کی مخالفت کرے گی۔ وہ اکثریت کی مرضی کو گوارا کریں گے لیکن اسی حالت میں جب ان کے دل میں نافرمانی کے نتائج کا خوف موجود ہوگا۔ دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔

اگر اکثریت کوئی ایسا قانون پاس کرتی ہے جس سے حقوق ملکیت پر اثر پڑتا ہے یا وہ بالکل منسوخ کر دیئے جاتے ہیں تو کیا اس پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ یہ جبر وتشدد ہے؟ ظاہر ہے اس قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی طریقہ تمام جمہوری قوانین کے پاس کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لیے جبر وتشدد کا الزام تو نہیں لگایا جا سکتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت غلطی پر ہے یا اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ پھر یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جس قانون کو اکثریت نے پاس کیا ہے وہ کسی اخلاقی اصول کے منافی تو نہیں لیکن اس کا فیصلہ کون کرے۔ اگر افراد اور جماعتوں کو یہ حق دے دیا جائے کہ اپنے مفاد کے مطابق اخلاقی قوانین کی تفسیر کر لیا کریں تو جمہوری طرز حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ذاتی طور پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے (اگر وہ ایک مقررہ حد سے بڑھ جائے) افراد کو جماعت کے مقابلہ میں مجموعی طور پر ایک خطرناک اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ جو جماعت کے لیے سخت مضر ہے میں اس اقتدار کو اخلاقی اصول کے خلاف اور شراب خوری سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے زیادہ نقصان فرد کو پہنچتا ہے نہ کہ جماعت کو۔

بعض لوگ عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ذاتی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس دلیل کو نہایت شد ومد کے ساتھ

وہ بڑے بڑے زمیندار میرے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جنہیں اپنے لگان کو حکومت کی امداد سے جبراً وصول کرنے میں مطلق باک نہیں اور وہ سرمایہ دار جو بیسیوں کارخانوں کے مالک ہیں اور جنہیں یہ گوارا نہیں کہ ان کے علاقے میں مزدور اپنی آزاد انجمنیں قائم کریں۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے۔ بلکہ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انہیں بھی راضی کر لینا چاہیے۔ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو چند ارباب غرض جب چاہیں اچھی سے اچھی تبدیلیوں کو جن کی ضرورت بالکل مسلم ہو، روک دیں گے۔

دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔ معاشی اغراض کے سامنے نہ عقلی دلائل کا زور چلتا ہے۔ نہ اخلاقی اصول کا۔ ممکن ہے افراد کے عقائد بدلے جا سکیں اور وہ اپنے امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائیں، اگرچہ یہ بھی شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ لیکن جماعتیں اور طبقے کبھی ایسا نہیں کرتے اس لیے ایسی سب کوششیں جن کا مقصد یہ تھا کہ امتیازی حقوق رکھنے والے طبقے کا عقیدہ بدل دیا جائے تاکہ وہ اپنے اقتدار اور ناجائز حقوق سے از خود دست بردار ہو جائے، ہمیشہ ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ سمجھیں کہ آئندہ اس قسم کی کوششیں کامیاب ہوں گی۔ رائن ہولڈ میبور اپنی کتاب (۴) میں ان معلمین اخلاق کی تردید کرتا ہے ''جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اقلیت کی ترقی یا مذہبی ہمدردی کی نشوونما سے لوگوں کی خود غرضی میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور انسانی جماعتوں اور گروہوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے بس یہی کافی ہے کہ اسی عمل ترقی کو جاری رکھا جائے۔'' وہ کہتا ہے ''یہ معلمین اخلاق اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ انسانی جماعت میں انصاف قائم کرنے کے لیے سیاسی جدوجہد بھی ضروری ہے کیونکہ انہیں یہ احساس

نہیں کہ انسان کے مجموعی عمل میں بعض طبیعی عناصر شامل ہیں جو کسی طور پر عقل یا ضمیر کے تابع نہیں ہو سکتے۔ وہ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ جب کوئی مجموعی قوت، چاہے وہ شہنشاہی کی شکل میں ظاہر ہو چاہے طبقوں کے اقتدار کی شکل میں کمزوروں سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیتی ہے تو اس کا توڑ قوت ہی سے ہو سکتا ہے۔'' ایک جگہ اور وہ لکھتا ہے ''چونکہ سماجی معاملات میں عقل ایک حد تک ہمیشہ اغراض کے تابع ہوتی ہے۔ اس لیے سماجی انصاف محض اخلاقی اور عقلی دلیلوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کے لیے جنگ کرنا لازمی ہو جاتا ہے اور اس جنگ میں قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کرنا پڑتا ہے''۔

اس لیے یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبہ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ بغیر موثر دباؤ ڈالے ہوئے یعنی بغیر جبر و تشدد سے کام لیے ہوئے کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھا لے گی۔ یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ گاندھی جی بھی موثر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں، اگرچہ وہ اس کو جبر و تشدد نہیں کہتے۔ ان کے نزدیک یہ دباؤ اپنی ذات پر تکلیف اٹھا کر ڈالا جا سکتا ہے۔ اس کا سمجھنا ذرا مشکل ہے کیونکہ اس میں ایک مابعد الطبیعاتی عنصر شامل ہے جو کسی مادی پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا حریف پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔ اس سے اس کی اخلاقی مزاحمت کی قوت کمزور ہو جاتی ہے، اس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا ہے، اس میں جو بہترین صفات ہیں وہ بیدار ہو جاتی ہیں اور مصالحت کے لیے دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ محبت سے پیش آنے اور اپنے اوپر تکلیف اٹھانے کا نفسیاتی اثر دشمن پر اور دیکھنے والوں پر بہت قوی ہوتا

ہے۔ اکثر شکاری اس بات سے واقف ہیں کہ ایک وحشی جانور کے نزدیک پہنچنے کے مختلف طریقوں سے کس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جانور جارحانہ انداز کو دور سے محسوس کر لیتا ہے اور اس کا اثر قبول کر لیتا ہے۔ اگر آدمی کے دل میں خوف کا شائبہ بھی پیدا ہو جسے وہ خود پوری طرح محسوس نہیں کرتا تو جانور کو کسی نہ کسی طرح اس کا علم ہو جاتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر حملہ کر دیتا ہے۔ اگر شیر کو سدھانے والے کی ہمت ایک لمحے کے لیے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے تو یہ خطرہ ہے کہ شیر فوراً حملہ کر دے گا۔ جو آدمی بالکل نڈر رہا ہے وحشی جانوروں سے گزند پہنچنے کا بہت کم احتمال ہوتا ہے سوا اس کے کوئی اتفاقی واقعہ پیش آ جائے، اس لیے یہ بالکل فطری بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان بھی اسی نفسی اثرات سے متاثر ہو۔ لیکن افراد پر اثر پڑنا اور چیز ہے، شبہ تو اس میں ہے کہ کسی طبقے یا جماعت پر بھی اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ جماعت من حیث الجماعت فریق مخالف سے ذاتی اور گہرے تعلقات نہیں رکھتی اور اسے جو خبریں پہنچتی ہیں وہ یک طرفہ اور مسخ شدہ ہوتی ہیں۔ بہر حال اسے دوسرے فریق پر جو اس کی قوت کو توڑنا چاہتا ہے۔ اس شدت سے غصہ آتا ہے کہ اور سب چھوٹے چھوٹے جذبات اس غصہ سے دب جاتے ہیں۔ وہ ایک مدت سے یہ سمجھنے کا عادی ہوتا ہے کہ اس اقتدار اور اس کے امتیازی حقوق سماج کے مفاد کے لیے ضروری ہیں اور اگر کوئی اس سے اختلاف کرے تو اسے کفر اور الحاد معلوم ہوتا ہے۔ نظم و امن اور موجودہ حالت کا قائم رکھنا اس کی نظر میں سب سے بڑی نیکی بن جاتا ہے اور اس کی مخالفت سب سے بڑا گناہ۔

اس لیے جہاں تک فریق مخالف کا تعلق ہے، عقائد کو بدلنے کی کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات تو اسے دوسروں کی نیکی اور نرمی پر اور بھی غصہ آتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس کا غلطی پر ہونا ظاہر ہوتا ہے اور جب آدمی کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہی غلطی پر ہے تو اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ جاتی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ

عدم تشدد کے طریقے سے مخالفوں کے چند افراد متاثر ہوتے ہیں اور مخالفت کی مجموعی قوت کم ہو جاتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ غیر جانبداروں کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے اور دنیا کی رائے رامہ پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اس بات کا امکان ہے کہ حکمراں طبقہ خبروں کو باہر نہ جانے دے یا ان کو مسخ کر دے کیونکہ اشاعت کے جتنے ذرائع ہیں وہ اسی کے قبضہ میں ہوتے ہیں اور وہ یہ کرسکتا ہے کہ لوگوں کو صحیح واقعات کا علم نہ ہونے دے۔ عدم تشدد کے طریقے کا سب سے قوی اور وسیع اثر اس ملک کے بے حس لوگوں پر پڑتا ہے۔ جہاں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے ان کے عقائد یقیناً بدل جاتے ہیں اور وہ اکثر نہایت جوش وخروش کے ساتھ تائید کرنے لگتے ہیں۔ لیکن انہیں ہم خیال بنانا کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ جو مقصد پیش نظر ہوتا ہے اس سے تو وہ متفق ہوتے ہیں۔ کسی نصب العین کے لیے تکلیفیں اٹھانا ہمیشہ اچھا سمجھا گیا ہے۔ اپنے مقصد کی خاطر سختیاں جھیلنے، ظلم وجور کا مقابلہ کرنے پر مگر ظالم سے انتقام نہ لینے میں وہ عظمت وشان ہے جو خواہ مخواہ دل پر اثر کرتی ہے۔ لیکن اس میں اور بے بسی کی مظلومی میں بہت ہی کم فرق ہے اور یہ بے بسی کی مظلومی بہت جلد ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور انسان کے لیے باعث ذلت بن جاتی ہے۔ اگر تشدد میں اس کا خوف ہے کہ انسان کو ایذا رسانی کا شوق نہ ہو جائے تو عدم تشدد کی منفی صورتوں میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اسے ایذا اٹھانے کا چسکا نہ ہو جائے اور پھر اس کا بھی امکان ہے کہ عدم تشدد اپنی کاہلی اور بزدلی کو چھپانے اور موجودہ حالت کو قائم رکھنے کا بہانہ بنا لیا جائے۔

پچھلے چند سال سے۔ جب سے ہندوستان میں بنیادی معاشرتی تبدیلیوں کے خیال نے اہمیت حاصل کی ہے، یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ اس قسم کی تبدیلی میں لازمی طور پر تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ اس لیے اس کی حمایت جائز نہیں۔ طبقوں کی جنگ کا (چاہے وہ آج بھی ہو) نام تک نہ لینا چاہیے اس لیے کہ اس سے ہمارے

اس خواب میں خلل پڑتا ہے کہ ہم سب طبقوں کے اتحادِ عمل سے بغیر تشدد کے رفتہ رفتہ آگے بڑھتے رہیں گے اور ایک روز کسی نہ کسی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے کہ سماجی مسئلے کے حل کرنے میں کسی وقت تشدد سے کام لینا ضروری ہو جائے کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ حقوق رکھنے والی جماعتیں اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے تشدد کے استعمال کرنے میں کبھی تامل نہ کریں گی۔ لیکن اصولاً اگر عدم تشدد کے طریقے سے ایک زبردست سیاسی تبدیلی کا پیدا کرنا ممکن ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس طریقے سے بنیادی سماجی تبدیلی پیدا کرنا ناممکن سمجھا جائے۔ اگر ہم عدم تشدد کے ذریعے سے سیاسی آزادی حاصل کر سکتے ہیں اور ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا خاتمہ کر سکتے ہیں تو اسی کے ذریعے سے جاگیرداروں اور زمینداروں کا مسئلہ اور دوسرے معاشرتی مسائل بھی حل کر سکتے ہیں اور اشتراکی ریاست بھی قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ واقعی یہ سب چیزیں عدم تشدد کے ذریعے سے حاصل کی جاسکتی ہیں یا نہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ یا تو عدم تشدد کے ذریعے سے دونوں مقصد حاصل ہو سکتے ہیں یا دونوں میں سے ایک بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ عدم تشدد کا طریقہ صرف ایک غیر ملکی حکمراں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ صریحی بات ہے کہ ملک کے اندر خود غرض طبقوں اور ترقی کے دشمنوں کے خلاف اسے استعمال کرنا زیادہ سہل ہے۔ کیونکہ اس پر اس کا نفسیاتی اثر کہیں زیادہ قوی ہوگا۔ البتہ جو لوگ تبدیلی سے ڈرتے ہیں ان پر اس کا اثر اتنا نمایاں نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں عدم تعاون اور سول نافرمانی کے اس تیزی سے پھیل جانے سے ثابت ہو گیا کہ کس طرح ایک بے تشدد تحریک بے شمار آدمیوں پر زبردست اثر ڈالتی ہے اور بہت سے لوگوں کو جو پہلے مذبذب تھے اپنا ہم خیال بنا لیتی ہے، لیکن جو لوگ سرے سے اس کے مخالف تھے ان کو تو یہ ہم خیال نہیں بنا سکی بلکہ اس تحریک کی کامیابی نے ان کے اندیشوں میں اور اضافہ کر دیا اور ان کی مخالفت اور بڑھ گئی۔

اگر اس بات کو ایک دفعہ تسلیم کر لیا جائے کہ ریاست کو اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے جبر و تشدد استعمال کرنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے جبر و تشدد سے کام لینا جائز نہ سمجھا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ تشدد کا طریقہ مصلحت کے خلاف ہو۔ لیکن اسے ناجائز اور ممنوع نہیں کہہ سکتے۔ محض اس لیے کہ حکومت برسر اقتدار فرقے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے قبضے میں ملک کی مسلح افواج ہیں، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے جبر و تشدد کے استعمال کا حق مل جاتا ہے جس سے وہ پہلے محروم تھی؟ اگر اس کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی جائے تو وہ اس کا مقابلہ کس طرح کرے گی؟ ظاہر ہے کہ وہ تشدد کے طریقے اختیار کرنے سے پرہیز کرے گی اور اس کی پوری کوشش کرے گی کہ پر امن طریقے سے کام چلائے۔ لیکن وہ تشدد کے استعمال کا حق تو نہیں چھوڑ سکتی۔ جو لوگ تبدیلی کے مخالف ہیں ان میں بہت سے غیر مطمئن اور شورش پسند عناصر ہوں گے جو پہلی حالت کی طرف لوٹنا چاہیں گے۔ اگر انہیں یہ خیال ہو گا کہ ان کے تشدد کو روکنے کے لیے نئی ریاست سختی سے کام نہیں لے گی تو وہ اور دل کھول کر تشدد کریں گے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تشدد اور عدم تشدد سے کام لینے اور عقائد پر اثر ڈالنے میں کوئی واضح حد فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یہ مشکل سیاسی تبدیلیوں کے مسئلے میں بھی ہوتی ہے لیکن جب امیروں اور غریبوں کی کش مکش کا سوال ہو تو اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان میں آج کل یہ رجحان ہے کہ کسی مقصد یا پالیسی کو محض اس لیے برا کہا جائے کہ وہ عدم تشدد کے منافی ہے۔ میرے خیال میں مسائل پر غور کرنے سے یہ بالکل الٹا طریقہ ہے۔ ہم نے پندرہ سال ہوئے عدم تشدد کو اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنے کا سب سے معقول اور موثر طریقہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہمارا مقصد عدم تشدد سے جدا تھا۔ صرف اس کا ضمیمہ یا نتیجہ نہ تھا۔ اس وقت کسی شخص کے منہ سے یہ بات نہیں نکلی تھی کہ آزادی اور مکمل خود مختاری کی کوشش صرف اسی صورت

میں کرنی چاہیے جب یہ عدم تشدد کے طریقوں سے حاصل ہوسکیں۔لیکن اب خود ہمارا مقصد عدم تشدد کے معیار پر رکھا جاتا ہے اور اگر اس کے مطابق نہ نکلے تو رد کردیا جاتا ہے۔غرض عدم تشدد کا تخیل ایک اٹل عقیدہ بنتا ہے جس پر کبھی کسی قسم کا اعتراض کرنے کی اجازت نہیں ہے۔اسی لیے عقل کے نزدیک اس کی روحانی کشش زائل ہوتی جاتی ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ مذہب کی مثل میں نتھی ہوکر داخل دفتر کردیا جائے گا۔یہی نہیں بلکہ یہ مستقل حقوق رکھنے والوں کی کشتی کے لیے لنگر کا کام دے رہا ہے۔اس سے فائدہ اٹھا کر وہ موجودہ حالت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ بات بہت قابل افسوس ہے کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے لیے عدم تشدد کا اصول اور بے تشدد جنگ کا طریق عمل بہت مفید ہے اور گاندھی جی نے لوگوں کے خیالات اس کی طرف متوجہ کرکے زبردست خدمت انجام دی ہے۔مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ہوسکتا ہے کہ بنی نوع انسان انہیں مکمل طور پر اختیار کرنے کے لیے ابھی تک تیار نہ ہو۔اے۔ ای کے ڈرامے Interpreters میں ایک شخص کہتا ہے کہ ''تم اندھے کے ہاتھ میں شمع دیتے ہو لیکن وہ اس سے سونٹے کے سوا اور کیا کام لے سکتا ہے؟'' تو یہ ممکن ہے کہ ابھی اس شمع کی روشنی زیادہ نہ پھیلے لیکن تمام بڑے خیالات کی طرح اس کا اثر رفتہ رفتہ بڑھے گا اور ہمارے اعمال کو روز بروز متاثر کرے گا۔عدم تعاون یعنی اس حکومت یا جماعت سے جو بری سمجھی جاتی ہے کسی قسم کا تعاون نہ کرنا بڑا قوی اور موثر اصول ہے۔معدودے چند اخلاقی قدر رکھنے والے اشخاص بھی عمل کریں تو اس کا اثر پھیلتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔جب زیادہ تعداد میں لوگ اسے اختیار کرلیتے ہیں تو اس کا ظاہری اثر اور بھی نمایاں ہوجاتا ہے لیکن بعض خارجی چیزیں اس کے اخلاقی پہلو دھندلا کردیتی ہیں۔جب اس کا دائرہ وسیع کیا جاتا ہے تو اس کی شدت کم ہو جاتی ہے مجموعی ذہنیت رفتہ رفتہ شخصی ذہنیت پر غالب آجاتی ہے مگر خالص عدم تشدد پر

جو زور دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے یہ چیز زندگی سے جدا اور دور ہو گئی ہے اور لوگ یا تو اسے آنکھ بند کر کے مذہبی عقیدے کے طور پر قبول کر لیتے ہیں یا بالکل نہیں کرتے۔ ذہنی عنصر بالکل دب کر رہ گیا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اس کا تخویف پسندوں پر بڑا اثر پڑا تھا۔ ان میں سے بہت سے اس گروہ سے نکل آئے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ بھی شبہ میں پڑ جانے کی وجہ سے سست ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے تشدد آمیز مشاغل کو روک دیا تھا۔ لیکن اب ان پر اس کا یہ اثر نہیں ہے۔ خود کانگرس کے اندر ایک اہم جماعت جس نے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور ایمانداری کے ساتھ عدم تشدد کے طریقے کی شرائط پوری کرنے کی کوشش کی اب ملحد اور منکر سمجھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسے کانگریس میں رہنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ اس کے لیے تیار نہیں کہ عدم تشدد کو اپنا دین و ایمان مانے اور اس مقصد کو ترک کر دے جو اسے دل سے عزیز ہے۔ یعنی اشتراکی ریاست، جس میں سب کے ساتھ یکساں انصاف کیا جائے اور ہر شخص کو برابر کے حقوق دیئے جائیں، ایک منظم سوسائٹی جس کے قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ موجودہ امتیازی حقوق اور ملکیت کے حقوق میں سے اکثر منسوخ کر دیئے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی تک گاندھی جی کا بہت بڑا اثر ہے، ان کے عدم تشدد میں حرکت اور جارحانہ کیفیت پائی جاتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس روز وہ ملک میں برقی لہر دوڑا کر ترقی کی جدوجہد شروع کر دیں گے۔ وہ اپنی عظمت اور متضاد خصوصیات اور عوام میں حرکت پیدا کرنے کی غیر معمولی قوت کی وجہ سے عام معیاروں سے بہت بلند ہیں۔ ان کو ہم اس پیمانے سے نہیں ناپ سکتے جس سے دوسروں کو ناپتے ہیں لیکن بہت سے لوگوں میں ان کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس قسم کی نکمی صلح پسندی اور عدم مزاحمت کی جھلک نظر آتی ہے۔ جس کی تعلیم ٹالسٹائی نے دی ہے یا وہ ایک تنگ خیال فرقے کے رکن بن کر رہ جاتے ہیں جنہیں زندگی اور واقعات سے لگاؤ تک

نہیں۔ ان لوگوں کے گرد بہت سے وہ لوگ جمع ہو جاتے ہیں جن کا مفادہ موجودہ نظام کے قائم رکھنے سے وابستہ ہے اور جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عدم تشدد کی آڑ لیتے ہیں۔ اسی طرح زمانہ سازی اور مصلحت پرستی کا قدم درمیان میں آ جاتا ہے، مخالف کو ہم خیال بنانے کی کوشش کا انجام عدم تشدد کی بدولت یہ ہوتا ہے کہ آدمی خود دشمن کا ہم خیال بن کر اسی طرف سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ جب ہمارا جوش گھٹتا ہے اور ہم کمزور ہونے لگتے ہیں تو ہم پیچھے ہٹنے اور مصالحت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اپنا جی خوش کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ دشمن کو پرچا رہے ہیں۔ اور بعض وقت یہ کامیابی ہم اپنے پرانے رفیقوں کو قربان کر کے حاصل کرتے ہیں۔ ہم ان کی انتہاپسندیوں اور ان کے ان بیانات کی جو ہمارے نئے دوست کو ناگوار ہوں مذمت کرتے ہیں اور ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے ہم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ سماجی نظام میں بنیادی تبدیلی کی جگہ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ موجودہ نظام میں فراخ دلی اور احسان ومروت پیدا کر کے اس کی اصلاح کی جائے۔ اور اونچے طبقوں کے مستقل حقوق بدستور قائم رہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ گاندھی جی نے وسائل کی اہمیت پر زور دے کر ہماری بہت خدمت انجام دی ہے مگر اس کے باوجود میری یہ قطعی رائے ہے کہ مقصد کو وسائل سے زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ جب تک ہم اس بات نہیں سمجھیں گے اس وقت تک اس رہرو کی طرح بھٹکتے پھریں گے جس کی کوئی منزل نہ ہو اور اپنی قوتوں کو ضمنی زور غیر اہم مسائل پر ضائع کرتے رہیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ذرائع کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اخلاقی پہلو سے قطع نظر ان کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ برے اور غیر اخلاقی ذرائع اختیار کرنے سے اکثر اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اور نہایت زبردست نئی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کسی شخص کے متعلق صحیح رائے اس کے مقصد کے لحاظ سے نہیں بلکہ ذرائع کے لحاظ سے قائم کی جاتی ہے جو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔

اگر ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا ہوں اور دلوں میں نفرت بڑھے تو راہ کی مشکلات بڑھتی جائیں گی اور منزل مقصود دور ہوتی جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مقاصد اور ذرائع کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں اس لیے لازمی طور پر ذرائع ایسے ہونے چاہئیں جن سے مخالفت اور نفرت نہ پیدا ہو یا کم سے کم ایک حد سے آگے نہ بڑھے (کیونکہ اس کا پیدا ہونا تو ناگزیر ہے) اور باہمی محبت کو ترقی ہو، غرض سوال کسی خاص طریقے کے اختیار کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ محض نیت، ارادے اور مزاج کا ہے چنانچہ گاندھی جی کا زور بھی نیک نیتی پر ہے اور اگر انہیں ایک طرف انسانی فطرت کے بدلنے میں ناکامیابی ہوئی تو دوسری طرف ایک ایسی بڑی تحریک میں، جس میں لاکھوں آدمی شریک تھے یہ نیک نیتی پیدا کرنے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ سخت اخلاقی ضبط و انضباط پر انہوں نے جو زور دیا وہ بہت ضروری تھا اگرچہ ان کے انفرادی ضبط کے معیار کو شاید ہر شخص تسلیم نہ کرے۔ وہ انفرادی گناہوں اور کمزوریوں کو بہت زیادہ اور معاشرتی گناہوں کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ اس ضبط کی ضرورت بالکل واضح ہے کیونکہ مصیبت اور تکلیف کی زندگی کو چھوڑ کر ارباب اقتدار میں شامل ہونے کے لالچ نے بہت سے کانگریسیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ ہر مشہور کانگریسی کے لیے اس دنیاوی جنت کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔

ساری دنیا آج مختلف قسم کی کش مکش میں نظر آتی ہے لیکن ان میں سب سے سخت روحانی کش مکش ہے۔ مشرق میں یہ کش مکش خاص طور پر نمایاں ہے۔ کیونکہ ایشیا کے ملکوں میں جو تبدیلیاں حال میں ہوئی ہیں ان کی رفتار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ تیز تھی، اس لیے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنا یہاں اور زیادہ تکلیف دہ ہے۔ سیاسی مسئلہ جو اس وقت سب پر حاوی نظر آتا ہے نسبتاً سب سے کم اہمیت رکھتا ہے۔ گو ہمارے لیے یہ مسئلہ سب سے مقدم ہے اور دوسرے اہم تر

مسائل کو حل کرنے سے پہلے اس کا قابل اطمینان تصفیہ ہونا ضروری ہے۔گذشتہ کئی قرنوں سے ہم ایک غیر تغیر پذیر سماجی نظام کے عادی ہیں۔ہم میں سے بہت سے لوگوں کا ابھی تک یہ عقیدہ ہے کہ صرف یہی نظام صحیح اور قابل عمل ہے،لیکن ماضی اور حال میں مطابقت پیدا کرنے کی جو کوششیں اس طرح کی جاتی ہیں وہ لازمی طور پر ناکام رہتی ہیں۔امریکہ کے ماہر معاشیات ویبلن نے لکھا ہے کہ ''معاشی اخلاق اصل میں معاشی ضروریات کا تابع ہے''۔ موجودہ زمانے کی ضروریات ہمیں مجبور کریں گی کہ ہم ان کے مطابق ایک نیا نظام مرتب کریں اگر ہمیں اس روحانی کش مکش سے نجات پانا ہے اور اس بات کو دریافت کرنا ہے کہ صحیح روحانی معیار کے مطابق آج کل کون سی قدریں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں تو ہمیں ان مسائل پر جرات اور دلیری کے ساتھ غور کرنا پڑے گا مذہبی عقیدوں کی آڑ میں پناہ لینے سے کام نہیں چلے گا۔مذہب کی تعلیم اچھی ہو یا بری لیکن اس کا طریقہ تعلیم اور اس کا یہ مطالبہ کہ ہم اس کے اصولوں کو آنکھ بند کر کے مان لیں ہمیں کسی مسئلے پر عقلی نقطہ نظر سے غور ہی نہیں کرنے دیتا، بہ قول فرائڈ کے'' مذہب کے اذعانی عقائد کو مان لینا چاہیے کیونکہ اول تو ہمارے آباؤ اجداد انہیں ابتدا سے مانتے آئے ہیں، دوسرے ہمارے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں جو اسی قدیم زمانے سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں، تیسرے ہمیں ان کے بارے میں چون و چرا کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔'' (۵)

اگر ہم عدم تشدد اور اس کے تمام لوازمات کو مذہب کے اذعانی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اس میں دلیل اور بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔اس کی حیثیت ایک تنگ نظر فرقے کے معتقدات کی سی ہو جاتی ہے اور نہ اسے موجودہ مسائل سے تعلق رہتا ہے لیکن اگر ہم موجودہ حالات کی روشنی میں اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں دنیا کی ازسرنو تشکیل کرنے میں اس سے بہت مدد ملے گی۔اس صورت میں ہمیں

ایک انسانی جماعت کی فطرت اور کمزوریوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کوئی تحریک جو عوام میں پھیلائی جائے خصوصاً ایسی تحریک جس کا مقصد بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کرنا ہو، صرف لیڈروں کی ذہنیت سے متاثر نہیں ہوتی، بلکہ اس پر عام حالات کا اور اس سے بھی زیادہ ان لوگوں کے خیالات کا اثر پڑتا ہے جن سے وہ کام لیتی ہے۔

تشدد کا دنیا کی تاریخ میں بہت اہم حصہ رہا ہے۔ آج بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی، شاید ایک عرصے تک کم نہیں ہوگی۔ ماضی کی اکثر تبدیلیاں تشدد اور جبر کے ذریعے ہوئی ہیں۔ ڈبلیو۔ ای۔ گلیڈ اسٹون نے ایک دفعہ کہا تھا ''مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس ملک کے لوگوں کی سیاسی بے چینی کے زمانے میں صرف یہی وعظ سنایا جاتا کہ تشدد سے نفرت کرو، ظلم و امن سے محبت کرو اور صبر سے کام لو تو ملک کو کبھی آزادی نصیب نہ ہوئی ہوتی۔''

جبر و قوت کو جو اہمیت حاصل رہی ہے اور اب بھی حاصل ہے اس سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ اس سے انکار کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم زندگی کی حقیقتوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ تاہم تشدد بری چیز ہے۔ اور اس سے بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہے اور تشدد سے بھی بدتر نفرت، ظلم، انتقام اور سزا کے وہ جذبے ہیں جو اکثر اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو تشدد بجائے خود اتنی بری چیز نہیں ہے جتنے اس کے یہ لوازم۔ تشدد ان جذبوں سے پاک بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا استعمال اچھے مقصد کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے اور برے مقاصد کے لیے بھی۔ لیکن اسے ان جذبوں سے پاک رکھنا سخت دشوار ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس سے پرہیز کیا جائے مگر تشدد سے پرہیز کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی اس سے بدتر چیزوں کو برداشت کرے۔ دوسروں کے تشدد کے آگے سر جھکانا یا کسی غیر منصفانہ نظام حکومت کو قبول کرنا جس کی بنیاد تشدد پر قائم ہے، عدم تشدد کے اصول کے قطعاً منافی ہے۔ عدم تشدد کا طریقہ اسی جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب اس میں

حرکت ہو اور غیر منصفانہ حکومت یا نظام جماعت کو بدلنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ عدم تشدد میں اس کی قابلیت ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ ہمیں ترقی کے مرحلے طے کرنے میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے مگر اس میں مجھے شبہ ہے کہ یہ ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ بہر حال جبر کی کوئی نہ کوئی شکل ناگزیر ہے کیونکہ جو لوگ اقتدار اور حقوق کے مالک ہوتے ہیں انہیں اس وقت نہیں چھوڑتے جب تک وہ اس پر مجبور نہ کئے جائیں یا جب تک ایسے حالات نہ پیدا کر دیئے جائیں کہ ان کے لیے ان حقوق کا نہ چھوڑنا چھوڑنے سے زیادہ مضر ہے۔ سماج کی موجودہ کش مکش یعنی قومی جنگ اور طبقوں کی جنگ کا تصفیہ بجز جبر کے اور کسی صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک معاشرتی تبدیلی کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہو سکے گی لیکن اس کے بعد اشخاص پر جبر کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس بنیادی اختلاف پر پردہ ڈال دیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ اس قسم کے اختلافات کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے ہم نہ صرف حق کو چھپانے کے مجرم ہوں گے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اصل واقعات سے ناواقف رہیں گے، موجودہ نظام کو ایک سہارا مل جائے گا اور حکمراں طبقوں کو اپنے امتیازی حقوق کے لیے ایک اخلاقی بنیاد ہاتھ آ جائے گی جس کی وہ ہمیشہ تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام سے جنگ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان غلط مفروضات کی تردید کی جائے جن پر اس کا دارومدار ہے اور حقیقت بے نقاب کر دی جائے۔ تحریک عدم تعاون کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان جھوٹے مفروضات کی قلعی کھول دیتی ہے اور ہماری اس کوشش کو تقویت پہنچاتی ہے کہ ہم انہیں تسلیم کرنے اور ان سے اشتراک کرنے سے انکار کر دیں۔

ہمارے پیشِ نظر ایک ایسی سماج ہے جس میں مختلف طبقوں کا فرق مٹ جائے، معاشی معاملات میں سب کے ساتھ یکساں انصاف برتا جائے اور سب کو یکساں موقع دیا جائے۔ ایک منظّم سماج، جس کا مقصد یہ ہو کہ بنی نوع انسان بلند تر مادی اور تمدنی سطح پر پہنچ سکے اور اس میں روحانی صفات یعنی اشتراکِ عمل، بے غرضی، خدمتِ خلق، حق پسندی، ہمدردی اور محبت نشوونما پا سکیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ایک دن اس طرح کا ایک عالمگیر نظام قائم ہو جائے۔ اس راہ میں جو چیز حائل ہو اسے ہٹانا پڑے گا۔ اگر ممکن ہو تو نرمی سے ورنہ مجبوراً سختی سے۔ یہ یقینی بات ہے کہ جبر کی ضرورت اکثر پیش آئے گی۔ لیکن اگر قوت کا استعمال کیا جائے تو وہ نفرت اور ظلم کے جذبے کے ساتھ نہ ہونا چاہیے بلکہ ٹھنڈے دل سے محض رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے، ظاہر اس میں سخت دشواری پیش آئے گی۔ منزل بڑی کٹھن ہے اور قدم قدم پر لغزش کا اندیشہ ہے مگر ان مشکلات کا علاج یہ نہیں کہ ہم ان کو نظر انداز کر دیں بلکہ یہ ہے کہ ہم ان کی حقیقت کو سمجھیں اور بہادری سے ان کا مقابلہ کریں۔ بظاہر یہ باتیں خیالی اور دور از کار معلوم ہوتی ہیں اور یقین نہیں آتا کہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت میں یہ اعلیٰ جذبات پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن ہمیں انہیں پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور ان پر زور دیتے رہنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان نفرتوں اور تلخیوں میں کمی واقع ہو جائے جن سے ہمارے دل بھرے ہوئے ہیں۔

ہمارا طریقہ وہی ہونا چاہیے جو ہمیں اس منزل تک پہنچا سکے اور ان جذبات پر مبنی ہو۔ لیکن ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ انسان کی فطرت اجتماعی کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے عام لوگ ہمیشہ ہماری تعلیم و تلقین پر دھیان نہیں دیں گے اور اعلیٰ اخلاقی اصول پر عمل نہ کریں گے اس لیے لوگوں کے خیالات پر اثر ڈالنے کے علاوہ ہمیں اکثر جبر سے بھی کام لینا پڑے گا زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اس جبر کو محدود رکھیں اور اس سے اس طرح کام لیں کہ اس کی خرابیاں کم ہو جائیں۔

۱: یہ اقتباس گاندھی جی کے ایک بیان سے لیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے ایک برت کے موقع دسمبر ۳۲ء کو دیا تھا۔

۲: رچارڈ۔ ب۔ گریگ نے اپنی کتاب ''عدم تشدد کی قوت'' میں اس مسئلے پر علمی بحث کی ہے ان کی کتاب بہت دلچسپ اور محرک فکر ہے۔

۳: اپنی کتاب ''نیک فرد اور بد جماعت'' میں

۴: Moral man immoral Socitey

۵: The Future of an illusion

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

پھر دہرہ جیل میں

علی جیل میں میری صحت اچھی نہیں تھی۔ میرا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور کلکتے کی ہوا اور گرمی سے تکلیف ہو رہی تھی۔ کچھ دن سے یہ افواہیں سننے میں آتی تھیں کہ میری بدلی کسی بہتر آب و ہوا کے مقام پر ہو جائے گی۔ ۷ مئی کو مجھے حکم دیا گیا کہ اپنا بوریا بند سنبھال کر یہاں سے چل دو۔ معلوم ہوا کہ دہرہ دون جیل میں بھیجا جا رہا ہوں۔ کئی مہینے کال کوٹھڑی میں بند رہنے کے بعد شام کے ٹھنڈے وقت گاڑی میں کلکتے کی گلیوں سے گزرنا بہت بھلا معلوم ہوا اور رہوڑے کے اسٹیشن پر لوگوں کو مجمع دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

میں اپنی بدلی سے خوش تھا اور مجھے دہرہ دون پہنچنے کا اشتیاق تھا جہاں سے پہاڑ اس قدر قریب ہیں۔ وہاں آ کر معلوم ہوا کہ جو حالت اب سے نو مہینے پہلے میری نینی جاتے وقت تھی وہ اب نہیں ہے۔ اب میں ایک نئی جگہ رکھا گیا۔ یہ ایک مویشیوں کے باندھنے کا سائبان تھا جس کی صفائی اور درستی کر لی گئی تھی۔

جیل کی کوٹھڑی کی حیثیت سے یہ اچھی خاصی جگہ تھی اس سے ملا ہوا کوئی پچاس فٹ لمبا صحن بھی تھا۔ یہ اس کوٹھڑی سے جو مجھے دہرہ دون میں پہلی بار ملی تھی بہتر تھی مگر تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس میں بہت سی خرابیاں بھی ہیں۔ چار دیواری جو پہلے دس فٹ اونچی تھی خاص طور پر میرے لیے چار پانچ فٹ اور اونچی کر دی گئی تھی۔ پہاڑ کا منظر جس کا مجھے اس قدر اشتیاق تھا بالکل چھپ گیا تھا۔ صرف چند درختوں کی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ میں تین مہینے سے زیادہ اس جیل میں رہا اور مجھے پہاڑوں کی ایک جھلک تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ پہلی بار مجھے جیل کے دروازے کے سامنے ٹہلنے کی اجازت تھی مگر اب وہ بھی نہیں رہی۔ کوٹھڑی کے کے ساتھ چھوٹا سا صحن میری ورزش کے لیے کافی سمجھا گیا۔

یہ اور اسی قسم کی اور بندشیں بہت مایوس کن تھیں اور میں ان سے دق آ گیا'

طبیعت میں ایک مٹھاپن سا پیدا ہو گیا اور جو تھوڑی بہت میرے لیے ورزش جائز رکھی گئی تھی اس کے کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کبھی تنہائی کا اور دنیا سے بے خبر ہونے کا اس قدر احساس نہیں ہوا تھا جتنا اس مرتبہ ہو رہا تھا۔ اس قید تنہائی کا اثر میرے اعصاب پر پڑنے لگا اور میرے جسم اور دماغ کی قوت گھٹنے لگی۔ میں خوب جانتا تھا کہ دیوار کے پار صرف چند فٹ کے فاصلہ پر تازگی اور فرحت کا سماں چھایا ہوا ہوا۔ ہری ہری گھاس اور نرم نرم مٹی کی ٹھنڈی خوشبو آ رہی ہو گی، دور دور تک منظر نظر آ رہا ہو گا۔ مگر یہ سب چیزیں میری پہنچ سے باہر تھیں اور میری آنکھیں ان دیواروں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ جیل کی معمولی زندگی کی چہل پہل بھی نہیں تھی۔ اس لیے کہ میں اور قیدیوں سے الگ رکھا گیا تھا۔

چھ ہفتے کے بعد برسات شروع ہو گئی۔ اب ہوا کچھ اور ہی ہو گئی اور اس میں نئی زندگی کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ حرارت کے کم ہونے سے جسم کو تو آرام ملا مگر آنکھوں کو اور دل کو چین نہ آیا۔ کبھی کبھی میرے احاطے کا پھاٹک کسی پہرے والے کے آنے جانے کے لیے کھلتا اور مجھے دم بھر کو باہر کی دنیا کی ایک جھلک نظر آ جاتی۔ ہرے بھرے کھیتوں اور درختوں کے شوخ رنگ اور ان پر موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے شبنم کے قطرے مگر یہ صرف چند لمحے کا نظارہ ہوتا جو بجلی کی طرح کوند کر چھپ جاتا۔ پورا دروازہ شاید ہی کبھی کھلتا ہو۔ غالباً پہرے والوں کو حکم تھا کہ اگر میں کہیں آس پاس موجود ہوں تو دروازہ ہرگز نہ کھلنے پائے اور جب کھلے بھی تو بس تھوڑا ہی سا۔ سبزی اور شادابی کی یہ جھلک دیکھ کر مجھے تسکین نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک درد سا دل میں اٹھتا تھا یہاں تک کہ بعض اوقات دروازہ کھلتا تو ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی۔

اصل میں یہ ساری اداسی جیل کی وجہ سے نہیں تھی، اگرچہ اس کا بھی اس میں کچھ حصہ تھا۔ یہ باہر کے واقعات، کملا کی بیماری اور میری سیاسی پریشانیوں کا ردعمل تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ کملا کو پھر پرانی بیماری نے آلیا ہے۔ اور میں اپنی بے بسی پر

کڑھتا تھا کہ اس کی کوئی خدمت نہیں کرسکتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اسے بہت تقویت پہنچتی۔

بہ خلاف علی پور کے، دہرہ دون جیل میں مجھے ایک روزانہ اخبار کو پڑھنے کو ملتا تھا۔ باہر کے سیاسی واقعات اور دوسرے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ تقریباً تین سال کے بعد (اس مدت کے بہت بڑے حصے میں وہ خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی) پٹنے میں ہوا تو اس کی کارروائی بہت مایوس کرنے والی تھی۔ مجھے سخت تعجب تھا کہ ہندوستان میں اور ساری دنیا میں اتنا کچھ ہو چکنے کے بعد اس پہلے جلسے میں صورت حال کا جائزہ لینے اور واقعات پر مفصل بحث کر کے پرانی لیکھ سے ہٹنے کی کوشش کوئی نہیں کی گئی۔ گاندھی جی دور سے دیکھنے میں اپنی قدیم تحکمانہ شان میں نظر آرہے تھے۔ ان کا قول تھا کہ ''اگر تم میرے پیچھے چلنا چاہتے ہو تو تمہیں میری شرطیں ماننی پڑیں گی۔'' یہ مطالبہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک تھا اس لیے کہ اگر انہیں ساتھ لینا تھا تو ان سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اپنی دلی عقیدوں کے خلاف عمل کریں، مگر معلوم ہوتا تھا کہ حکم منوانے پر بہت زیادہ زور دیا جارہا ہے اور آپس کے مشورے سے ایک پالیسی تجویز کرنے پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ یہ عجب بات ہے کہ گاندھی جی دلوں پر اپنی مرضی کا سکہ بٹھا دیتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ لوگ خود کچھ نہیں کرسکتے۔ میرے خیال میں بہت کم شخصوں کو جمہور کی عقیدت اور اطاعت اس حد تک نصیب ہوئی تھی جتنی انہیں حاصل ہے۔ اور لوگوں کو اس وجہ سے قصوروار ٹھہرانا کہ وہ ان کے اونچے معیار تک نہیں پہنچ سکتے، بے انصافی ہے۔ پٹنے کے جلسے میں گاندھی جی آخر تک ٹھہرے بھی نہیں اس لیے کہ انہیں اپنا ہریجنوں کی اصلاح کا دورہ جاری رکھنا تھا۔ انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو رائے دی کہ مستعدی سے کام کرے اور ورکنگ کمیٹی نے جو ریزولیشن بھیجے ہیں انہیں جلدی سے نبٹا دے کر یہ کہہ کر وہ چل دیئے۔

مگر غالباً زیادہ طول طویل بحث سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ کمیٹی کے ممبروں کے خیالات الجھے ہوئے تھے اور وہ معاملات کو وضاحت سے نہیں سوچ سکتے تھے۔ اعتراض کرنے کو تو بہت سے لوگ تیار تھے مگر تعمیری تجویز ایک بھی پیش نہیں ہوئی۔ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے یہ قدرتی بات تھی اس لیے کہ تحریک نافرمانی کا سارا بوجھ انھیں لوگوں پر جو مختلف صوبوں کے لیڈر تھے پڑا تھا اور ان کے جسم اور دماغ بھٹکے ہوئے تھے۔ اس بات کا ایک دھندلا سا احساس سب کو تھا کہ سول نافرمانی کو روک دینا چاہیے۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس کے بعد کیا کیا جائے؟ لوگوں کے دو فریق ہو گئے تھے ایک تو یہ چاہتا تھا کہ کونسلوں کے ذریعے سے خالص آئینی جدوجہد کی جائے اور دوسرا کچھ دھندلے سے اشتراکی خیالات رکھتا تھا۔ ممبروں کی بہت بڑی تعداد دونوں فریقوں میں سے کسی میں شریک نہیں تھی۔ وہ آئینی طریقوں کی طرف لوٹنا پسند نہیں کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ اشتراکیت سے بھی ڈرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ ان میں پھوٹ پیدا کر دے گی۔ یہ لوگ کوئی تعمیری خیالات نہیں رکھتے تھے اور انہیں جو کچھ امید تھی اور جو کچھ سہارا تھا وہ گاندھی جی کی ذات سے تھا۔ پہلے کی طرح وہ ان کی طرف مڑ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ حالانکہ وہ ان کی رائے سے پوری طرح متفق نہیں تھے گاندھی جی کی مدد سے اعتدال پسند اور آئین پسند حضرات کو کمیٹی میں اور کانگرس میں غلبہ حاصل ہو گیا۔

ان سب باتوں کی پہلے ہی سے توقع تھی کہ ان کے ردعمل سے کانگرس اس قدر پیچھے ہٹ گئی جس کا مجھے خیال بھی نہیں تھا۔ پچھلے پندرہ سال میں یعنی ترک موالات کی تحریک کے بعد سے کانگریس کے لیڈروں نے اس قدر آئین پسندی کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ پرانی سوراج پارٹی بھی جو خود ردعمل کا نتیجہ تھی، ان نئے لیڈروں سے بہت آگے تھی اور پھر ان میں ایسی زبردست شخصیتیں بھی نہیں تھیں جیسی سوراج پارٹی میں تھیں۔ بہت سے لوگ جو کانگریس کی تحریک سے جب تک اس

میں شریک ہونا خطرناک تھا۔ دور دور ہی رہتے تھے اب آموجود ہوئے اور انہیں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔

گورنمنٹ نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دینے کا حکم منسوخ کر دیا اور وہ ایک جائز انجمن بن گئی۔ مگر اس کی بہت سی ملحقہ اور ماتحت جماعتیں مثلاً سیوا دل، کسان سبھائیں اور تعلیمی ادارے اور نوجوان سبھائیں جن میں بچوں کی ایک انجمن بھی شامل تھی۔ بدستور خلاف قانون تھیں۔ خصوصاً خدائی خدمتگار جو سرحد کے سرخ پوش کہلاتے تھے، اب تک قانون کے باغی سمجھے جاتے تھے۔ یہ انجمن ۱۹۳۱ء میں باقاعدہ کانگریس میں شامل کی جا چکی تھی، اور صوبہ سرحد کی کانگریس کی شاخ قرار دی گئی تھی۔ یعنی باوجود اس کے کہ کانگریس نے عملی احتجاج بالکل ترک کر دیا اور آئینی طریقوں کی طرف لوٹ آئی، حکومت نے وہ تمام خاص قانون جو سول نافرمانی کو روکنے کے لیے بنے تھے اسی طرح قائم رکھے بلکہ کانگریس کی اہم ماتحت جماعتوں کو خلاف قانون رہنے دیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی انجمنوں کو دبانے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ بڑے بڑے حکام نے زمینداروں کے پاس جا کر تاکید کی کہ تم اپنی تنظیم کرو۔ زمینداروں کی انجمنوں کے لیے تمام سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ چنانچہ صوبہ متحدہ کی دو بڑی انجمنوں کا چندہ سرکاری طور پر مال گزاری کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے۔

یوں تو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ انجمنوں کو ہمیشہ سے ناپسند کرتا ہوں مگر ایک واقعے کی وجہ سے خاص طور پر مجھے ہندو مہا سبھا سے سخت رنج پہنچا۔ اس کے ایک سیکرٹری نے یہ غضب کیا کہ بغیر کسی تعلق کے اس حکم کی تائید کر ڈالی جو سرحد کی سرخ پوش جماعت کو خلاف قانون قرار دینے کے لیے جاری کیا گیا تھا اور حکومت کو اس فعل پر شاباش دی۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ لوگوں سے ان سے معمولی مدنی حقوق چھیننے کی حمایت کی جا رہی ہے اور وہ بھی اس وقت جب کوئی جارحانہ

تحریک موجود نہیں ہے۔ اصول کے سوال کو چھوڑ کر دیکھا جائے تب بھی ہر شخص جانتا تھا کہ ان سرحد والوں نے تین سال کی کش مکش میں کمال کر دکھایا اور ان کا لیڈر خان عبدالغفار خاں جس کا سا بہادر اور کھرا آدمی ہندوستان میں مشکل سے نکلے گا، اب تک جیل میں ہے جہاں وہ بغیر عدالتی تحقیقات کے شاہی قیدی کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ میرے نزدیک فرقہ وارانہ تعصب کی اس سے بدتر مثال نہیں ہوسکتی اور مجھے توقع تھی کہ ہندو مہا سبھا کے بڑے بڑے لیڈر فوراً اپنے رفیق کار کی اس رائے سے بے تعلق ہونے کا اعلان کریں گے مگر جہاں تک مجھے معلوم ہوا ان میں سے کسی نے اس معاملے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

ہندو مہا سبھا کے سیکرٹری کے اس بیان سے مجھے سخت پریشانی تھی۔ یہ بجائے خود بہت بری چیز تھی مگر میرے لیے اس وجہ سے اور زیادہ تکلیف دہ تھی کہ میں اسے ملک کی موجودہ حالت کا ایک نمونہ سمجھتا تھا۔ اس دن سہ پہر کو گرمی سے نڈھال ہو کر سو گیا تو ایک عجیب خواب نظر آیا۔ میں نے دیکھا کہ خان عبدالغفار خاں پر لوگ ہر طرف سے حملہ کر رہے ہیں اور میں ان کو بچانے کے لیے لڑ رہا ہوں۔ آنکھ کھلی تو طبیعت بہت پست اور اداس تھی اور سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس پر مجھے تعجب ہوا اس لیے کہ جاگتے میں کبھی میرے جذبات کا جوش اس طرح ظاہر نہیں ہوا کرتا۔

بات یہ ہے کہ ان دنوں میرے اعصاب بہت ہی کمزور ہو گئے تھے۔ سوتے میں بے چینی رہتی تھی، جو میرے لیے غیر معمولی چیز تھی اور طرح طرح کے بھیانک خواب نظر آتے تھے۔ بعض وقت میں نیند میں چیخ اٹھتا تھا۔ ایک بار شاید بہت زور سے چیخ نکل گئی۔ اس لیے کہ جب میں چونکا تو دیکھا کہ دو پہرے والے میرے شور وغل سے پریشان میرے پاس کھڑے ہیں۔ میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔

اسی زمانے میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک ریزولیوشن سے بھی مجھے تکلیف ہوئی۔اس ریزولیوشن کے پاس کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ’’ذاتی املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ کی ضرورت کے متعلق بہت سی غلط باتیں مشہور کی جارہی ہیں‘‘ اور اس میں کانگریس والوں کو یہ یاد دلایا گیا تھا کہ کراچی کے ریزولیوشن میں ’’نہ تو بغیر معقول وجہ اور مناسب معاوضے کے ذاتی املاک کی ضبطی کی تجویز ہے اور نہ طبقوں کی جنگ کی حمایت۔ ورکنگ کمیٹی کی رائے میں املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ، کانگریس کے عقیدہ عدم تشدد کی منافی ہے‘‘۔اس ریزولیوشن کے الفاظ مبہم تھے اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ترتیب دینے والے طبقوں کی جنگ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔اس کی زد صریحی طور پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی پر تھی، جو نئی نئی قائم ہوئی تھی۔سچ پوچھئے تو اس جماعت کے کسی ذمہ دار رکن نے ضبطی کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ہاں یہ بہت سے لوگوں نے کہا تھا کہ طبقوں کی جنگ اس وقت بھی موجود ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن میں یہ اشارہ پایا جاتا تھا کہ کوئی شخص جو طبقوں کی نزاع کا قائل ہو، کانگریس کا معمولی ممبر بھی نہیں ہوسکتا۔کانگریس پر کبھی یہ الزام نہیں لگایا گیا تھا کہ اس نے اشتراکیت اختیار کرلی ہے یا وہ ذاتی املاک کے خلاف ہے البتہ اس کے بعض ممبر یہ خیالات رکھتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو اس ہمہ گیر قومی انجمن کے معمولی ممبروں کی صف میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔

یہ بات کئی کہی جاچکی تھی کہ کانگریس راجا سے لے کر پرجا تک قوم کے ہر طبقے اور ہر جماعت کی نمائندگی کرتی ہے۔قومی تحریکیں اکثر یہ دعویٰ کرتی ہیں جس کے معنی غالباً یہ ہوتے ہیں کہ وہ بڑی اکثریت کی نمائندہ ہیں اور ان کی پالیسی سب کے فائدے کے لیے ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں اس لیے کہ کوئی سیاسی انجمن متضاد اغراض رکھنے والے طبقوں کی نمائندہ نہیں ہوسکتی اور اگر ہونا چاہے گی۔تو وہ ایک بے شکل، بے رنگ اور بے معنی جماعت بن کر رہ جائے گی۔کانگریس یا تو

ایک سیاسی پارٹی ہے جو سیاسی قوت حاصل کرنے اور اسے قوم کے فائدے کے لیے استعمال کرنے کا ایک واضح (یا دھندلا) مقصد اور اصول رکھتی ہے یا محض ایک راہ عام کی انجمن ہے جو اپنے کوئی خاص خیالات نہیں رکھتی بلکہ ہر شخص کا بھلا چاہتی ہے۔ اگر وہ سیاسی پارٹی ہے تو وہ صرف انہیں لوگوں کی نمائندہ کہلائے گی جو مجموعی طور پر اس کے مقصد اور اصول سے اتفاق رکھتے ہیں۔ جو اس مقصد کے مخالف ہیں وہ اس کے نزدیک قوم کے بدخواہ سماج کے مخالف اور رجعت پسند قرار پائیں گے اور ان کے اثر کو روکنا یا توڑنا اس کے اصول کی کامیابی کے لیے ضروری سمجھا جائے گا۔

کانگریس کی تحریک شہنشاہی کے خلاف اٹھی ہے اور اسے سماج کی باہمی نزاع سے تعلق نہیں ہے اس لیے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں بہت سے لوگوں کے اتفاق رائے کی گنجائش ہے۔ اسی لیے اسے ہندوستان کی بہت بڑی اکثریت کی نمائندگی کم و بیش حد تک حاصل ہوگئی ہے اور اس میں مختلف خیالات کی جماعتیں شریک ہوگئیں جو صرف ایک چیز میں یعنی شہنشاہی کی مخالفت میں متحد تھیں اور ان کی اس مخالفت میں بھی درجوں کا فرق تھا۔ وہ لوگ جو شہنشاہی کی مخالفت کے بنیادی مسئلے میں کانگریس کے ہم رائے نہیں تھے اس سے الگ ہوگئے اور کم و بیش برطانوی حکومت کا ساتھ دینے لگے۔ غرض کانگریس کئی جماعتوں کی متحدہ انجمن بن گئی۔ جن میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا مگر سب کی سب ایک مشترک مقصد اور گاندھی جی کی با اقتدار شخصیت کے رشتے میں مربوط تھیں۔

بعد میں ورکنگ کمیٹی نے طبقوں کی جنگ کے متعلق اپنے رزولیوشن کی تاویل کی کوشش کی۔ اس رزولیوشن کے الفاظ کی یا اس اصول کی جو اس میں بیان کیا گیا تھا اس قدر اہمیت نہیں تھی جتنی اس بات کی کہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریس کی پالیسی کس رخ جا رہی ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات تھی کہ یہ رزولیوشن کانگریس کی نئی

کونسل پارٹی کے اثر سے پاس ہوا ہے جو اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں سرمایہ داروں کی مدد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ان کے کہنے سے کانگریس رفتہ رفتہ رجعت پسندی کی طرف سرکتی جاتی تھی اور ملک کے اعتدال پسندوں اور قدامت پسندوں کو پرچانے کی فکر کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ جو لوگ پہلے کانگریس کے دشمن تھے اور نافرمانی کے زمانے میں حکومت کا ساتھ دے چکے تھے ان سے بھی میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی تھیں۔ شور مچانے والے اور نکتہ چینی کرنے والے انتہا پسندوں کی پارٹی اس تالیف قلوب میں سدراہ سمجھی جاتی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن اور کئی حضرات کے شخصی بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ کانگریس کے ارباب اختیار انتہا پسندوں کے اعتراضات کی وجہ سے اپنی راہ سے ہٹنے والے نہیں اور اگر یہ شرارت سے باز نہ آئے تو سزا پائیں گے اور کانگریس سے نکال دیئے جائیں گے۔

کانگریس کے لیڈروں میں گاندھی جی کے علاوہ اور بھی بہت سے مشہور بزرگ تھے جنھوں نے قومی آزادی کی جنگ میں بڑے بڑے کارنامے دکھائے تھے اور اپنی دیانت داری اور بہادری کی وجہ سے سارے ملک میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، مگر نئی پالیسی کی وجہ سے کانگریس کی دوسری بلکہ پہلی صف میں بعض ایسے لوگ پہنچ گئے جو کسی طرح اصول پرست نہیں کہے جاسکتے۔ یوں تو کانگریس کے حلقوں میں اب بھی اصول پرستوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی مگر اب مطلب پرستوں کے لیے اس میں داخل ہونا اتنا سہل ہوگیا جتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ گاندھی جی کی پراسرار شخصیت کے علاوہ جو سب پر چھائی ہوئی تھی کانگریس کے دو رخ نظر آتے تھے ایک تو خالص سیاسی رخ جس نے ایک خفیہ شوریٰ کی شکل اختیار کرلی تھی (یعنی چند آدمی مل کر ہر معاملے کا فیصلہ کرلیتے تھے اور اسے کانگریس سے منوا لیتے تھے) اور دوسرا مذہبی رخ جس میں ایک پرارتھنا منڈلی کی شان تھی اور زہد و تقویٰ اور رقت قلب کو جوش تھا۔

حکومت کے یہاں فتح کے شادیانے بج رہے تھے کیونکہ اس کے خیال میں نافرمانی کی تحریک اوراس کی شاخوں کو کچلنے کی پالیسی پوری طرح کامیاب ہوگئی تھی۔ آپریشن بہ خیروخوبی ہوگیا تھا۔مریض مرتا ہے یا جیتا ہے اس سے فی الحال بحث نہیں تھی۔اگرچ ہ کانگریس اس وقت تک کسی حد تک ہموار ہوگئی تھی مگر حکومت نے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اپنی وہی پالیسی جاری رکھی۔اسے معلوم تھا کہ جب تک اصل مسئلہ طے نہ ہوقومی پالیسی میں اس طرح کے تغیرات محض عارضی ہیں اور اگر ذرا ڈھیل دی گئی تو یہ آگ پھر بھڑک اٹھے گی۔شاید اس کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کانگریس کے یا کسانوں اورمزدروں کی جماعت کے انتہاپسندوں پر سختی کرنے سے ان کانگریسی لیڈروں کو کچھ زیادہ شکایت نہیں ہوگی جواحتیاط کی راہ پر چل رہے ہیں۔

میرے خیالات دہرہ دون جیل میں کچھ اس قسم کے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں دور ہونے کی وجہ سے واقعات کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا تھا۔علی پور میں تو مجھے کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔دہرہ دون میں حکومت کا تجویز کیا ہوا اخبار دیکھنے کو ملتا تھیں۔اگر مجھے اپنے ان ساتھیوں سے جو جیل کے ماہر تھے ملنے کا اور واقعات کو غور سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوتا تو شاید میری رائے تھوڑی بہت بدل جاتی۔

حال کے تصور سے مجھے تکلیف ہوتی تھی اس لیے میں ماضی کا تصور کرنے لگا اور یہ سوچنے لگاک ہ جب سے میں نے قومی معاملات میں حصہ لینا شروع کیا ہندوستان میں سیاسی واقعات کی رفتار کیا رہی ہے اور ہم نے جو کچھ اب تک کیا اس میں کون سی بات بجا تھی اور کونسی بے جا تھی؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں اسے لکھ ڈالوں تو میرے خیالات زیادہ باترتیب اور مفید ہوں گے۔اور ایک معین کام میں لگ جانے سے مجھے اس پریشانی اور اداسی سے بھی نجات مل

جائے گی۔ چنانچہ جون ۳۴ء میں، میں نے دہرہ جیل کے اندر آپ بیتی لکھنی شروع کی اور پچھلے آٹھ مہینے برابر یہ کرتا رہا کہ جب کبھی لہر آ گئی بیٹھ کر سے لکھ ڈالا۔ بیچ میں کئی ایسے وقفے آئے کہ لکھنے کو جی نہیں چاہا۔ ان میں سے تین وقفے تین تین مہینے کے تھے مگر کسی نہ کسی طرح یہ کام چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اب خاتمے پر آ پہنچا ہے اور اس کا بڑا حصہ میں نے غیر معمولی پریشانی کے زمانے میں لکھا ہے جب میرے دل پر رنج اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ شاید اس کی جھلک اس کتاب میں بھی آ گئی ہے مگر اس کے لکھنے ہی سے مجھے ان پریشانیوں سے نجات ملی۔ لکھتے وقت میں نے پڑھنے والوں کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ میرا خطاب اپنے دل سے تھا۔ میں آپ ہی سوال کرتا تھا اور آپ ہی جواب دیتا تھا جس میں بعض اوقات ہنسی بھی آ جاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو جذبات سے الگ ہو کر بے لاگ طریقے سے غور کروں اور میں سمجھتا تھا کہ ماضی کے اس جائزے سے مجھے اس میں مدد ملے گی۔

جولائی کے آخر میں کملا کی طبیعت بگڑنے لگی اور چند روز میں حالت نازک ہو گئی ۱۱ اگست کو یکا یک مجھے دہرہ دون جیل سے رخصت ہونے کا حکم دیا گیا اور اس روز رات کو میں پولیس کی حراست میں الہ آباد روانہ کر دیا گیا۔ دوسرے دن تک شام کو ہم الہ آباد کے پریاگ اسٹیشن پر پہنچے اور وہاں مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ اطلاع دی کہ تم اپنی بیوی کی عیادت کے لیے عارضی طور پر رہا کئے جاتے ہو۔ اس دن میری گرفتاری کو پورے چھ مہینے ہو گئے تھے۔

گیارہ دن

تلوار اپنے نیاک کو گھس ڈالتی ہے
اور روح جسم کو ریت کر رکھ دیتی ہے

(بائرن)

میری رہائی عارضی تھی۔ مجھے یہ کہا گیا تھا کہ مجھے دو ایک روز کے لیے یا اتنی مدت کے جتنی ڈاکٹر اشد ضروری سمجھیں آزادی دی جاتی ہے۔ اس بے اطمینانی کی حالت میں جم کر کوئی کام کرنا ناممکن تھا۔ اگر میعاد مقرر ہوتی تو مجھے ایک اندازہ ہو جاتا اور میں اس کے لحاظ سے اپنے اوقات کا تعین کرتا۔ اب تو ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ نہ جانے کب دوبارہ جیل میں بھیج دیا جاؤں۔

یہ تبدیلی یکا یک ہوئی اور میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دم بھر میں قید تنہائی سے نکل کر بھرے گھر میں پہنچ گیا جہاں ڈاکٹروں، نرسوں اور عزیزوں کا مجمع تھا۔ میری لڑکی اندرا بھی شانتی نکیتن سے آ گئی تھی۔ دوست احباب کملا کی عیادت کے لیے برابر چلے آ رہے تھے رہنے سہنے کا ڈھنگ بالکل بدل گیا تھا۔ گھر کی آسائش میسر تھی، اچھا کھانا مل رہا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم تھا۔ مگر کملا کی علالت کی فکر سب پر غالب تھی۔

وہ نحیف و زار بستر پر پڑی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ کملا نہیں کملا کی پرچھائیں ہے۔ اس میں مرض سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی اور اس کی جدائی کا خیال میرے لیے سوہان روح بنا گیا تھا۔ ہماری شادی کو ساڑھے اٹھارہ برس گزر چکے تھے۔ وہ دن اور اس کے بعد کا زمانہ میری آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ شادی کے وقت میں چھبیس برس کا تھا اور وہ کوئی سترہ برس کی دبلی پتلی بھولی بھالی لڑکی۔ ہم دونوں کی عمر میں بہت فرق تھا مگر اس سے بھی زیادہ فرق ہمارے خیالات میں تھا اس لیے کہ میں اس سے زیادہ پختہ کار تھا۔ مگر اس عقل دنیاوی کے دکھاوے کے باوجود مجھ میں

بہت لڑکپن تھا اور مجھے یہ احساس نہ تھا کہ اس نازک حساس لڑکی کے نفس کی کلی کھل کر پھول بن رہی ہے اور اس کی پرداخت بڑی نرمی اور احتیاط سے ہونی چاہیے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی اس لیے آپس میں اچھی طرح نبھ رہی تھی مگر ہماری خیالات کی بنیادی الگ الگ تھیں اور ان میں میل نہ تھا۔ اس اختلاف کی وجہ سے ان بن رہتی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو جایا کرتے تھے۔ مگر یہ بچپن کے قصے زیادہ طول نہیں کھینچتے تھے اور ہم لڑ بھڑ کر پھر ایک ہو جاتے تھے۔ پھر بھی ہماری محبت بڑھتی گئی اگر چہ خیالات کا اختلاف بہت آہستہ آہستہ کم ہوا۔ ہماری شادی کے ۲۱ مہینے بعد ہماری اکلوتی لڑکی اندرا پیدا ہوئی۔

جن دنوں ہمارا شادی ہوئی قریب قریب اس زمانے میں ہندوستان کی سیاست نیا رنگ بدل رہی تھی اور میرا انہماک اس میں بڑھتا جاتا تھا۔ یہ ہوم رول کا دور تھا اور تھوڑے دن بعد ہی پنجاب میں مارشل لای اور اسی کے ساتھ ترک موالات شروع ہو گیا اور میں روز بروز قومی کاموں کے چکر میں پڑتا گیا۔ مجھے ان چیزوں سے اتنا شغف ہو گیا کہ بالکل غیر شعوری طور پر میں اس کی طرف سے قریب قریب غافل ہو گیا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ یہی زمانہ تھا جب اسے میری مدد کی بہت ضرورت تھی۔ اس سے مجھے جو محبت تھی وہ قائم رہی بلکہ اور بڑھ گئی اور مجھے بڑا اطمینان رہتا تھا کہ وہ میری تسلی کے لیے موجود ہے۔ مجھے تو اس سے تقویت پہنچتی تھی مگر اسے میری بے پروائی سے ضرور صدمہ پہنچتا ہوگا۔ وہ اس طبیعت کی تھی کہ اگر میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا تو شاید اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس غفلت اور کم التفاقی سے ہوئی ہوگی۔

اس کے بعد اس پر رہ رہ کر بیماری کے حملے ہونے لگے اور میں برسوں جیل میں رہنے لگا۔ اس عرصے میں ہم دونوں کا ملنا بس کبھی کبھی جیل کے دروازے پر ہو جایا کرتا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں وہ ہماری فوج کی صف اول میں

پہنچ گئی اور جب اسے قید کی سزا ملی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے۔ ہم ملاقات کی مختصر گھڑیوں کو جو مدتوں کے بعد نصیب ہوتی تھیں ایک بیش بہا دولت سمجھتے تھے اور فرقت کے دن گن گن کر کاٹتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی صحبت سے کبھی سیر نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ ہماری مختصر ملاقاتوں میں ہمیشہ ایک جدت اور تازگی ہوتی تھی۔ ہم پر ایک دوسرے کی سیرت کے نئے نئے پہلوؤں کا انکشاف ہوتا تھا اگرچہ بعض اوقات ہمیں یہ نئے پہلو پسند نہیں آتے تھے۔ ہماری ان جوانی کی نا اتفاقیوں میں بچپن کے جھگڑوں کا رنگ تھا۔

اٹھارہ برس کی ازدواجی زندگی کے بعد بھی اس کی صورت میں وہی لڑکپن اور کنوارپن کی کیفیت تھی۔ وہ روڑھاپن جو بیاہی عورتوں میں ہوتا ہے نام کو بھی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک دلہن ہے جو ابھی بیاہ کر آئی ہے۔ مگر میں بہت بدل گیا تھا اور گو اپنی عمر کے اعتبار سے خاصا چاق و چوبند تھا اور لوگ کہتے تھے کہ مجھ میں اب تک لڑکپن کی بعض خصوصیتیں موجود ہیں مگر میرا چہرہ میری عمر کا راز فاشا کر دیتا تھا۔ میرے سر کے بال کچھ اڑ گئے تھے۔ اور جو بچ رہے تھے وہ سفید ہو گئے تھے۔ میرے چہرے پر جھریاں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ پچھلے چار برس کی مصیبتیں اور پریشانیاں اپنے نقش میرے چہرے پر چھوڑ گئی تھیں۔ ان دنوں اکثر ایسا ہوا کہ کملا اور میں کسی مقام پر گئے تو لوگوں نے اسے میری لڑکی سمجھا اور مجھے بڑی خفت اٹھانی پڑی۔ وہ اور راندرا بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔

ازدواجی زندگی کے اٹھارہ برس کہنے کو تو یہ اٹھارہ برس تھے مگر ان میں سے نہ جانے کتنے میں نے جیل خانہ میں اور کملا نے اسپتالوں اور صحت گاہوں میں گزارے تھے اور اب پھر میں جیل میں سزا کاٹ رہا تھا اور صرف چند روز کے لیے چھوٹ کر آیا تھا اور وہ بیماری کے پنجے میں تڑپ رہی تھی۔ میں کسی قدر خفا تھا کہ وہ اپنی صحت کی پرواہ نہیں کرتی۔ مگر میں اسے کس طرح الزام دے سکتا تھا اس کی من

چلی طبیعت اس پر کڑھتی تھی کہ وہ بیماری سے بےبس ہے اور قومی جنگ میں پوری طرح شریک نہیں ہوسکتی۔ وہ عجیب دغدغے میں رہتی تھی، نہ تو کام کی طرف پوری توجہ کرسکتی تھی اور نہ علاج کی طرف۔

میں اپنے دل میں کہتا تھا کیا سچ مچ وہ ایسے وقت میں جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے مجھ سے منہ موڑ کر چلی جائے گی؟ ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو پہچاننا اور سمجھنا شروع کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اب ہماری ازدواجی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کا بڑا سہارا ہے اور بہت سے کام ساتھ ساتھ کرنے ہیں۔

یہ خیالات دل میں لیے ہوئے میں ہر روز ہر وقت اس کی حالت کو دیکھا کرتا تھا۔ میرے رفیق اور دوست مجھ سے ملنے کو آتے تھے۔ وہ مجھے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے جن کی مجھے خبر نہیں تھی۔ وہ موجودہ سیاسی مسائل پر بحث کرتے تھے اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں کیا جواب دوں۔ میرے لیے اپنے خیال کو کملا کی بیماری سے ہٹانا آسان نہیں تھا اور جیل میں اتنے عرصے تک واقعات سے الگ اور دور رہنے کے بعد یکایک ایسے مسائل کو حل نہیں کرسکتا تھا۔ جو مخصوص حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک مدت کے تجربے سے مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ جیل میں جو محدود اطلاعات ملتی ہیں ان کی بنا پر صورت حال کا صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ صحیح رائے قائم کرنے کے لیے لوگوں سے ملنا ضروری تھا۔ اگر بغیر اس کے کوئی رائے ظاہر کی جاتی تو وہ اصلیت سے دور ہوتی۔ یہ گاندھی جی اور پرانے کانگریسی رفیقوں کی کے ساتھ بے انصافی ہوتی اگر میں ان سے ملنے اور بحث کرنے سے پہلے کانگریس کی پالیسی کے متعلق کوئی قطعی بات کہہ دیتا۔ مجھے بہت سی کارروائیوں پر سخت اعتراض تھا مگر میرے ذہن میں کوئی عملی تجاویز نہیں تھیں مجھے اس وقت جیل سے چھوٹنے کی مطلق توقع نہیں تھی اس لیے

میں نے ان چیزوں پر اس پہلو سے غور بھی نہیں کیا تھا۔

پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ جب حکومت نے اتنی عنایت کی کہ مجھے اپنی بیوی کے پاس پہنچنے کی اجازت دے دی تو یہ بڑی نامناسب بات ہے کہ میں اس سے فائدہ اٹھا کر سیاسی کام کروں۔ میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں اس قسم کے کام نہیں کروں گا پھر بھی یہ خیال مجھے روکتا تھا۔

میں عام بیانات شائع کرنے سے بھی احتراز کرتا رہا البتہ بعض غلط افواہوں کی تردید ضرور کی۔ نج کی گفتگو میں بھی صاف صاف کسی پالیسی کی تائید نہیں کرتا تھا البتہ پچھلے واقعات پر دل کھول کر تنقید کیا کرتا تھا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی ابھی حال ہی میں قائم ہوئی تھی اور میرے بہت سے گہرے رفیق اس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس معلومات کی بنا پر جو مجھے اس کے متعلق حاصل ہوسکیں مجھے اس کی عام پالیسی سے اتفاق تھا مگر یہ ایک عجیب قسم کی بچ میل جماعت تھی اور اگر میں بالکل آزاد ہوتا تب بھی اس میں شریک ہونے میں تامل سے کام لیتا۔ مقامی سیاسی معاملات میں مجھے کچھ وقت صرف کرنا پڑا اس لیے کہ اور مقامات کی طرح یہاں بھی لوکل کانگریس کمیٹی کے انتخابات میں سخت کشمکش پیدا ہوگئی تھی۔ کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا صرف ذاتیات کا معاملہ تھا۔ مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں ان جھگڑوں کو چکانے میں مدد دوں۔

میں ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اور نہ مجھے اتنی فرصت تھی۔ اس کے باوجود مجھے بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے سخت صدمہ ہوا۔ تعجب کی بات تھی کہ کانگریس کے مقامی انتخابات کے معاملے میں لوگوں میں اس قدر جوش کیونکر پیدا ہوگیا۔ ان میں سب سے پیش پیش وہ حضرات تھے جو لڑائی کے زمانے میں مختلف قسم کے ذاتی عذروں کی وجہ سے الگ ہوگئے تھے۔ سول نافرمانی کے ختم ہوتے ہی یہ عذر رفع ہوگئے اور یہ حضرات پردے سے باہر نکل کر آپس میں بازاری لوگوں کی طرح

لڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ حریفوں کو نیچا دکھانے کے جوش نے انہیں اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ معمولی تہذیب کی حد سے بھی گزر گئے تھے۔ مجھے اس بات سے اور بھی زیادہ صدمہ ہوا کہ کملا کے نام بلکہ اس کی بیماری سے بھی ان انتخابات میں ناجائز فائدہ اٹھایا گیا۔

جن وسیع تر مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ان میں اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں کانگریس کی شرکت کا مسئلہ بھی تھا۔ بہت سے نوجوان اس فیصلہ کے مخالف تھے کیونکہ وہ اس کے معنی یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کونسل کے کام اور مصالحت کے چکر میں پڑ جائے گی مگر وہ کوئی اور معقول تجویز پیش کرنے سے قاصر تھے۔ تعجب ہے کہ ان حضرات میں سے جو اعلیٰ اصولوں کی بنا پر کونسل کی شرکت کے مخالف تھے بعض کو انتخاب میں دوسری انجمنوں کے حصہ لینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کا منشا یہی معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ پرور جماعتوں کے لیے میدان خالی چھوڑ دیا جائے۔

مجھے ان نامعقول جھگڑوں سے اور ناپاک سیاست سے جو الٰہ آباد میں پیدا ہو رہی تھی کراہت آئی تھی۔ میں ان سے اور اپنے شہر سے بیزار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب وہ وقت آئے گا کہ میں ان معاملات کی طرف توجہ کروں تو میں اس فضا میں کیا کرسکوں گا۔

میں نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا جس میں کملا کی حالت کا ذکر تھا۔ چونکہ میں سمجھتا تھا کہ بہت جلد جیل بھیج دیا جاؤں گا اور مجھے پھر خط لکھنے کا موقع نہیں ملے گا اس لیے میں نے انھیں ان خیالات اور جذبات سے بھی آگاہ کر دیا جو اس وقت میرے دل میں تھے۔ حال کے واقعات سے مجھے سخت مایوسی اور صدمہ ہوا تھا اور میرے خط میں کچھ تھوڑی سی جھلک اس کی بھی تھی۔ میں نے خود کوئی تجویز پیش نہیں کی کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے بلکہ صرف گزرتے ہوئے واقعات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی۔ یہ خط جذبات کے جوش سے بھرا ہوا تھا اور مجھے بعد میں معلوم ہوا

کہ گاندھی جی کو اس سے بری تکلیف ہوئی۔

دن گزرتے جاتے تھے اور میں منتظر تھا کہ جیل خانے سے طلبی یا حکومت کے پاس سے کوئی اور اطلاع آئے۔ وقتاً فوقتاً مجھے یہ اطلاع ملتی رہتی تھی کہ مزید احکام، کل پرسوں تک جاری ہو جائیں گے۔ اس اثنا میں ڈاکٹروں کو یہ ہدایت تھی کہ میری بیوی کی صحت کی روزانہ رپورٹ حکومت کو بھیجتے رہیں۔ میرے آنے کے بعد کملا کو کچھ خفیف سا افاقہ ہوا تھا۔

یہ عام خیال تھا اور اس میں وہ حضرات بھی شریک تھے جو عموماً حکومت کے محرم راز رہا کرتے ہیں کہ میں بالکل چھوڑ دیا جاتا مگر دو باتوں کی وجہ سے نہیں چھوڑا گیا، ایک یہ کہ اکتوبر میں کانگریس کا پورا جلسہ بمبئی میں ہونے والا تھا دوسرے یہ کہ اسمبلی کے انتخابات نومبر میں شروع ہونے کو تھے۔ اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو ان موقعوں پر شورش پیدا کرتا اس لیے اغلب یہ تھا کہ میں پھر تین مہینے کے لیے جیل بھیج دیا جاؤں گا اور اس کے بعد چھوڑ دیا جاؤں گا۔ مگر اس کا بھی امکان تھا کہ شاید واپس نہ بھیجا جاؤں گا اور جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے یہ امکان بظاہر بڑھتا جاتا تھا۔

مجھے جیل سے چھوٹے گیارھواں دن تھا یعنی اگست کی تیئسویں تاریخ تھی۔ دفعتہً پولیس کی موٹر کار آ کر رکی اور ایک پولیس افسر نے مجھ سے آ کر کہا کہ آپ کا وقت پورا ہو گیا اور آپ کو نینی واپس واپسی چلنا ہے۔ میں اپنے عزیزوں سے رخصت ہوا اور پولیس کی موٹر میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ بار ماں ہاتھ پھیلائے میرے پاس دوڑی آئیں ان کے چہرے کی وہ کیفیت میرے دل پر ایک عرصے تک نقش رہی۔

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

''سایہ یکساں پھیلا ہوا ہوتا ہے مگر دھوپ میں رنگ کا اتار چڑھاؤ لازمی ہے۔ اسی طرح رنج راحت سے بالکل الگ ہے مگر راحت میں گونا گوں آلام کی خلش اور کسک پوشیدہ ہے''۔

(راج ترنگنی ترجمہ۔ س۔ پنڈت)

میں پھر نینی جیل میں واپس آ گیا اور اب معلوم ہوتا تھا کہ میری قید نئے سرے سے شروع ہوتی ہے۔ میری حالت گیند کی سی ہو گئی تھی جسے اندر سے باہر، باہر سے اندر پھینکتے ہیں۔ جذبات کے مسلسل اتار چڑھاؤ نے میرے نظام عصبی کو تہ و بالا کر دیا تھا اور ان پیہم تغیرات سے نبھانا سہل نہ تھا۔ مجھے امید تھی کہ اپنی پرانی بارک میں رکھا جاؤں گا۔ اتنے دن رہتے رہتے میں اس سے کسی قدر مانوس ہو گیا تھا۔ اس میں میرے برادر نسبتی رنجیت پنڈت کے لگائے ہوئے پھول اب تک موجود تھے اور اس کا برآمدہ بھی کشادہ تھا۔ مگر اب اس نمبر کی بارک میں ایک صاحب شاہی قیدی کی حیثیت سے رہتے تھے جو بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ میرا ان کے ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اس لیے مجھے جیل کے ایک اور حصے میں جگہ دی گئی جہاں ہوا گھٹی ہوئی تھی اور سبزے اور پھولوں کا نام تک نہ تھا۔

مگر مجھے تو دن اور راتیں کاٹنی تھیں وہاں نہ سہی یہاں۔ میرا جسم قید میں تھا مگر میرا دل کہیں اور تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کملا کو جو ذرا سا افاقہ ہوا ہے وہ میرے دوبارہ گرفتار ہو جانے کے صدمے سے قائم نہیں رہے گا اور یہی ہوا۔ کچھ عرصے تک مجھے ڈاکٹروں کی رپورٹ روزانہ پہنچتی رہی اور وہ بھی بڑے پھیر سے۔ ڈاکٹر پولیس کو ٹیلی فون کرتا تھا، پولیس جیل کے دفتر کو اطلاع دیتی تھی اور وہاں سے مجھے خبر ملتی تھی۔ ڈاکٹروں کا جیل کے عملے سے براہ راست بات چیت کرنا خلاف مصلحت سمجھا جاتا تھا۔ دو ہفتے تک مجھے یہ رپورٹیں، پابندی سے تو نہیں مگر خیر پہنچتی رہیں۔ پھر ان کا

سلسلہ بند ہو گیا حالانکہ کملا کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔

پہلے بری خبریں سن کر اور پھر خبروں کے انتظار میں مجھے دن دوبھر اور راتیں پہاڑ ہو گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وقت ساکن ہے چلت بھی ہے تو چیونٹی کی چال سے۔ ایک ایک گھڑی قیامت کی گھڑی تھی۔ مجھے یہ احساس اس شدت کے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے یہ توقع تھی کہ میں کوئی دو مہینے میں یعنی بمبئی کانگرس کے اجلاس کے بعد رہا کر دیا جاؤں گا مگر یہ دو مہینے دو جگ کے برابر تھے۔

دوبارہ گرفتاری کے پورے ایک مہینے کے بعد میں ایک پولیس افسر کے ساتھ اپنی بیوی سے ملنے کے لیے بھیجا گیا۔ مجھ سے یہ کہا گیا کہ اب سے تمہیں ہفتے میں دو بار یہاں آنے کی اجازت ملا کرے گی بلکہ وقت بھی مقرر کر دیا گیا۔ چوتھے دن میں انتظار کرتا رہا۔ مگر کوئی لینے نہیں آیا۔ پانچواں، چھٹا، ساتواں دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ستم ظریفی تھی۔

خدا خدا کر کے ستمبر کا مہینہ گزرا۔ یہ تیس دن میری زندگی کے سب سے کٹھن دن تھے بیچ والوں کے ذریعے مجھ تک یہ بات پہنچائی گئی کہ اگر تم بے ضابطہ طور پر وعدہ کر لو کہ قید کی معیاد ختم ہونے تک سیاست سے الگ رہو گے تو تم کملا کی تیمارداری کے لیے رہا کر دیئے جاؤ گے۔

میں اس وقت سیاست کے خیال سے کوسوں دور تھا اور گیارہ دن تک باہر رہ کر میں نے جو سیاسی حالات دیکھے تھے ان کی وجہ سے میرا دل کھٹا ہو گیا تھا۔ مگر وعدہ کرنے کے یہ معنی تھے کہ میں اپنے قول سے، اپنے مقصد سے، اپنے رفیقوں سے، اپنے آپ سے پھر جاؤں! چاہے کچھ بھی ہو یہ شرط تو میں ہرگز منظور نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا وعدہ کرنا اپنی روح کو ہلاک کرنے، اپنے عقائد کا گلا گھوٹنے سے کم نہ تھا۔ سمجھانے والے سمجھاتے تھے کہ دیکھو کملا کی حالت بگڑتی جاتی ہے اگر تم اس کے پاس رہو تو شاید اس کی جان بچ جائے۔ کیا تمہیں اپنی آن کملا کی جان سے زیادہ

پیاری ہے؟ اگر صورت حال یہ ہوتی کہ واقعی میرے لیے سخت مشکل تھی مگر خوش قسمتی سے یہ مشکل مجھے درپیش نہ تھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ خود کملا اسے ہرگز پسند نہیں کرے گی اور اگر میں نے اس قسم کا وعدہ کرلیا تو اسے صدمہ اور ضرر پہنچے گا۔

شروع اکتوبر میں مجھے اسے دیکھنے کی اجازت ملی وہ تیز بخار میں قریب قریب بے ہوش پڑی تھی۔ اسے یہ آرزو تھی کہ میں اس کے پاس رہوں مگر جب میں رخصت ہونے لگا تو وہ بڑی بہادری سے مسکرائی اور مجھے جھکنے کا اشارہ کیا۔ میں جھک گیا اور اس نے میرے کان میں کہا ''یہ کیا قصہ ہے؟ کیا تم سے کہا جاتا ہے کہ تم حکومت سے کوئی وعدہ کرلو؟ دیکھو یہ ہرگز نہ کرنا!''

میری گیارہ دن کی رہائی کے دوران یہ طے ہوگیا تھا کہ کملا کو ذرا افاقہ ہو تو وہ کسی بہتر مقام پر علاج کے لیے بھیج دی جائے۔ تب سے ہم برابر اس کی طبیعت کے سنبھلنے کا انتظار کررہے تھے مگر وہ تو اور گرتی جاتی تھی اور اب چھ ہفتے کے بعد صاف نظر آرہا تھا کہ اس کی حالت پہلے سے بدتر ہے۔ اب زیادہ انتظار کرنا فضول تھا اور یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ وہ اسی حالت میں بھوالی بھیج دی جائے۔

اس کی روانگی سے ایک دن پہلے میں اسے رخصت کرنے کے لیے لے جایا گیا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ دیکھئے اب مجھے اس کی صورت دیکھنا کب نصیب ہوتا ہے اور ہوتا بھی ہے یا نہیں مگر وہ اس روز بہت بشاش تھی اور مجھے ایک عرصے کے بعد اپنے دل میں کسی قدر خوشی کی جھلک نظر آئی۔

تقریباً تین ہفتے بعد میں نینی جیل سے الموڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا تاکہ کملا سے قریب رہوں۔ بھوالی راستے میں پڑتا تھا اور میں اپنے پولیس کے نگرانوں کے ساتھ چند گھنٹے وہاں ٹھہرا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ کملا کی حالت کسی قدر بہتر تھی اور میں اطمینان سے الموڑے روانہ ہوا۔ سچ پوچھئے تو کملا سے ملنے سے پہلے پہاڑ کی ہوا نے میرے دل کو مسرت سے معمور کردیا تھا۔

میں دوبارہ پہاڑ پر آنے سے بہت خوش تھا۔ ہماری موٹر سڑک کے پیچ وخم کے ساتھ چکر کھاتی چلی جارہی تھی صبح کی ٹھنڈی ہوا اور پہاڑ کے دلفریب مناظر سے دل کو ایک عجیب فرحت ہوتی تھی۔ ہم اونچے ہوتے چلے جاتے تھے۔ اور کھڈ کی گہرائی بڑھتی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ چوٹیاں بادلوں میں چھپ گئیں۔ درخت بالکل بدل گئے۔ ہر طرف پہاڑیاں دیودار اور صنوبر سے ڈھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کبھی کبھی سڑک کے موڑ سے نکل کر ایک نیا منظر سامنے آجاتا تھا، پہاڑیوں اور وادیوں کی ایک وسیع فضا اور نیچے کھڈ میں زور شور سے بہتا ہوا چھوٹا چشمہ، اس نظارے سے میرا جی کسی طرح نہیں بھرتا تھا۔ میں اسے ندیدوں کی طرح دیکھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے سمیٹ کر حافظے کے خزانے میں بھر لوں تاکہ جب یہ نظروں سے چھپ جائے تو اس کی یاد سے دل بہلاؤں۔

پہاڑیوں کے پہلو میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے جھنڈ تھے اور ان کے آس پاس ذرا سے کھیت جو بڑی محنت سے زمینوں پر بنائے گئے تھے۔ دور سے یہ چوڑی چوڑی سیڑھیاں معلوم ہوتی تھیں جن کا سلسلہ بعض جگہ وادی کی سطح سے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچتا تھا۔ کس قدر شدید مشقت سے ان بستیوں کے رہنے والے فطرت سے ذرا سی غذا حاصل کرتے تھے! ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر وہ بس اتنا پیدا کر پاتے تھے کہ روکھی سوکھی روٹی میسر آجائے۔ ان جتے ہوئے کھیتوں سے اس کوہستان میں آبادی کی شان پیدا ہوگئی تھی اور کھری یا درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے مقابلے میں یہ عجب لطف دیتے تھے۔

دن کو یہ منظر بڑا خوشگوار تھا۔ جب سورج اونچا ہوا اور چڑھتی ہوئی دھوپ نے پہاڑوں میں حرارت اور زندگی پیدا کردی تو ان کی بیگانہ روشی کم ہوگئی اور ان میں انس اور محبت کی شان نظر آنے لگی۔ مگر شام ہوتے ہی ان کا رنگ کچھ اور ہی ہوجاتا ہے۔ جب رات دیو کی طرح لمبے لمبے قدم اٹھاتی دنیا سے گزرتی ہے اور زندگی وحشی

فطرت کے ہاتھ میدان چھوڑ کر امن کے گوشے میں چھپ جاتی ہے تو یہی پہاڑ کس قدر سرد مہر اور وحشت ناک نظر آنے لگتے ہیں۔ چاندنی رات یا تاروں کی دھیمی روشنی میں یہ اسرار، مہیب، طلسمی دیواریں فضا کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں اور وادیوں سے ہوا کے سائیں سائیں چلنے کی آواز آنے گونجتی ہے۔ بیچارے مسافر کو جو اکیلا چلا جا رہا ہو۔ ایک خفی احساس ہوتا ہے کہ ہر طرف دشمن ہی دشمن ہیں اور وہ خوف لرزنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا بھی اس پر ہنستی اور اسے للکارتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہوا بالکل تھم جاتی ہے اور اس قدر گہرا سناٹا چھا جاتا ہے کہ اس سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ صرف تار برقی کے تار کی خفیف سی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے۔ اور ستارے زیادہ روشن اور قریب معلوم ہوتے ہیں۔ پہاڑ خشمناک نظروں سے گھورتے ہیں اور انسان ایک راز سربستہ کے مقابل کھڑا ہوتا ہے جس کی ہیبت دل میں بیٹھ جاتی ہے وہ پسکال کا ہم زبان ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے ''ان وسیع فضاؤں کی ابدی خاموشی سے مجھے ہول آتا ہے'' میدان میں راتوں کو اس قدر سناٹا نہیں ہوتا۔ وہاں زندگی کی سن گن کانوں میں پہنچتی رہتی ہے اور مختلف جانوروں اور کیڑوں کی آوازیں رات کی خاموشی کو توڑتی رہتی ہے۔''

مگر جس وقت ہم موڑ پر الموڑے جا رہے تھے رات کی سرد مہری اور بے مہری ابھی بہت دور تھی۔ ہم منزل مقصود کے قریب تھے کہ راستے کے مڑنے اور بادلوں کے یکا یک پھٹ جانے سے ایک نیا منظر سامنے آ گیا جسے دیکھ کر میں خوشی اور حیرت سے دم بخود رہ گیا۔ پر اشجار پہاڑوں کی دیواروں سے اونچی، بہت دور ہمالیہ کی برف آلود چوٹیاں سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ یہ ماضی کی حکمت و دانش کے وارث، ہندوستان کے وسیع میدانوں کے زبردست محافظ کس قدر پر وقار اور پر اسرار نظر آتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی قلب کا ہیجان اور اضطراب دور ہو گیا اور ان کی شان ابدیت کے آگے میدانوں اور شہروں کی چھوٹی چھوٹی سازشیں اور جھگڑے،

حرص و ہوس اور مکر وفریب ہیچ نظر آنے لگے۔

الموڑے کا چھوٹا جیل ایک اونچی سی پہاڑی پر تھا۔ اس میں ایک شاندار پارک مجھے رہنے کے لیے ملی یعنی ایک بڑا سا ہال جو سترہ گز لمبا اور پونے چھ گز چوڑا تھا۔ اس کا فرش کچا اور ناہموار تھا، چھت کو کیڑوں نے کھا لیا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹوٹ کر گرتے رہتے تھے۔ اس میں پندرہ کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا یا یوں کہیے کہ دیواروں میں روزن تھے۔ جن میں سلاخیں لگی تھیں۔ کواڑ کسی میں بھی نہ تھے۔ غرض تازہ ہوا کی کمی نہیں تھی۔ جب سردی زیادہ پڑنے لگی تو ان کھڑکیوں پر موٹی چٹائی چڑھا دی گئیں۔ اس وسیع مکان میں (جو دہرہ دون جیل کے ہر احاطے سے بڑا تھا) میں اکیلا بڑی شان سے رہا کرتا تھا۔ مگر سچ پوچھیے تو میں بالکل تنہا بھی نہ تھا، اس لیے کہ کم سے کم چالیس چڑیوں نے ٹوٹی ہوئی چھت میں اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کبھی کوئی سیلانی بادل آنکلتا اور اس کے بہت سے ٹکڑے دیوار کے روزنوں سے کمرے میں گھس آتے اور ساری فضا کو مرطوب کہر سے بھر دیتے۔

یہاں میں ساڑھے چار بجے سہ پہر کے ناشتے کے بعد جو میری آخری غذا تھی پانچ بجے مقفل کر دیا جاتا اور صبح سات بجے اس سلاخ دار دروازے کا قفل کھلتا۔ دن کو میں یا تو اپنی بارک میں بیٹھا رہتا یا ایک احاطے میں جو اس سے متصل تھا بیٹھ کر دھوپ کھایا کرتا! احاطے کی دیوار کے اوپر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کی چوٹی کی ذراسی جھلک دکھائی دیتی تھی اور سر پر آسمان نیلی چادر تنی رہتی تھی جس میں جا بجا بادل بکھرے نظر آتے تھے۔ یہ بادل طرح طرح کے روپ بدلا کرتے تھے اور میں اس تماشے سے کبھی نہیں اکتاتا تھا۔ تصور کی مدد سے ان میں ہر قسم کے جانوروں کی شکلیں بنا جاتی تھیں۔ کبھی کبھی یہ بادل مل کر ایک بحر موج معلوم ہوتے تھے یا وہ ساحل بحر سے مشابہ نظر آتے تھے اور دیوار کے درختوں میں ہوا کی

سرسراہٹ پر یہ دھوکا ہوتا تھا کہ بہت فاصلے پر کہیں سمندر کی موجیں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی بادل دور سے ٹھوس نظر آیا مگر پاس آ کر گھل جاتا اور ہمیں ہر طرف سے گھیر لیتا۔

مجھے یہ بڑی سی بارک چھوٹی کوٹھڑی کے مقابلے میں پسند تھی، اگرچہ اس میں تنہائی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا۔ جب باہر بارش ہوتی تھی اس وقت بھی اس میں ٹہل سکتا تھا مگر جوں جوں سردی بڑھتی گئی اس کی اداسی اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی اور جب حرارت گرتے گرتے نقطہ انجماد تک پہنچی تو میرا کھلے میدان اور تازہ ہوا کا شوق بھی کم ہوگیا۔ نئے سال کے شروع میں خوف برف گری جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور جیل کے گردوپیش کے بے لطف منظر میں بھی ایک لطف پیدا ہوگیا۔ دیودار کے درخت جو جیل کے احاطے سے باہر تھے نہایت خوش نما معلوم ہوتے تھے جیسے برف کی پوشاک پہنے پریاں کھڑی ہوں۔

کملا کی صحت کو ایک حالت پر قرار نہ تھا اس لیے مجھے ہر وقت فکر رہا کرتی تھی۔ بری خبر سن کر میں تھوڑی دیر کے لیے بدحواس ہو جاتا تھا۔ مگر پہاڑ کی ہوا طبیعت میں سکون پیدا کرتی تھی اور مجھے پھر رات کو اچھی طرح نیند آنے لگی تھی۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ عین اسی وقت جب آنکھ لگنے والی ہے میں سوچنے لگتا تھا کہ نیند بھی کس قدر عجیب وغریب اور پر اسرار چیز ہے آخر آدمی سونے کے بد جاگے ہی کیوں؟ کیا اچھا ہو اگر اب میں کبھی نہ جاگوں۔

ان دنوں مجھے رہائی کی آرزو اس شدت سے تھی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بمبئی کی کانگریس ہو چکی، نومبر آیا اور چلا گیا۔ اسمبلی کے انتخابات کا جوش بھی ٹھنڈا ہو گیا مجھے خیال تھا کہ شاید اب میں چھوڑ دیا جاؤں۔

مگر خبر آئی تو یہ آئی کہ خان عبدالغفار خان کو گرفتار کر کے سزا دے دی گئی اور سبھاش بوس پر ہندوستان کے مختصر قیام کے زمانے میں عجیب وغریب پابندیاں عائد

کی گئیں۔ یہ احکام بجائے خود وحشیانہ اور بے دردانہ تھے اور پھر یہ اس شخص کے خلاف جاری کیے گئے تھے جسے ملک میں کروڑوں آدمی عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔اور جو اپنی بیماری کے باوجود اپنے باپ کے آخری دیدار کے لیے دوڑا آیا اور وقت پر نہ پہنچ سکا۔اگر حکومت کا یہی رنگ تھا تو ظاہر ہے کہ میری قبل از وقت رہائی کی کوئی امید نہیں ہوسکتی تھی۔آگے چل کر سرکاری اعلانات سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔

الموڑا جیل میں ایک مہینہ رہنے کے بعد میں کملا کو دیکھنے کے لیے بھوالی لے جایا گیا دو بار کہتے تو زیادہ صحیح ہوتا۔الموڑے کے پچھلے ساڑھے تین مہینے کے قیام میں میں کل پانچ بار اس سے ملنے پایا۔میں یہ شکایت کے طور پر نہیں کہتا اس لیے کہ میرے خیال میں حکومت نے میرے ساتھ بڑی عنایت کی اور مجھے کملا سے ملنے کی غیر معمولی سہولیتیں دیں۔میں اس کا بہت شکر گزار ہوں۔یہ مختصر ملاقاتیں میرے لیے نعمت تھیں اور شاید کملا کے لیے بھی۔جس روز میں اس سے ملنے جاتا تھا ڈاکٹر اپنے قواعد کی سختیاں کم کر دیتے تھے اور مجھے اس سے دیر تک باتیں کرنے کی اجازت تھی۔ہم ایک دوسرے سے روحانی حیثت سے بہت قریب ہوگئے تھے اور مجھے اس سے چھوٹنا بہت شاق گزرتا تھا۔ہم ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھنے بھی نہیں پاتے تھے کہ جدائی کی گھڑی آن پہنچتی تھی اور کبھی کبھی میں یہ خیال کر کے تڑپ جاتا تھا کہ شاید ایک دن ہمیں ہمیشہ کے لے جدا ہونا پڑے گا۔

میری والدہ علاج کے لیے بمبئی گئی تھیں کیونکہ انہیں ابھی تک صحت نہیں ہوئی تھی۔وہاں سے یہ اطلاعیں آرہی تھیں کہ انہیں فائدہ ہورہا ہے۔ مگر وسط جنوری میں ایک روز دفعتہً ایک تارہ پہنچا اس سے میں بدحواس ہوگیا۔معلوم ہوا کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ممکن تھا کہ میں بمبئی کے جیل میں بھیج دیا جاؤں تا کہ ان کے پاس رہ سکوں مگر خبر آئی کہ ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے اس لیے نہیں بھیجا گیا۔

فروری کا مہینہ آ گیا ہے۔ ہوا میں بہار کی کیفیت محسوس ہونے لگی ہے۔ بلبلیں چہک رہی ہیں۔ درختوں میں پر اسرار طریقے سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور اس عجیب و غریب دنیا کو حیران ہو کر دیکھتی ہیں۔ پہاڑیوں کے پہلو میں سرخ پھولوں سے بھری جھاڑیاں دور سے خون کے دھبے معلوم ہوتی ہیں۔ آلوچے اور شفتالو کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں۔ دن گزرتے جاتے ہیں اور میں ایک ایک گھڑی گن رہا ہوں کہ بھوالی جانے کا وقت آ جائے۔ خدا جانے یہ بات سچ ہے یا نہیں کہ مصیبت کے بعد راحت اور جدائی کے بعد وصل کے دن آتے ہیں۔ شاید ایسا نہ ہو تو ہم راحت کی قدر ہی نہ کریں۔ کہتے ہیں کہ مصیبت انسان کے دماغ کو روشن کر دیتی ہے۔ مگر حد سے زیادہ مصیبت آئے تو وہ اور دھندلا ہو جاتا ہے۔ جیل میں رہ کر مشاہدہ نفس کا بہت موقع ملتا ہے۔ اور اتنے دن قید رہنے سے مجھے اپنی نفسی زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں خلقی طور پر داخل بین نہیں ہوں مگر قیدی زندگی میں قہوے یا کچلے کی طرح یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو داخل بین بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات میں دل بہلانے کے لیے پروفیسر میک وڈگل کے کعب کا خاکہ کھینچتا ہوں جس سے داخل بینی اور خارج بینی ناپی جاتی ہے۔ میں اسے نظر جما کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شکل بڑی تیزی سے بار بار بدل رہی ہے۔

حال کے چند واقعات

''رات کی صبح ہوتی ہے مگر ہماری زندگی کے گئے ہوئے دن واپس نہیں آتے۔ آنکھ آنے والے زمانے کو دیکھتی ہے مگر گزری ہوئی بہار کا داغ دل سے نہیں مٹتا۔'' (لی تائی پو)

مجھے جو اخبار پڑھنے کو ملتے تھے ان سے بمبئی کی کانگریس کا حال معلوم ہوا۔ مجھے قدرتی طور پر کانگریس کی سیاست سے اور اس کے لیڈروں کی شخصیت سے دلچسپی تھی۔ بیس سال کے گہرے تعلقات کی وجہ سے میں اس سے اس قدر وابستہ ہو گیا تھا کہ میری ذات اس میں محو ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ تعلق کچھ اس عہدے کی وجہ سے نہ تھا جو مجھے اس میں حاصل تھا۔ مخفی روحانی رشتوں نے مجھے اس عظیم الشان انجمن اور اپنے بے شمار پرانے رفیقوں سے جکڑ رکھا تھا۔ پھر بھی مجھے اس کی کارروائی پڑھ کر کچھ جوش نہیں آیا۔ بہت سے اہم فیصلوں کے باوجود مجھے یہ اجلاس پھیکا معلوم ہوا۔ جن چیزوں سے مجھے دلچسپی تھی ان کا اس میں ذکر تک نہیں آیا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو کیا کرتا۔ میں خود یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ نئے حالات کو اور اپنے ماحول کا مجھ پر کیا اثر پڑتا اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں جیل میں اس مشکل مسئلے میں سر کھپاتا۔ جبکہ میرے فیصلے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا جب وقت آئے گا تو میں اس وقت کی صورت حال پر غور کر کے فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اس وقت کوئی فیصلہ کرنا، چاہے وہ اپنے دل ہی میں کیوں نہ ہو محض حماقت تھی اس لیے کہ بدلنے والے واقعات کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جہاں تک میں اتنی دور سے اپنے پہاڑی مسکن میں بیٹھ کر سمجھ سکتا تھا اس جلسے کے دو نمایاں پہلو تھے ایک یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت جلسے پر چھائی ہوئی تھی دوسرے یہ کہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر آنے نے جو قصے چھیڑے وہ بالکل نہیں چلنے

پائے۔ جو لوگ ہندوستان کے عام لوگوں اور اوسط طبقوں کے حقیقی حالت سے واقف ہیں ان کے لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ گاندھی جی کا اثر اب تک ہندوستان میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ سرکاری حکام اور بعض گوشہ نشین سیاست دان جو اپنی خواہش کو واقعہ سمجھ لیتے ہیں اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ گاندھی جی کا اثر سیاست کے میدان میں ختم ہو گیا ہے یا کم سے کم بہت گھٹ گیا ہے مگر جب یہ شخص پھر اسی قوت اور شان سے میدان میں آتا ہے۔ تو یہ حیرت میں رہ جاتے ہیں اور اس ظاہری تغیر کے اسباب تلاش کرنے لگتے ہیں۔ گاندھی جی کا یہ اقتدار کانگریس میں کچھ تو ان خیالات کی بنا پر ہے جنہیں لوگ عام طور پر مانتے ہیں مگر اس سے بڑھ کر ان کی عجیب و غریب شخصیت کی وجہ سے۔ شخصیت ہر جگہ اہمیت رکھتی ہے اور ہندوستان میں اس کی اہمیت اور سب ملکوں سے زیادہ ہے۔

ان کا کانگریس سے علیحدہ ہونا اس اجلاس کا سب سے اہم واقعہ تھا اور بہ ظاہر اس سے کانگریس اور ہندوستان کی تاریخ کا ایک بڑا دور ختم ہو گیا، مگر اصل میں ان کی علیحدگی کا اعلان کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے کہ کانگرس میں جو ان کا اقتدار ہے اسے وہ چاہیں بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کی بنا کسی عہدے یا کسی محسوس رشتے پر نہیں ہے۔ کانگریس پر ان کے خیالات آج بھی اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جیسے پہلے تھے اور اگر وہ گاندھی جی کی راہ سے الگ بھی ہو جائے تب بھی غیر شعوری طور پر اس پر اور ملک پر ان کا اثر باقی رہے گا۔ وہ اس ذمہ داری سے کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ جب ہندوستان کے واقعی حالات پر نظر ڈالی جائے تو ان کی شخصیت سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اور اس سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

فی الحال وہ کانگریس سے الگ ہو گئے ہیں غالباً اس وجہ سے کہ وہ اسے الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید وہ کسی قسم کی انفرادی، عملی جدوجہد شروع کرنا

چاہتے ہیں جس میں حکومت سے جھگڑا ہونا لازمی ہے اور وہ اسے کانگریس کا معاملہ نہیں بنانا چاہتے۔

مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ کانگریس نے ملک کے دستور کی تشکیل کے لیے ایک مجلس اساسی قائم کرنے کی تجویز منظور کی۔ میرے خیال میں اس مسئلے کو حل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں اور کبھی نہ کبھی ایسی مجلس منعقد کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کا انعقاد برطانوی حکومت کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر ملک میں انقلاب ہو جائے تو اور بات ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں حکومت اسے منظور نہیں کرے گی۔ اس لیے ایسی مجلس جو حقیقی معنی میں اساسی مجلس کہی جا سکے۔ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک ملک میں اتنی قوت نہ پیدا ہو جائے کہ وہ حکومت کو اس پر مجبور کر دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی مسئلہ بھی اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا۔ کانگریس کے بعض لیڈروں کی جو اساسی مجلس کے خیال سے اتفاق رکھتے ہیں یہ کوشش ہے کہ وہ اسے اعتدال کے سانچے میں ڈھال کر پرانی آل پارٹیز کانفرنس کے نمونے کی چیز بنا دیں اس سے مطلق کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہی پرانے لوگ جو زیادہ تر خود ہی اپنے آپ کو منتخب کر لیتے ہیں، ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور آپس میں لڑیں گے۔ اساسی مجلس کا اصل اصول یہ ہے کہ اسے عام لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد منتخب کرے اور اس میں جمہور کی قوت اور ان کی روح کام کرتی ہو۔ ایسی مجلس فوراً حقیقی مسائل پر غور کرنا شروع کر دے گی اور وہ پہلے کی طرح فرقہ وارانہ قضیوں اور اس قسم کے اور جھگڑوں میں پھنس کر نہیں رہ جائے گی۔

اس تجویز کا شملہ اور لندن پر جو اثر ہوا اس کا مطالعہ بہت دلچسپ تھا۔ نیم سرکاری طور پر یہ کہا گیا کہ حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا یعنی اس نے مربیانہ انداز سے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ پرانی آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کی قسم کی چیز ہوگی جو یقیناً ناکامیاب رہے گی اور اسے تقویت پہنچائے گی۔

آگے چل کر اسے یہ احساس ہوا کہ اس میں بڑے بڑے خطرے ہیں اور اس نے زور شور سے اس کی مخالفت شروع کر دی۔

بمبئی کانگریس کے تھوڑے ہی دن بعد آسمبلی کے انتخابات شروع ہو گئے۔ گو مجھے کانگریس کے کونسل کے پروگرام سے کوئی خاص شغف نہ تھا۔ پھر بھی ان انتخابات سے بڑی دلچسپی تھی۔ میں کانگریس کے امیدواروں کی فتح کا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے حریفوں کی شکست کا متمنی تھا۔ حریفوں کی یہ جماعت عہدوں کے طلب گاروں، فرقے پرستوں، غداروں اور حکومت کے جبر و تشدد کے حامیوں کا ایک معجون مرکب تھی۔ یہ یقین تھا کہ ان میں سے اکثر لوگ مقابلہ میں ہار جائیں گے مگر فرقے وارانہ تصفیے کی وجہ سے بڑی الجھن پیدا ہو گئی تھی اور ان میں سے بہتوں نے فرقے وارانہ جماعتوں کے وسیع دامن میں پناہ لی تھی۔ پھر بھی کانگریس کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی اور میں بہت خوش ہوا کہ بہت سے ناپسندیدہ اشخاص کونسلوں میں نہیں جانے پائے۔

مجھے سب سے زیادہ قابل افسوس نام نہاد کانگریس نیشنلسٹ پارٹی کا طرز عمل معلوم ہوتا تھا۔ ان کا فرقے وارانہ تصفیے کی شدید مخالفت کرنا تو سمجھ میں آتا تھا مگر انہوں نے یہ غضب کیا کہ اپنی قوت بڑھانے کے لیے انتہائی فرقے پرست جماعتوں سے دوستی کر لی۔ یہاں تک کہ سناتن دھرمی پنڈتوں سے بھی جن سے زیادہ رجعت پسند سیاسی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان میں کوئی اور جماعت نہیں ہے اور بہت سے سیاسی رجعت پسندوں سے جو سارے ملک میں بدنام ہیں سوائے بنگال کے جہاں بعض خاص وجوہ سے کانگریس کے ایک طاقتور جماعت کی ان کی موئید تھی اور سب کہیں ان میں سے اکثر لوگ ہر طرح کانگریس کے مخالف تھے بلکہ سچ پوچھئے تو یہی لوگ کانگریس کے سب سے بڑے حریف تھے۔ باوجود ان کے مختلف قوتوں کی مخالفتوں کے جن میں زمیندار، لبرل اور سرکاری ملازم شامل تھے کانگریس کے

امیدواروں کو بہت بڑی کامیابی ہوئی۔

فرقے وارانہ تصفیے کے معاملے میں کانگریس کا رویہ عجیب وغریب تھا، مگر موجودہ حالات میں کوئی صورت اور بھی نہ تھی۔ یہ اس کی پچھلی غیر جانب دارانہ اور کمزور پالیسی کا لازمی نتیجہ تھا۔ اگر وہ شروع سے ایک مضبوط پالیسی اختیار کرتی اور فوری نتائج کو نظر انداز کر کے اس پر قائم رہتی تو اس کی روش زیادہ باوقار اور صحیح ہوتی۔ مگر چونکہ اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے اس کے سامنے وہی ایک راہ تھی جو اس نے اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ فرقہ وارانہ تصفیہ نہایت لغو اور ناقابل قبول ہے کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے ہندوستان کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوسکتی۔ میں یہ اس وجہ سے نہیں کہتا کہ اس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ حقوق مل گئے غالباً یہ ممکن تھا کہ دوسرے طریقے سے ان کے سارے مطالبات پورے کر دیئے جاتے۔ موجودہ صورت میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کو بہت سے الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کی قوت کو بے کار کر دیں اور غیر ملکی برطانوی عنصر غالب رہے۔ اس طرح سے تو ہندوستان ہمیشہ برطانوی حکومت کا محتاج رہے گا۔

خصوصاً بنگال میں، جہاں مٹھی بھر یورپین جماعت کو صحیح تناسب سے کہیں زیادہ حقوق دیئے گئے ہیں، ہندوؤں کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی۔ یہ تصفیہ یا فیصلہ، یا اسے جو کچھ بھی کہا جائے (اسے تصفیہ کہنے پر بعض لوگوں کو اعتراض ہے) بہت سے لوگوں کو سخت ناگوار ہے چاہے یہ زبردستی نافذ کر دیا جائے اور سیاسی وجوہ سے لوگ اسے عارضی طور پر برداشت بھی کر لیں مگر اس کی وجہ سے ہمیشہ فساد کی وجہ قائم رہے گی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس کا برا ہونا بہت اچھا ہے کیونکہ برا ہونے کی وجہ سے یہ مستقل طور پر قائم نہیں رہ سکتا۔

نیشنلسٹ پارٹی کو اور اس سے بھی بڑھ کر ہندو مہا سبھا اور دوسری فرقے پرست انجمنوں کو یہ مداخلت قدرتی طور پر ناگوار ہوئی مگر ان کے اور ان کے حامیوں کے

اعتراضات کی بنا اصل میں یہ تھی کہ وہ برطانوی حکومت کے خیالات سے متاثر تھے۔ اس کی وجہ سے انہوں نے ایک عجیب پالیسی اختیار کی اور کر رہے ہیں جس سے حکومت بہت خوش ہو گی۔ فرقے وارانہ تصفیہ ان کے دماغ پر مسلط ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسرے اہم معاملات میں حکومت کی مخالفت میں کمی کر رہے ہیں۔ انھیں یہ امید ہے کہ وہ خوشامد کے ذریعے سے حکومت کو اپنے موافق کر لیں گے۔ اور اس تصفیے میں اپنے حسب منشا ترمیم کرا لیں گے۔ ہندو مہا سبھا اس معاملے میں سب سے پیش پیش ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس میں نہ صرف ان کی ذلت ہے بلکہ اس سے فرقے وارانہ تصفیے میں ترمیم ہونا اور مشکل ہو جائے گا کیونکہ اس سے مسلمانوں میں اور برہمی پیدا ہو رہی ہے۔ اور وہ صلح کے راستے ہٹتے جاتے ہیں۔ حکومت قوم پرستوں کو ہرگز نہیں توڑ سکتی۔ دونوں فرقوں کی اغراض میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ بھی کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ فرقے وارانہ اغراض کے معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے فرقہ پرستوں کو راضی کر سکے۔ اسے دونوں میں سے ایک کو ترجیح دینی تھی اور اس نے مسلم فرقہ پرستوں کو ترجیح دی جو اس کے نقطہ نظر سے بالکل صحیح ہے۔ کیا وہ مٹھی بھر ہندو فرقہ پرستوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی طے شدہ اور مفید پالیسی بدل دے گی اور مسلمانوں کو ناراض کر دے گی؟۔ خود بات کہ ہندو، جماعت کی حیثیت سے، سیاست میں آگے ہیں اور قومی آزادی کے لیے زیادہ شور مچاتے ہیں ان کے خلاف پڑتی ہے۔ حکومت سمجھتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی فرقہ وارانہ رعایتوں سے (ظاہر ہے کہ بڑی رعایتیں تو دی نہیں جا سکتیں) ان کی سیاسی مخالفت کم نہیں ہونے کی، البتہ مسلمان ان رعایتوں سے کچھ دن کے لیے خوش کیے جا سکتے ہیں۔

اسمبلی کے انتخابات سے ظاہر ہو گیا کہ سب سے زیادہ رجعت پسند فرقہ پرست جماعتوں یعنی ہندو مہا سبھا اور مسلم کانفرنس کی پشت پر کون حضرات ہیں۔ ان دونوں

کے امیدوار اور موید بڑے بڑے زمیندار اور مہاجن تھے۔ ہندو مہا سبھا اس چھوٹی سی جماعت پر جو ہندو سماج میں چوٹی کی جماعت سمجھی جاتی ہے، اور لبرل پارٹی کے چند وکلا وغیرہ مشتمل ہے۔ ان کی ہندوؤں میں کوئی اہمیت نہیں اس لیے کہ نیچے اوسط طبقے میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ کارخانوں کے مالک بھی ان سے الگ ہیں اس لیے کہ ابھرتے ہوئے صنعتی طبقے اور زمینداروں کے طبقے میں جو جاگیرداری نظام کی یادگار ہے، ایک حد تک اغراض کا تصادم ہے۔ مالکان صنعت میں اتنی ہمتی نہیں کہ وہ عملی جدوجہد یا اور خطرناک کاموں میں شریک ہوں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ حکومت اور قوم پرور جماعت دونوں سے اچھے تعلقات قائم رکھیں۔ وہ لبرل یا فرقہ پرست جماعت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ ان کا متصد صرف صنعتی ترقی اور نفع حاصل کرنا ہے۔

مسلمانوں کے نیچے اوسط طبقے میں ابھی تک سیاسی بیداری پیدا نہیں ہوئی ہے اور صنعت میں وہ پیچھے ہیں۔ اس لیے نہ صرف ان کی انجمنوں پر سخت رجعت پسند، جاگیرداری رنگ میں ڈوبے ہوئے لوگ اور سابق سرکاری ملازم حاوی ہیں بلکہ پوری جماعت پر ان کا اچھا خاصا اثر ہے۔ مسلم کانفرنس میں خطاب یافتوں، سابق وزیروں اور بڑے زمینداروں کا جمگھٹ نظر آتا ہے۔ پھر بھی میرے خیال میں عام مسلمان عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے کہ ان کے معاشرتی نظام میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ میں زیادہ تیزی سے قدم بڑھائیں گے بالفعل تعلیم یافتہ مسلمانوں پر ذہنی اور جسمانی حیثیت سے ایک جمود سا چھایا ہوا ہے اور ان میں حرکت کا نام نہیں۔ وہ اپنے پہرہ داروں کو ٹوکنے کی جرات نہیں کر سکتے۔

کانگریس سیاسی اعتبار سے سب سے آگے ہے اور سب سے بڑی جماعت ہے۔ مگر اس کے لیڈر بھی اس سے کہیں زیادہ احتیاط کرتے ہیں جتنی عام لوگوں کی

حالت کو دیکھتے ہوئے کرنی چاہیے۔ وہ عام لوگوں سے مدد تو چاہتے ہیں مگر یہ بہت کم کرتے ہیں کہ ان سے کسی بات میں رائے لیں۔ ان کی مصیبتوں کا سبب معلوم کریں۔ اسمبلی کے انتخابات سے پہلے انھوں نے اپنے پروگرام کو معتدل بنانے کی انتہائی کوشش کی تا کہ اعتدال پسند غیر کانگریسی جماعتوں کی مدد حاصل کر سکیں۔ یہاں تک کہ مندروں کے داخلے کے مسودہ قانون میں بھی ان کے رویئے میں اختلاف تھا اور ان میں سے بعض نے مدراس کے کٹر ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لیے انہیں بہت کچھ اطمینان دلایا۔ اگر وہ ایک سیدھا سچا جارحانہ انتخابی پروگرام پیش کرتے تو لوگوں میں زیادہ جوش ہوتا اور انہیں اچھی سیاسی تربیت حاصل ہوتی، مگر موجودہ پروگرام کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ان جماعتوں کو جو سیاسی اور سماجی حیثیت سے رجعت پسند ہیں پر چانے کی اور زیادہ کوشش کی جائے گی تا کہ کسی موقع پر ان کے چند ووٹ حاصل ہو سکیں اور اس سے کانگریس کے لیڈروں اور عام لوگوں میں اور زیادہ بیگانگی پیدا ہو سکی۔ دھواں دھار تقریریں کی جائیں گی، پارلیمنٹ کے آداب کی پوری پوری پابندی ہوگی اور کبھی کبھی حکومت کو شکست ہو جایا کرے گی جسے وہ پہلے کی طرح بے پروائی سے نظر انداز کر دے گی۔

پچھلے چند سال میں جب کانگریس کانسلوں کا بائیکاٹ کر رہی تھی اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ اسمبلی اور صوبوں کی کونسلیں جمہور کی حقیقی نمائندہ اور رائے عامہ کا آئینہ ہیں۔ اب یہ لطف دیکھئے کہ جب انتہا پسند جماعت اسمبلی پر حاوی ہوگئی تو حکومت کا نقطہ نظر بدل گیا۔ جب کبھی انتخابات میں کانگریس کی کامیابی کا ذکر آتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ انتخاب کنندوں کا حلقہ بہت محدود ہے، تیں پینتیس کروڑ کی آبادی میں صرف تیس لاکھ آدمی رائے دہندگی کا حق رکھتے ہیں گویا سرکاری نقطہ نظر سے، جتنے آدمی حق رائے دہندگی سے محروم ہیں وہ سب کے سب حکومت برطانیہ کے حامی ہیں۔ اس کا علاج تو کھلا ہوا ہے۔ کل بالغوں کو یہ حق دید یجئے تو آپ ہی معلوم ہو جائے

گا کہ ان لوگوں کی کیا رائے ہے۔

اسمبلی کے انتخابات کے تھوڑے ہی دن بعد اس مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوگئی جو ہندوستان کے دستور اساسی کی اصلاح کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ اس پر ہر طرف سے مختلف قسم کے اعتراضات ہوئے، جن میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ہندوستانیوں کی طرف سے ''بے اعتمادی'' اور ''شبہات'' رکھتی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ لوگ ہمارے قومی اور سماجی معاملات کو عجیب وغریب نظر سے دیکھتے ہیں۔ آخر برطانوی سامراج کی پالیسی کو قائم رکھیں؟ برطانوی حکومت کا تو صریحی طور پر یہی خیال ہے اس لیے کہ ہم سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ ''تحقیقات'' سے اس وقت تک کام نہیں لیا جائے گا جب تک ہم کوئی شرارت نہ کریں یعنی ہماری حکومت خود اختیاری کی قابلیت کا ثبوت یہ ہے کہ ہم وہی کریں جو برطانوی حکومت چاہتی ہے۔ اگر برطانوی پالیسی کو ہندوستان میں قائم رکھنا ہے تو پھر سوراج کے لیے اس قدر ہنگامے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اٹاوا کے معاہدے سے انگلستان کو جو کچھ معاشی فائدہ ہوا وہ صرف ہندوستان کی تجارت (۱) کے معاملے میں ہوا۔ برطانوی تاجر جو ہندوستان سے تجارت کرتے ہیں بیشک نفع میں رہے (گو ہندوستان کے سیاسی اور تجارتی حلقوں کی رائے میں یہ نفع عام ہندوستانیوں کی اغراض کو نقصان پہنچا کر حاصل کیا گیا) مگر نوآبادیات خصوصاً کینیڈا اور آسٹریلیا (۲) میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ انھوں نے برطانیہ سے بڑا چوکھا سودا کیا اور اسے نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھایا۔ پھر بھی ان کی یہ کوشش ہے کہ اٹاوا کے معاہدے کے چکر سے نکلیں تاکہ وہ خود اپنی صنعت کو اور دوسرے ملکوں سے اپنی تجارت کو ترقی دے سکیں۔ (۳) کینیڈا میں لبرل پارٹی جو ایک ممتاز سیاسی جماعت ہے اور غالباً بہت جلد برسر اقتدار آجائے گی

صاف الفاظ میں اعلان کر چکی ہے کہ وہ اٹاوا کے معاہدے کو ختم کر دے گی (۴) آسٹریلیا میں اٹاوا کے معاہدے کی تاویلیں کر کے بعض قسم کے کپڑے اور سوت پر محصول بڑھا دیا گیا ہے۔ اس پر لنکا شائر کے کارخانوں کے مالک بہت برہم ہوئے اور انھوں نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا۔ احتجاج اور انتقام کے طور پر لنکا شائر میں آسٹریلیا کے مال کو بائیکاٹ کرنے کی تحریک شروع ہوئی مگر آسٹریلیا پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ اس نے جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ (۵)

ظاہر ہے کہ یہ معاشی نزاعین اس وجہ سے نہیں ہیں کہ کینیڈا اور آسٹریلیا کو برطانیہ سے کسی قسم کی پرخاش ہے البتہ آئرستان کو ضرور اس سے کد ہے۔ نزاعین اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اغراض میں تصادم ہوتا ہے اور ہندوستان کے ''تحفظات'' کا مقصد یہی ہے کہ جب کبھی تصادم ہو تو برطانیہ کی اغراض مقدم رکھی جائیں۔ حال میں ہندوستان اور برطانیہ میں ایک تجارتی معاہدہ وا ہے اس میں ہندوستان کے تاجروں اور مالکان صنعت سے رائے نہیں لی گئی اور وہ چیختے ہی رہے البتہ برطانیہ کے مالکان صنعت سے برابر مشورہ ہوتا رہا۔ اسمبلی نے اس معاہدے کو مسترد کر دیا مگر حکومت اسی پر اڑی رہی۔ اس سے کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے کہ ''تحفظات'' کا کیا نتیجہ ہوگا۔ اس قسم کے ''تحفظات'' کی کینیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں بڑی ضرورت ہے تا کہ ان نو آبادیوں کے لوگ نہ صرف تجارتی معاملات میں بلکہ اور کاموں میں بھی جو سلطنت کی حفاظت اور مضبوطی کے لیے ان سے زیادہ اہم ہیں راہ راست سے بھٹکنے نہ پائیں۔ (۶)

کہا جاتا ہے کہ سلطنت قرض خواہ ہے اور ''تحفظات'' اس غرض سے وضع کیے گئے ہیں کہ سلطنت کا مہاجن بدنصیب قرض دار کا گلا دبائے رہے اور اپنی اغراض اور قوت کی حفاظت کرتا رہے۔ ایک اور عجیب وغریب نظریہ جو سرکاری طور پر اکثر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ہے، کہ گاندھی جی اور کانگریس نے ان تحفظات کے اصول کو

تسلیم کرلیا ہے اس لیے کہ ۱۹۳۱ء کے معاہدہ دہلی کی رو سے وہ ''ایسے تحفظات جو ہندوستان کے لیے مفید ہوں'' قبول کر چکے ہیں۔

اور پھر اٹاوا کا معاہدہ اور تجارتی تحفظات تو نسبتاً چھوٹی چیزیں ہیں۔(۷) ان سے کہیں زیادہ اہم وہ شرائط ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کا سیاسی اور معاشی تسلط ہندوستان پر قائم رہے جس نے پہلے انھیں خوب لوٹا اور اب بھی لوٹ رہا ہے۔ جب تک یہ شرائط اور ''تحفظات'' باقی ہیں نہ کسی قسم کی حقیقی ترقی ہو سکتی ہے۔ اور نہ آئینی طریقوں سے کوئی تغیر ممکن ہے۔ جو کوشش بھی آئینی طریقہ سے کی جائے گی اس کی راہ میں ''تحفظات'' کی دیوار حائل ہوگی اور یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ صرف ایک راہ کھلی ہوئی ہے اور وہ غیر آئینی راہ ہے۔ سیاسی تغیر کے نقطہ نظر سے یہ مجوزہ دستور اور اس کا عجیب الخلقت وفاق بالکل مہمل چیز ہے اور سماجی اور معاشی نقطہ نظر سے اور بھی بدتر ہے۔ اشتراکیت کا رستہ خاص کر کے بند کر دیا گیا ہے۔ بظاہر بہت سے اختیارات منتقل کئے گئے ہیں (وہ بھی زیادہ ان طبقوں کو جس سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے) مگر کوئی مفید کام کرنے اختیار اور وسائل نہیں دیئے گئے۔ اختیار برطانیہ کے ہاتھ میں ہے اور ذمہ داری ہندوستانیوں پر۔ استبداد کی برہنگی کو چھپانے کے لیے دستور کے مطابق انجیر کا پتہ تک بھی تو نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل ملکوں کے دستور اساسی میں بہت زیادہ لوچ ہونا چاہیے تاکہ وہ تیزی سے بدلتی ہوئی حالت کے مطابق بدلا جا سکے جلد فیصلہ کرنے اور اس فیصلے کو نافذ کرنے کا اختیار ضروری ہے۔ آج کل خود مغربی ملکوں کی پارلیمنٹری جمہوریت بھی ان تغیرات کو عمل میں نہیں لا سکتی جو موجودہ زمانے کے لیے ضروری ہیں، مگر یہاں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اس لیے کہ حرکت کو روکنے کے لیے خاص کر کے ہمارے پیروں میں بھاری بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں، اور ہمارے سامنے ایک آہنی دروازہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ہمیں ایک ایسی موٹر کار دی گئی ہے جس میں بریک ہی بریک ہیں، انجمن کوئی

نہیں۔ یہ دستور اساسی ان لوگوں کو بنایا ہوا ہے جن کی نظروں میں ہمیشہ مارشل لا سمایا رہتا ہے۔ جس شخص کا دارومدار تشدد پر ہو اس کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں یا تو مارشل لا یا تباہی۔

برطانیہ کے اس تحفے سے ہندوستان کو جس قدر آزادی دی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ملک میں جو سب سے زیادہ اعتدال پسند اور سیاسی اعتبار سے پس ماندہ جماعتیں ہیں، انھوں نے بھی اس کو رجعت پسندانہ قرار دیا ہے۔ حکومت کے پیشہ ور حامیوں نے اعتراض کے ساتھ ساتھ اپنی عادت کے مطابق تھوڑی بہت خوشامد بھی کی ہے مگر دوسرے جوش و خروش سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

مجوزہ دستور کو دیکھنے کے بعد لبرل جماعت کا یہ راسخ عقیدہ بھی متزلزل ہو گیا کہ

_______صفحہ نمبر ۴۰۷ تک

بنگال ۱۵۰۰ اور ۱۶۰۰ کے درمیان، دیولی کیمپ ۵۰۰ میزان ۲۰۰۰ اور ۲۱۰۰ کے درمیان۔ یہ صرف نظر بندوں یعنی ان لوگوں کی تعداد ہے جو بغیر عدالتی تحقیقات اور سزا کے قید کر دیئے گئے ہیں۔ سزا یافتہ سیاسی قیدی ان کے علاوہ ہیں۔ ان کو عموماً بہت بھاری بھاری سزائیں دی گئیں ہیں۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی ۱۷ دسمبر ۱۹۳۴ء کی خبر ہے کہ کہ حال میں کلکتے کے ایک مقدمے میں ہائی کورٹ میں ایک شخص کو بغیر لائسنس اسلحہ رکھنے کے جرم میں ۹ سال قید با مشقت کی سزا دی اس کے پاس ایک ریوالور اور ۶ کارتوس نکلے تھے۔

(۱۰) ۱۲ نومبر ۱۹۳۴ء۔

(۱۱) ۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو اسمبلی میں سرکاری طور پر پریس ایکٹ کی عملی درآمد کے متعلق ایک بیان دیا گیا۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ ۱۹۳۴ء سے اب تک ۵۱۴ اخبارات پر ضمانت کی طلبی اور ضبطی کا اثر پڑا۔ ان میں سے ۳۴۸ اخبارات بند ہو گئے ہیں اس لیے کہ وہ مزید ضمانتیں نہیں دے سکتے تھے اور ۱۶۶ نے ضمانتیں داخل کیں جن کی

مجموعی مقدار ۲ لاکھ ۵۲ ہزار ۸۲۵ روپے تھی۔

حال میں (یعنی ۱۹۳۵ء کے نصف آخر میں) کئی اور قانون جو شہری آزادی کو سلب کرتے ہیں ایک طویل عرصے کے لیے وضع کئے گئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم قانون ترمیم ضابطہ فوجداری ہے جس کا نفاذ سارے ہندوستان میں ہے اسے اسمبلی نے نامنظور کر دیا تھا۔ مگر گورنر جنرل نے اس کی تصدیق کر دی اکثر صوبوں میں بھی اس قسم کے قانون بنائے گئے ہیں۔

خاتمہ

ہمیں سعی کی تاکید کی گئی ہے مگر سعی کا پورا کرنا ہمارا نصیب میں نہیں۔ (تالمود)

میری کہانی ختم ہوگئی۔ سفر زندگی کے یہ حالات، جو بالکل شخصی نقطہ نظر سے لکھے گئے ہیں، جیسے کچھ بھی ہیں، آج کی تاریخ یعنی ۱۴ فروری ۱۹۳۵ء تک الموڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں مکمل ہو گئے۔ تین مہینے ہوئے میں نے اسی جیل میں اپنی پینتالیسویں سالگرہ منائی تھی اور غالباً ابھی زندگی کے بہت سے سال باقی ہیں۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور تھک گیا ہوں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا تازہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ میرا جسم خاصہ مضبوط ہے اور میرا دماغ صدمے جھیلنے کی قوت رکھتا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آ گیا تو میں ابھی بہت دن جیوں گا۔ لیکن آنے والی زندگی تک بیت نہ جائے اس کا حال کیونکر لکھا جاسکتا ہے۔

شاید میری سرگذشت لوگوں کو ہیجان خیز نہ معلوم ہو۔ جس کی عمر قید میں کٹی ہو اس کی زندگی میں ہیجان خیز واقعات کہاں سے آئیں؟ سچ پوچھئے تو میری کہانی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ جو مجھ پر گذری وہی میرے ملک کے لاکھوں مردوں عورتوں پر بھی گذری۔ بدلتی ہوئی کیفیتوں امیدوں اور مایوسیوں، شگفتگی اور افسردگی، سخت جدوجہد اور جبری تنہائی کی یہ داستان ہم سب کی داستان ہے۔ ایک فرد قوم کی حیثیت سے میں قوم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، کبھی اس پر اثر ڈالا، کبھی اس سے متاثر ہوا۔ اس کے باوجود دوسرے افراد کی طرح میں ایک جداگانہ شخصی زندگی رکھتا تھا اور سب کے بیچ رہتے ہوئے سب سے الگ رہتا تھا۔ یوں تو ہم لوگ اکثر بنتے بھی تھے مگر ہمارے بہت سے کاموں میں حقیقت اور سچائی معلوم ہوتی تھی جس کی وجہ سے ہم اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر وہ اہمیت حاصل کر لیتے تھے۔ جو

ہمیں ان کاموں کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی۔ کبھی کبھی ہمیں خوش قسمتی سے اس مکمل زندگی کا تجربہ ہوتا تھا جو نصب العین اور عمل کی مطابقت کا نام ہے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر ہم نصب العین کو ترک کر کے غالب قوت کے آگے چپ چاپ سر جھکا دیتے تو ہماری زندگی برباد اور ہماری اوقات تلخ ہو جاتی۔

مجھے اس زمانے میں اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ میں زندگی کو ایک نہایت دلچسپ سفر سمجھنے لگا جس میں انسان بہت کچھ سیکھتا ہے، بہت کچھ کرتا ہے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ میں عقل اور تجربے میں ترقی کر رہا ہوں۔ یہ احساس اب بھی ہے اور اس سے مجھے اپنے کاموں میں اور کتابوں کے مطالعہ میں خاص لطف آتا ہے اور زندگی اچھی طرح گزرتی ہے۔

اس سرگذشت کے لکھنے میں، میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر واقعے کے ساتھ ان خیالات اور جذبات کا بھی ذکر کروں جو اس وقت میرے دل میں تھے، تاکہ جہاں تک ممکن ہو میری اندرونی حالت کا اندازہ ہو جائے۔ گذری ہوئی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ اس میں بعد کے واقعات کی جھلک نہ آنے پائے سہل نہیں ہے۔ اس لیے لازمی طور پر اگلے حالات کے بیان میں پچھلے خیالات کا رنگ آ گیا ہو گا مگر جو مقصد میرے پیش نظر تھا وہ یہی تھا کہ خود اپنی بصیرت کے لیے اپنی ذہنی نشوونما کا نقشہ کھینچوں۔ شاید میں اس تحریر میں اپنے آپ کو ایسا نہیں دکھا سکا جیسا میں واقعی تھا بلکہ ایسا جیسا میں ہونا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا کہ ہوں۔

چند مہینے ہوئے سرچ۔پ۔راما سوامی آئر نے مجمع عام میں یہ کہا تھا کہ جواہر لال جمہور کے خیالات کے نمائندہ نہیں ہے مگر اپنی قربانی، تصور پرستی اور جوش عقیدت کی وجہ سے، جو بقول ان کے محض ''فریب نفس'' ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ''فریب نفس'' میں مبتلا ہو وہ اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں اس ذاتی معاملہ میں چ۔پ سے بحث کرنے کی جرات نہیں

کروں گا۔کئی سال سے مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔مگر اب سے بہت پہلے ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ اور میں دونوں ہوم رول لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔وہ ترقی کے مدارج طے کرکے آسمان پر پہنچ گئے اور میں خاک کا پتلا زمین پر پڑا رہا۔اب مجھ میں اور ان میں اس کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں کہ دونوں ہی ایک قوم کے افراد ہیں۔وہ آج کل، خصوصا! پچھلے چند سال سے ہندوستان کی برطانوی گورنمنٹ کے قصیدہ خواہ، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں حکومت مطلق کے حامی، اور خود بھی ایک دیسی ریاست کے وزیر اور استبداد کے چشم و چراغ ہیں۔غالباً ان میں اور مجھ میں ہر معاملے میں اختلاف رائے ہے مگر ایک جزوی چیز میں ہم دونوں متفق ہیں۔ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ میں جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہوں۔مجھے ہرگز یہ مغالطہ نہیں ہے۔

سچ پوچھئے تو بعض وقت میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میں کسی کا بھی نمائندہ ہوں اور میرا دل کہتا ہے نہیں، کسی کا نہیں۔یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے انس اور محبت رکھتے ہیں۔مشرق اور مغرب کا معجون مرکب بن کر نہ میں ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ غالباً میرے خیالات اور تصور حیات میں مغربی رنگ مشرقی رنگ پر غالب ہے۔مگر اور ہندوستانیوں کی طرح میں بھی اپنے دیس سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہوں اور میرے نفس کے نیم شعوری طبق میں برہمنوں کی سیکڑوں پشتوں کی روایات دبی ہوئی ہیں۔نہ تو میں قدیم اثرات سے آزاد ہو سکتا ہوں۔نہ جدید خیالات سے۔یہ دونوں میری سیرت کا جز بن گئے ہیں اور اگر چہ وہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ میرے کام آتے ہیں مگر اسی کے ساتھ انہوں نے میرے دل میں روحانی ترقی کا احساس پیدا کر دیا ہے جو نہ صرف سیاسی جدوجہد میں بلکہ ساری زندگی میں مجھ پر چھایا ہوا رہتا ہے۔مغرب میں بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہوں، وہاں کی زندگی میں کسی طرح نہیں کھپ سکتا مگر بعض اوقات اپنے دیس میں بھی مجھے بدیسی ہونے کا

احساس ہوتا ہے۔

پہاڑ کو دور سے دیکھ کر اس پر چڑھنا سہل معلوم ہوتا ہے اور چوٹی اشارہ کرتی ہے کہ چلے آؤ مگر پاس پہنچ کر مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور جتنا اوپر چڑھتے جایئے اتنا ہی رستہ کٹھن ہوتا جاتا ہے اور چوٹی دور ہٹتی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی چڑھنے کی کوشش بیکار نہیں، اس میں بجائے خود ایک لطف ہے۔ شاید زندگی کی قدر و قیمت سعی پر منحصر ہے انجام پر نہیں۔ اکثر راستے کا ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر غلط راستے کا پہچان لینا آسان ہے اور اگر انسان اس سے بچ کر چلے تب بھی غنیمت ہے۔ نہایت عجز و انکسار سے میں حکیم جلیل سقراط کا یہ قول نقل کرتا ہوں "مجھے نہیں معلوم موت کیا ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی اچھی چیز ہو اس لیے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ مگر میں یہ خوب جانتا ہوں کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا برا ہے اور جس چیز میں بھلائی کا احتمال ہو اسے میں اس چیز پر ترجیح دیتا ہوں جس کی برائی کا یقین ہے۔"

نہ جانے کتنے سال میں نے جیل میں بسر کیے! کتنے موسم آئے اور چلے گئے، کتنے چاند بڑھے اور گھٹ گئے، ستارے بڑے ثبات اور وقار سے اپنے محور پر چلتے رہے اور میں تنہائی اور محویت کے عالم میں تماشے دیکھتا ہوا۔ میری جوانی کے بے شمار دن یہاں دفن ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھوت بن کر میرے سامنے آتے ہیں، گزرے ہوئے زمانے کی تلخیاں یاد دلاتے ہیں۔ اور چپکے سے میرے کان میں کہتے ہیں "اس سے کچھ حاصل بھی ہوا؟" میں اس کا جواب دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مجھے اپنے موجودہ علم اور تجربے کے ساتھ گزری ہوئی زندگی پھر سے بسر کرنے کا موقع ملے تو بے شک میں اپنی ذاتی زندگی میں بہت تبدیلیاں کروں، اپنے پچھلے کاموں میں کچھ ترمیم اور اصلاح کروں مگر خاص خاص قومی معاملات میں میرے فیصلے وہی ہوں گے جو پہلے تھے۔ سچ پوچھئے تو میں ان کو بدل ہی نہیں سکتا۔ میں خود ان کے آگے بے بس ہوں یہ فیصلے میں نے نہیں کیے بلکہ ایک ایسی قوت نے مجھ سے

کرائے جو میرے اختیار میں نہیں۔

مجھے سزا پائے ٹھیک ایک سال ہو گیا۔ دو برس کی میعاد میں سے ایک برس گزرا ہے اور ابھی پورے بارہ مہینے باقی ہیں۔ اس بار تخفیف کی کوئی امید نہیں۔ قید محض میں تخفیف نہیں ہوا کرتی۔ وہ گیارہ دن جو میں نے پچھلے اگست میں جیل سے باہر گزارے تھے محسوب نہیں ہوئے بلکہ دو سال کی میعاد میں گیارہ دن اور بڑھا دیئے گئے۔ مگر یہ سال بھی کسی نہ کسی طرح گزر جائے گا۔ اور میں رہا ہو جاؤں گا۔ پھر کیا ہو گا؟ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر کا ایک باب ختم ہو گیا اور دوسرا باب شروع ہو گا۔ اس میں کیا مضمون ہو گا۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ کتاب زندگی کے اگلے ورق سر بہ مہر ہیں۔

تتمہ

باڈن وائلر ہشوارتش والڈ (جرمنی) ۲۵اکتوبر ۱۹۳۵ء

مئی میں میری بیوی مزید علاج کے لیے بھوالی سے یورپ روانہ ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میرا بھوالی جانا بند ہو گیا اور پندرہویں دن جیل سے باہر نکل کر پہاڑی سڑکوں سے گزرنے کا جو موقع ملتا تھا وہ جاتا رہا۔ مجھے اس کا بڑا قلق ہوا اور الموڑے کا جیل اور بھی سنسان معلوم ہونے لگا۔

کوئٹے کے زلزلے کی خبر آئی اور اس نے کچھ دن کے لیے اور سب چیزوں کو بھلا دیا۔ مگر حکومت اپنی انوکھی حرکتوں کی یاد لوگوں کے دل سے محو نہیں ہونے دیتی۔ تھوڑے ہی دن کے بعد معلوم ہوا کہ کانگرس کے صدر بابو راجندر پرشاد کو۔ جن سے زیادہ زلزلے کے امدادی کام کی واقفیت ہندوستان میں کوئی نہیں رکھتا، اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ کوئٹہ جا کر امدادی کام میں شریک ہوں۔ اسی طرح گاندھی جی اور دوسرے مشہور لیڈر بھی وہاں جانے سے روک دیئے گئے۔ بہت سے ہندوستانی اخباروں کی ضمانت اس جرم میں ضبط کر لی گئی کہ انہوں نے کوئٹے کے متعلق مضامین لکھے۔ ہر جگہ وہی فوج اور پولیس کی ذہنیت نظر آتی ہے چاہے اسمبلی ہو، یا سول حکومت یا سرحد پر گولہ باری کرنے والا توپ خانہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان کی برطانوی حکومت اور ہندوستانی قوم کی بہت بڑی جماعت میں ایک مستقل جنگ چھڑی رہتی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ پولیس ایک مفید اور ضروری چیز ہے لیکن اگر دنیا میں پولیس کے سپاہیوں اور پولیس کے ڈنڈوں کے سوا کچھ نہ ہو تو شاید انسان کو اس میں رہنا دوبھر ہو جائے۔ یہ ایک مشہور قول ہے کہ جو شخص دوسروں پر بے اندازہ تشدد کرے وہ صرف انہیں پست اور ذلیل نہیں کرتا بلکہ خود بھی پست اور ذلیل ہوتا ہے۔

آج ہندوستان میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے حکام

خصوصاً سول سروس والوں کی اخلاقی اور ذہنی پستی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا اثر سب سے زیادہ بڑے افسروں میں نظر آتا ہے۔ مگر ایک حد تک تمام سرکاری افسروں میں پھیل گیا ہے۔ جب کبھی کوئی بڑی جگہ خالی ہوتی ہے تو اس کے لیے ہمیشہ وہ شخص منتخب کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔

۴ ستمبر کو میں اچانک الموڑا جیل سے رہا کر دیا گیا کیونکہ یہ خبر آئی تھی کہ میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ جرمنی کے علاقے شوارتس والڈمی باڈن وائلر مقام پر زیر علاج تھیں مجھ سے کہا گیا کہ تمہاری سزا ملتوی کی جاتی ہے اور مجھے اپنی میعاد کے ختم ہونے سے ساڑھے پانچ مہینے پہلے رہائی مل گئی۔ میں انتہائی عجلت کے ساتھ ہوائی جہاز سے یورپ روانہ ہو گیا۔

یورپ میں ہلچل مچی ہوئی ہے ایک طرف جنگ اور شورش کا خوف ہے دوسری طرف معاشی تباہی کا ڈر ہے۔ حبش پر چڑھائی ہو رہی ہے۔ اس کے باشندوں پر گولے برسائے جا رہے ہیں۔ شہنشاہی پسند سلطنتوں میں ان بن ہے اور وہ ایک دوسرے کو دھمکیاں دے رہی ہیں۔ انگلستان جو سب سے بڑی شہنشاہی قوت ہے، ایک طرف صلح و امن اور انجمن اقوام کے قانون کی حمایت کر رہا ہے اور دوسری طرف اپنی محکوم قوم کو پیس رہا ہے اور ان پر گولہ باری کر رہا ہے۔ مگر یہاں شوارتس والڈ میں امن اور سکون چھایا ہوا ہے اور نازیوں کی سواستکا بھی بہت نظر آتی ہے۔ میں اس کہر کو دیکھ رہا ہوں جو آہستہ آہستہ وادی پر چھا رہا ہے۔ فرانس کی سرحد، جو یہاں سے بہت دور ہے نظر سے چھپتی جاتی ہے اور سارے منظر پر ایک سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے میں دل میں سوچتا ہوں کہ خدا جانے اس کہر کے پیچھے کیا ہے۔

ضمیمہ الف

وہ حلف جو یوم آزادی اٹھایا گیا

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء

ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اور قوموں کی طرح ہندوستانی قوم کا لازمی حق ہے کہ وہ آزاد ہو، اس کی محنت کا پھل اس کے پاس رہے اور اسے وہ چیزیں میسر ہوں جو زندگی کے لیے ضرور ہیں تا کہ اسے پنپنے اور بڑھنے کا پورا پورا موقع ملے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی حکومت کسی قوم کو ان حقوق سے محروم کرے اور اس پر ظلم کرے تو قوم کو حق ہے کہ اس حکومت کو بدل دے یا ختم کر دے۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ہندوستانی قوم کو نہ صرف آزادی محروم کر دیا ہے بلکہ اس نے اپنی بنا پر اس پر قائم کی ہے کہ عام لوگوں سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس نے ہندوستان کو معاشی، سیاسی، تمدنی اور روحانی حیثیت سے برباد کر دیا ہے اس لیے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کر لے اور پورن سوراج یعنی کامل آزادی حاصل کر لے۔

معاشی حیثیت سے ہندوستان تباہ کر دیا گیا ہے۔ہم سے جو محصول وصول کیے جاتے ہیں وہ ہماری آمدنی کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہماری اوسط آمدنی سات پیسے روز ہے اور جو بھاری محصول ہم کو ادا کرنے پڑتے ہیں ان میں سے بیس فی صدی لگان کی صورت میں کسانوں سے وصول کیے جاتے ہیں اور تین فی صدی تک کے محصول سے جس کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں پر پڑتا ہے۔

دیسی صنعتیں مثلاً ہاتھ سے سوت کاتنا مٹا دی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کسان کم سے کم سال میں چار مہینے بیکار رہتے ہیں اور دستکاری کی شغل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن کند ہو جاتے ہیں۔ بہ خلاف دوسرے ملکوں کے

یہاں ان برباد شدہ صنعتوں کی کسی صورت سے تلافی نہیں کی گئی۔

چنگی کی شرح اور روپے کی قیمت اس ترکیب سے مقرر کی گئی ہے کہ کسانوں پر اور زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ ہماری درآمد کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے کارخانوں کا بنا ہوا مال ہے۔ چنگی کی شرح سے برطانوی کارخانہ داروں کے ساتھ کھلم کھلا رعایت ظاہر ہوتی ہے اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ وہ غریبوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے استعمال نہیں کی جاتی بلکہ مسرفانہ حکومت کے چلانے میں۔ اس سے بھی زیادہ اندھیر یہ ہے کہ شرح مبادلے میں اس ڈھب سے مداخلت کی گئی کہ کروڑوں روپیہ **ملک** سے کھینچ کر باہر چلا گیا۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان کا درجہ اتنا پست کبھی نہیں تھا جتنا برطانوی حکومت میں ہے۔ اصلاحات کے ذریعے سے لوگوں کو کوئی حقیقی سیاسی اختیارات حاصل نہیں ہوئے۔ ہمارے بڑے بڑے آدمی کو بدیسی حکومت کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ ہم رائے کی آزادی اور میل جول کی آزادی کے حق سے محروم رکھے گئے اور ہمارے بہت سے بھائی جلاوطن کر دیئے گئے اور انھیں اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں۔ ہماری انتظامی قابلیت فنا کر دی گئی اور یہ نوبت پہنچ گئی کہ ہم مجموعی طور پر چوکیداری اور محرری پر قناعت کرنے لگے۔

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے موجودہ نظام تعلیم نے ہمیں اپنے لنگر سے چھڑا کر ڈانواں ڈول کر دیا اور ہمیں یہ سکھایا کہ غلامی میں مگن رہیں۔

روحانی اعتبار سے ہتھیار چھن جانے نے ہمیں نامرد بنا دیا اور بیرونی فوج کی موجودگی نے بڑی بے دردی سے ہماری دفاعی قوت کو کچل دیا اور ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ہم خود اپنی حفاظت اور بیرونی حملے کی مدافعت نہیں کر سکتے بلکہ اپنے گھر بار کو چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے حملے سے بھی نہیں بچا سکتے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ جس حکومت نے ان چار طریقوں سے ہمارے **ملک** کو برباد

کیا اس کی اطاعت کرنا انسانیت کی ذلت اور خدا کی نافرمانی ہے۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ تشدد ہمارے لیے آزادی حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ نہیں ہے اس لیے ہم یہ طریقہ اختیار کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہے برطانوی حکومت سے بالارادہ کوئی تعلق نہ رکھیں اور سول نافرمانی کی تیاری کریں جس میں محصول ادا نہ کرنا بھی شامل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم حکومت کو بالارادہ کسی قسم کی مدد نہ دیں، محصول دینا بند کر دیں اور خواہ کتنا ہی اشتعال ہو۔ تشدد سے ہرگز کام نہ لیں تو اس ظالمانہ حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لیے ہم صدق دل سے عہد کرتے ہیں کہ کانگریس وقتاً فوقتاً پورن سوراج قائم کرنے کے لیے جو ہدایات دے گی ان پر عمل کریں گے۔

ضمیمہ ب

خط مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۳۰ء جو کانگرس کے لیڈروں نے یرودا جیل سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹرم۔ ر۔جیکار کو صلح کی شرائط کے متعلق بھیجا۔

یرودا سنٹرل جیل

۱۵ اگست ۱۹۳۰ء

صاحبان مکرم

ہم آپ کے دل سے شکر گزار ہیں کہ آپ نے برطانوی حکومت اور کانگرس میں صلح کرانے کا ذمہ لیا ہے۔ اس خط و کتابت کو پڑھ کو جو آپ لوگوں میں اور ہز اکسی لینسی وائسرائے میں ہوئی ہے اور آپ سے مفصل گفتگو اور آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا جب کوئی ایسی صلح ہو سکے جو ہمارے ملک کی عزت و وقار کے شایان شان ہو۔ اگر چہ پچھلے پانچ مہینے میں جمہور میں حیرت انگیز بیداری پیدا ہوگئی ہے اور ہر طبقے اور جماعت، ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی تک یہ تکلیفیں نہ اس قدر مسلسل ہیں اور نہ اتنی زیادہ ہیں کہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کافی ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم آپ کے اور وائسرائے کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ سول نافرمانی سے ملک کو نقصان پہنچا۔ یہ تحریک بے وقت اور غیر آئینی ہے۔ انگلستان کی تاریخ خون ریز شورشوں کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے جن کی خود انگریزوں نے دل کھول کر تعریف کی اور ہمیں بھی ان کی تعریف کرنا سکھایا۔ لہذا وائسرائے کے لیے یا کسی بھی سمجھدار انگریز کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک ایسی تحریک کو برا کہے جو اپنے مقصد کے لحاظ سے اور بہت بڑی حد تک اپنے عمل کے لحاظ سے بھی پر امن رہی ہے۔ مگر یہاں ہم ان الزامات کی تردید نہیں کرنا

چاہتے جو سرکاری یا غیر سرکاری طور پر موجودہ سول نافرمانی کی تحریک پر لگائے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس تحریک کو جو حیرت انگیز مقبولیت عام لوگوں میں حاصل ہوئی وہ اس کے جواز کا کافی ثبوت ہے۔ اس وقت تو صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ ہم بھی آپ کی طرح دل سے چاہتے ہیں کہ اگر کسی طرح بھی ممکن ہو سول نافرمانی ملتوی یا ختم کر دی جائے۔ ہمیں خود یہ گوارا نہیں کہ بلا ضرورت اپنے **ملک** کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو قید، لاٹھی چارج اور اس سے بھی بدتر خطروں میں ڈالیں۔ اس لیے ہم آپ کو اور وائسرائے کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم باعزت صلح کی تمام امکانی صورتیں تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھیں گے۔ مگر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ابھی تک اس کے کوئی آثار معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ انگریز حکام اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو اپنے **ملک** کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہمیں ان خالی خولی وعدوں پر اعتبار نہیں ہے جو حکام کی طرف سے کیے جاتے ہیں اگرچہ یہ اکثر نیک نیتی پر مبنی ہوتے ہیں۔ انگریز مدتوں سے ہماری قوم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں اس لیے انھیں اس اخلاقی معاشی اور سیاسی تباہی کا احساس باقی نہیں رہا جو ان کے ہاتھوں ہمارے **ملک** پر آئی ہے۔ وہ کسی طرح اپنے دل کو یہ نہیں سمجھا سکتے کہ ان کا ایک ہی فرض ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی حکومت کو جو ہماری گردنوں سے اتاریں اور اپنی پچھلی زیادتیوں کی تھوڑی بہت تلافی کے لیے ہمیں اس روز افزوں تنزل سے نجات پانے میں مدد دیں جو برطانوی حکومت کے ماتحت ایک صدی سے ہمارے **ملک** میں ہو رہا ہے۔

مگر ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اور ہمارے بعض فاضل ہم وطنوں کو ان خیالات سے اتفاق نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت کی ذہنیت کم سے کم اس حد تک بدل گئی ہے کہ مجوزہ کانفرنس میں شرکت کرنے سے مفید نتیجہ نکلے گا اس لیے باوجود ان دقتوں

کے جو ہمیں درپیش ہیں ہم خوشی سے تیار ہیں کہ جہاں تک ہمارے امکان میں ہے آپ کے ساتھ تعاون کریں۔ اس لیے موجودہ حالت میں آپ کی دوستانہ تجویز کے جواب میں ہم جو زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) ہمارا خیال ہے کہ آپ کے اس خط کے جواب میں جو مجوزہ کانفرنس کے متعلق تھا وائسرائے نے مبہم الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ہم کوئی اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ قومی مطالبے سے جو پچھلے سال لاہور میں پیش کیا گیا تھا کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اس وقت تک کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتے۔ جب تک کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے باضابطہ اجلاس میں اس مسئلے پر غور نہ کر لیا جائے۔ البتہ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ذاتی طور پر ہمیں وہی فیصلہ منظور ہوگا جس کی رو سے:

(الف) صاف الفاظ میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان جب چاہے برطانوی سلطنت سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔

(ب) ہندوستان کو مکمل قومی حکومت دی جائے جو رائے عامہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ جسے ملک کی حفاظت اور معاشی امور کے متعلق پورے پورے اختیارات حاصل ہوں اور جو ان گیارہ شرطوں کو پورا کرتی ہو جو گاندھی جی نے وائسرائے کو اپنے خط میں لکھی تھیں۔

(ج) ہندوستان کو یہ حق دیا جائے کہ اگر ضرورت ہو تو ایک آزاد عدالت کے ذریعے سے ان برطانوی مطالبات (جن میں ہندوستان کا نام نہاد ملکی قرضہ بھی شامل ہے) کی تنقیح کرائی جائے تو قومی حکومت کے نزدیک غیر واجبی یا ہندوستانیوں کے مفاد کے خلاف ہوں۔

(نوٹ) انتقال حکومت کے دوران میں جو خاص انتظامات ہندوستان کے مفاد کے لیے ضروری ہوں ان کا فیصلہ ہندوستان کے

منتخب شدہ نمائندے کریں۔

(۲) اگر برطانوی حکومت مندرجہ بالا شرائط کو منظور کر لے اور اس کا قابل اطمینان طریقے سے اعلان کر دے تو ہم ورکنگ کمیٹی کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ سول نافرمانی بند کر دے یعنی بعض خاص قوانین کی نافرمانی جو محض قانون شکنی کی غرض سے کی جاتی ہے۔ مگر بدیسی کپڑے اور شراب کی فروخت کی ممانعت نہ کر دے۔ عام لوگوں کو نمک بنانے کی اجازت ہوگی اور نمک کے قانون کی تعزیزی دفعات نافذ نہ کی جائیں گی۔ حکومت کے یا نجی نمک کے کارخانوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) سول نافرمانی کے بند کرنے کے ساتھ ساتھ:۔

(الف) تمام ستیا گرہی اور دوسرے سیاسی قیدی، خواہ وہ جیل میں ہوں یا حوالات میں جو تشدد یا ترغیب تشدد کے مجرم نہیں ہیں رہا کر دیئے جائیں۔

(ب) جو املاک قانون، قانون مطبع اور قانون مالگذاری وغیرہ کے ماتحت ضبط کی گئی ہے وہ واپس کر دی جائے۔

(ج) جرمانے اور ضمانت کی رقمیں جو سزا یافتہ ستیہ گرھیوں یا پریس ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں سے وصول کی گئی ہوں واپس کر دی جائیں۔

(د) تمام ملازم جن میں دیہات کے مقدم، چوکیدار وغیرہ بھی شامل ہیں، جو سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں مستعفی یا برطرف ہوئے ہوں اور دوبارہ حکومت کی ملازمت کرنا چاہتے ہوں بحال کر دیئے جائیں۔

(نوٹ) یہ دفعات ترک موالات کے زمانے میں بھی عائد ہوں گی۔

(۵) وائسرائے کے جاری کئے ہوئے تمام تعزیری ضابطے منسوخ کردیئے جائیں

(۶) مجوزہ کانفرنس کی نمائندگی اوراس میں کانگرس کی شرکت کا مسئلہ اسی وقت طے ہوسکتا ہے جب مندرجہ بالا مقدمات کا قابل اطمینان تصفیہ ہوجائے۔

آپ کے مخلص

موتی لال نہرو

م۔ک۔گاندھی

سروجنی نائڈو

ولبھ بھائی پٹیل

جے رام داس دولت رام

سید محمود

جواہر لال نہرو

ضمیمہ ج

عہد آزادی کی تجدید کا رزولیوشن

۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء

ہم باشندگان فخر و مسرت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم دل سے شکر گزار ہیں۔ ہندوستان کے ان بیٹوں اور بیٹیوں کے جنھوں نے مادر وطن کی آزادی کی خاطر تکلیفیں جھیلیں اور قربانیں کیں، اپنے جلیل القدر اور محبوب رہنما مہاتما گاندھی کے جن کے فیض ہدایت نے ہمیں بلند مقصد اور برتر سعی کی راہ دکھائی۔ ان سیکٹروں بہادر نوجوانوں کے جنھوں نے اپنی جان آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی یعنی پشاور اور کل صوبہ سرحد، شولاپور، ضلع مدناپور اور بمبئی کے شہیدوں کے ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے جنہوں نے دشمنوں کے وحشیانہ لاٹھی چارج کی چوٹیں کھائیں گڑھوالی رجمنٹ اور فوج اور پولیس کے اور سپاہیوں کے جنھوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے بھائیوں پر گولی چلانے اور کسی قسم کی سختی کرنے سے انکار کردیا، گجراب کے ان جرار کسانوں کے جنھوں نے نہایت ثابت قدمی سے ہر طرح کی تخویف اور تشدد کا مقابلہ کیا، ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بہادر اور مظلوم کاشتکاروں کے جنھوں نے انتہائی سختیوں کے باوجود جنگ آزادی میں پورا پورا حصہ لیا، ان تاجروں اور کاروباری لوگوں کے جنہوں نے سخت نقصان اٹھا کر قومی تحریک خصوصاً بدیسی کپڑے اور برطانوی مال کے بائیکاٹ میں مدد دی، ان ایک لاکھ مردوں اور عورتوں کے جنہوں نے جیل جا کر ہر قسم کی تکلیفیں اٹھائیں اور کبھی کبھی جیل کے ملازموں کے ہاتھ مار تک کھائی خصوصاً عام رضا کاروں کے جنہوں نے ہندوستان کے سچے سپاہیوں کی طرح بغیر شہرت یا انعام کی امید کے محض اپنے اعلیٰ مقصد کی خاطر سخت دقتوں کے باوجود محنت اور استقلال سے ملک وقوم کی خدمت

انجام دی۔

اور ہم اعتراف کرتے ہیں انتہائی عقیدت اور احترام کا ہندوستان کی عورتوں سے جنھوں نے مصیبت کے وقت مادر وطن کی مدد کرنے کے لیے اپنے گھروں کے امن و آرام کو خیر آباد کہا اور ہندوستان کی فوج کی صف اول میں مردوں کے دوش بدوش جا کر کھڑی ہوئیں کہ جانبازی اور فتح میں ان کے ساتھ شریک ہوں اور ہم فخر کرتے ہیں اپنے ملک کے نوجوانوں اور روانزسینا کے بچوں پر جنھوں نے اپنی کم سنی کے باوجود حصہ لیا اور شہادت پائی۔

اور آخر میں ہم خوشی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں اس بات کا کہ ہندوستان کے سب چھوٹے بڑے فرقے اور طبقے اس عظیم الشان جنگ میں شریک ہیں اور انھوں نے اس کے لیے بیش بہا قربانیاں کیں خصوصاً اقلیتوں یعنی مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور دوسرے فرقوں کے جنھوں نے اپنی بہادری اور مادر وطن کی وفاداری کا ثبوت دے کر ایک متحدہ قوم کی بنیاد ڈالی جو اپنی فتح کا یقین رکھتی ہے۔اور اس پر تلی ہوئی ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرائے اور آزاد رکھے اور اس آزادی سے یہ کام لے کہ ہندوستان کے تمام طبقوں کی بیڑیاں کٹ جائیں اور ان کے حقوق کا فرق و امتیاز کٹ جائے جو حقیقت میں ساری نوع انسانی کی خدمت ہے۔ ہندوستان کی خاطر قربانی اور جان بازی کی ان شاندار جوش آفریں مثالوں کو سامنے رکھ کر اہم اپنے عہد آزادی کی تجدید کرتے ہیں اور مصمم ارادہ کرتے ہیں کہ اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک ہندوستان کو کامل آزادی حاصل نہ ہو جائے۔

--------The End--ختم شد------